عین شین قاف
محمد فیاض ماہی

# پیش لفظ

الحمدللہ آج اپنے چھٹے ناول کا پیش لفظ لکھ رہا ہوں۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ میرا پہلا ناول "گھنگرو اور کشکول" مسودے کی شکل میں میری بغل میں دبا ہوا تھا اور میں شہر لاہور کی سڑکیں ناپتا تھا کہ کوئی اس ناول کو شائع کر دے۔

اس محبت اور مہربانی کا سہرا جناب نوید اے شیخ کے سر باندھنا چاہوں گا۔ ان کی خاص محبت اور شفقت نے مجھ جیسے بے سُرے اور بے ردھم تحریر والے عام شخص کو مصنفین کی صف میں کھڑا کیا۔

"گیلے پتھر" کو ادارہ ہذا نے شائع کر کے مجھ میں مزید لکھنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ کیونکہ آپ کی محبتوں اور پُرخلوص تنقید و تعریف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ مجھے مزید لکھنا چاہیے۔ "کانچ کا مسیحا، کاغذ کی کشتی" نے اللہ کی رحمت سے آپ کے اعلیٰ ذوق کی بنا پر پذیرائی حاصل کی میرا خیال تھا کہ ایک دلچسپ رومانوی ناول لکھوں لیکن محترم پبلشر کی ڈیمانڈ تھی کہ میں "تاوانِ عشق" جیسا کوئی شاہکار تحریر کروں جس میں مسلمان ہونے کے ناطے اپنے مذہب کا پرچار بھی کروں۔

میں فرداً فرداً ان قارئین اور محبت کرنے والوں کے نام یہاں لکھ کر ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا جنہوں نے "تاوانِ عشق" کو سراہا اور مجھے فون کالز، ای میلز اور خطوط کے ذریعے اپنی تعریفوں کا خصوصی تحفہ بھیجا۔ کیونکہ ماشاءاللہ اَن گنت ایس۔ ایم۔ ایس سے آپ نے میری جو حوصلہ افزائی کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے ان کے لیے میرے دل میں آپ کا احترام اور پُرخلوص مقام ہے۔

2004ء میں اللہ تعالیٰ کی خاص کرم نوازی ہوئی کہ مجھے خانہ کعبہ کے غلاف کو بوسہ دینے رب کریم نے اپنے گھر بلوایا تو میں نے رحمتِ خداوندی سے جی بھر کر لطف اٹھایا۔ اور جب مجھ خاکسار پر کرم ہوا کہ میں عاصیوں کا عاصی درِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ رحمتیں اور نعمتیں تو اس مقدس و معطر در پر بانٹی جاتی ہیں۔ گنبدِ خضریٰ کے سائے میں کھڑے ہو کر میں نے کاسۂ دل آقائے مدینہ کے حضور بڑھایا تو مجھے لکھنے کی نعمتوں سے نوازا گیا۔

اس ناول کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے پہلے عرض کرتا چلوں کہ میرا اگلا ناول "موم کا کھلونا" خالصتاً رومانی اور معاشرتی ہوگا۔ جس میں معاشرے کی اونچ نیچ کو موضوع بنا کر لکھنے کی جسارت کی ہے۔

"عین، شین، قاف" عشق کے تین حروف ہیں۔ اگر "ع، ش، ق" لکھ دیتے تو شاید ٹائٹل میں وہ کشش نہ ہوتی جواب آپ محسوس کر رہے ہیں۔

آپ کے ہاتھوں کی زینت بننے والا یہ ناول "عین، شین، قاف" محترم برادر جناب عبدالغفار صاحب کی فرمائش پر لکھنے کی جسارت کی ہے۔ محترم کا خیال ہے کہ ہمیں تاوانِ عشق، گیلے پتھر اور "عین، شین، قاف" جیسے موضوعات کی ضرورت ہے۔

آپ کی بے پناہ محبتوں پر اعتماد ہونے کی بنا پر اس تحریر کو آپ کی عدالت میں اس طرح پیش کر رہا ہوں کہ اپنے علم اور تجربہ کے کٹہرے میں مجھے طلب کریں اور میری غلطیوں کی نشان دہی پر مجھے تنقیدی سزا دیں۔ "عشق" ایک ایسا احساس ہے۔ جسے ہو جائے وہ اپنا آپ تیاگ کر مجنوں بن جاتا ہے اور گلیوں کی خاک چھانتا ہوا زمانے میں مذاق بن جاتا ہے۔ مگر عشق جسے اپنا پیرہن اوڑھا دے وہ معاشرے میں اعلیٰ مقام پا لیتا ہے اور ان کا نام "بلالؓ، جامیؒ، اور اقبالؒ" کی طرح قیامت تک زندہ رہتا ہے۔

یہ عشق کی معراج ہی ہے کہ حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا کہ "مجھ سے پہلے جنت میں تم داخل ہو گے۔" اس ناول کو "گیلے پتھر" اور "تاوانِ عشق" کا تسلسل سمجھیں تو زیادہ لطف آئے گا۔ زمانے میں شرابی اور بدکردار کو حقیر اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مگر...... جب عشق نے شرابی کو "عین" کا چولا پہنایا تو اللہ تعالیٰ نے اس شرابی کو کائنات میں اعلیٰ مقام اس طرح عطا کیا کہ حورانِ جنت بھی اس کی طلب کرنے لگیں۔ جان کا نذرانہ دے کر "عین" کی سند حاصل کرنے والا شرابی نوجوان کس طرح عشق کو سرخرو کرنے نکلا کہ آسمان بھی اس کی اداؤں پر رشک کرنے لگا۔

عشق صرف انسانوں کی میراث ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر جاندار اور بے حس و حرکت چیز اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے محبوب ﷺ پر درود و سلام بھی بھیجتی ہے۔ "شین" بھی ایک بے زبان پر مہربان ہوا تو اس سے سچائی کی شہادت مانگی۔ اس بے زبان نے حیران کن فیصلہ کر کے "شین" کو ششدر و پریشان کر دیا۔ اس کی سچائی کائنات

کے پہلے محبوب ﷺ نے اس طرح قبول کی کہ اسے اپنی چوکھٹ پر بوسہ دیتے ہوئے فرشتۂ اَجل سے دوستی نبھانے کا موقع فراہم کیا۔ وہ بے زبان کون تھا جو ''شین'' کا درجہ اس طرح پا گیا کہ انسان ہاتھ ملتے رہ گیا۔

معاشرے کا ایک بدکردار! طوائف...... لیکن عشق اندھا ہوتا ہے۔ ''قاف'' اس کی اداؤں پر فریفتہ ہوگیا۔ اس نے ''قاف'' کا پیرہن اوڑھ کر اپنے پیشے کی برہنگی کو اس طرح چھپایا کہ بازارِ حسن لرز کر رہ گیا۔ ''قاف'' کو اپنا برہنہ پن چھپانے پر طوائف نے جو خراجِ تحسین پیش کیا وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

''عین، شین، قاف'' کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کی محبتوں نے کرنا ہے۔ کیونکہ مجھے آپ کے اعلیٰ ذوق پر مان ہے۔ اور آپ کی معیاری تحاریر پڑھنے کی کوشش اور جستجو کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے ایک بار پھر عشقِ حقیقی پر قلم اُٹھانے کی جسارت کی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اُتروں گا۔

میں ذاتی طور پر محترم برادر محمد اعجاز احمد کا مشکور و ممنون ہوں جن کی اخلاقی امداد کا تا حیات مقروض رہوں گا۔

والسلام!

منتظر و مخلص محمد فیاض ماہی



سعید علی نے بڑے کرب اور دکھ سے اکلوتے بیٹے کو دیکھا جو بیڈ پر آڑے ترچھے انداز میں نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں ربڑ سول کے جوتے ہنوز موجود تھے۔ کمرے کی ہر چیز بے ترتیبی سے عجیب سا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ سعید علی چند ثانیے کے لیے ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا جب اس بیٹے کے لیے اس نے بزرگانِ دین اور اولیاء کرام کے مقابر پر جا کر اپنی عرضی ان کی وساطت سے رب کائنات کے حضور پیش کی تھی۔ مگر آج اسے اس طرح شراب کے نشہ میں دھت دیکھ کر سعید علی کا دل بھر آیا تھا۔ اچانک اس نے اپنے دائیں کندھے پر کسی ہمدردانہ ہاتھ کا لمس محسوس کیا تو وہ چونک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو زویا بیگم ہونٹوں پر مسکان لیے کھڑی تھیں۔

سعید علی انگلی کی پور سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے واپس مڑے اور زویا بیگم کے ساتھ برآمدے میں ٹہلتے ہوئے محل کے وسیع لان میں چلے آئے۔ سرسبز گھاس پر شبنم کے ننھے منے قطرے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ان دونوں کے قدموں سے لپٹنے لگے۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی آسمان پر ہلکی ہلکی سیاہ رنگ کی بدلیاں ٹولیوں کی صورت میں آوارہ گردی کر رہی تھیں یا پھر اپنی رنگت کو مزید گہرا کرنے کے لیے کسی کی زلفوں سے سیاہی چرانے کی تگ و دو میں مصروف تھیں۔

''زویا بیگم!'' سعید علی ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ ''احمد سبحانی کی طرف سے میری پریشانی کب ختم ہوگی؟'' انہیں بھی پتہ تھا کہ زویا بیگم کے پاس سوائے دلاسہ اور تسلی کے کچھ نہیں ہے مگر وہ اپنے اندر کے کرب کو الفاظ کا جامہ پہنا کر آنکھ میں آنے والے آنسوؤں کو شکست دینا چاہتے تھے۔

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر نعمت سے نوازا ہے۔ رزق، مال و دولت، عہدہ، گھر، گاڑی اور

اولاد۔'' زویا بیگم نے سعید علی کی بات کا جواب اس طرح دینا شروع کیا کہ سعید علی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ چلتے ہوئے لان میں بنی چھتری کے نیچے آ گئے جہاں سیمنٹ اور چپس کے امتزاج سے چھ کرسیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک ایک کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ بیگم کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئے تو زویا بیگم ہونٹوں پہ مسکان سجاتی ہوئی بولیں۔ ''جس طرح کوئی مسیحا اپنے مریض کا علاج بڑے تحمل سے کرتا ہے۔ یا پھر کوئی ڈاکٹر تیز و تند نشتر سے مریضوں کا آپریشن تو کرتا ہے مگر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ مریض کو نشتر کی تکلیف کے بعد سکون اور راحت مل جائے۔ بالکل اسی طرح ہمیں بھی اپنے بچوں کی تربیت کرنا ہو گی۔'' بادلوں کی ہلکی سی گرج نے دونوں کو اوپر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ احمد سبحانی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔'' زویا نے اشارہ کیا کہ حاکم علی چائے لا رہا ہے۔ سعید علی خاموش ہو گئے۔ حاکم علی اس گھر کا پرانا ملازم تھا۔ کوئی بھی بات اس سے ڈھکی چھپی نہ تھی مگر زویا بیگم نہ چاہتی تھیں کہ صبح صبح ہی کوئی ملازم یہ سمجھے کہ اس ملک کا نامور صنعت کار سعید علی بیٹے کی وجہ سے پریشان ہے۔ حاکم علی نے چائے رکھ کر برتن ترتیب سے سجائے اور کپوں میں چائے ڈالنا چاہی تو زویا بیگم کے منع کرنے والے اشارہ پر وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ سعید علی اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے تو زویا بیگم نے کپ ان کے ہاتھوں کو لگایا تو وہ گرم کپ کا لمس محسوس کرتے ہوئے مسکرانے لگے۔ ''تھینک یو!'' کہہ کر انہوں نے چائے کا کپ پکڑا اور پہلا گھونٹ بھرتے ہوئے بولے۔ ''فاطمہ جاگ گئی ہے؟''

''وہ بڑی پنکچوئل ہے۔ صبح سویرے اٹھنا، نماز اور قرآن شریف سے فراغت کے بعد کالج کی تیاری اور پھر ناشتہ وقت پر کرنا اس کی ہابی ہے۔''

سعید علی ہنستے ہوئے بولے۔ ''چلو ایک طرف سے تو سکون کی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔''

''سعید علی!'' زویا بیگم چائے کا سپ لیتے ہوئے بولیں۔ ''بعض اوقات مجھے اس بات کا وجدان ہوتا ہے کہ احمد سبحانی اس دنیا کا باشندہ نہیں ہے۔'' سعید علی بیگم کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھ کر رہ گئے۔ وہ اپنی بات پر اڑی رہیں اور پھر بولیں۔ ''نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ ایک دن احمد سبحانی وہ سب کچھ کر گزرے گا جس پر ہمیں مان ہو گا۔ ہمارے سر فخر سے بلند ہو جائیں گے۔'' سعید علی نے خالی کپ میز پر رکھا اور بیگم کو چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ''میں تو کہتا ہوں...... علم نجوم کی ایک شاخ کھول لو...... ذرا اعلیٰ پیمانے پر......'' سعید



علی کے انداز پر دونوں کا ہی قہقہہ بلند ہو گیا۔ بادلوں کی گھن گرج بڑھنے لگی تو ہلکی سی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

''جس طرح موسم انسان کے مزاج سے مماثلت رکھتے ہوئے اس کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک موسم ایسا بھی آئے گا جو احمد سبحانی کے انداز اور رویہ کو تبدیل کر دے گا۔'' زویا بیگم کا انداز اور لہجہ پُر اعتماد تھا۔ سعید علی کے موبائل پر بیل ہوئی تو انہوں نے پہلے نمبر دیکھا اور فون اٹینڈ کر لیا۔

''وعلیکم السلام! کہو محسن خیریت تو ہے؟'' دوسری طرف سے سعید علی کا گہرا دوست سیٹھ محسن تھا جو کہ اس ملک کا نامور سیاستدان تھا۔ ''تم لوگ تو صبح سویرے اٹھنے کے عادی نہیں ہوتے۔'' سعید علی کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔

''ارے یار! تم اپنی بھابی کو تو جانتے ہی ہو۔'' دوسری طرف سے محسن سیٹھ کی بیزار آواز پر سعید علی نے بلند قہقہہ لگایا تو زویا بیگم نے شکر ادا کیا کہ سعید علی کا اندر کا موسم نارمل ہو گیا ہے۔ ''اس نے گزشتہ ہفتہ سے رٹ لگا رکھی ہے کہ جبران کی شادی کی خریداری سنگاپور سے کرے گی۔'' سیٹھ محسن کا انداز ہنوز برقرار تھا۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے یار!'' سعید علی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔'' بارش تیز ہو چکی تھی اور بادلوں نے نیلے آسمان کو سیاہ چادر اوڑھا کر اس کا نیلگوں وجود عارضی طور پر اپنے آپ میں سمیٹ لیا تھا۔

''تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ مسئلہ ہے......'' سیٹھ محسن ہنوز بیزار تھا۔ ''یار وہ چاہتی ہے کہ تمام شاپنگ سنگاپور سے کریں اور ساتھ بھابی بھی جائیں۔ آخر دونوں بہترین فرینڈز بھی ہیں اور فرسٹ کزن بھی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو سعید علی نے زویا بیگم کی طرف دیکھا جن کا انداز استفہامیہ تھا۔ ''ایسا کرتے ہیں...... تم اپنی بھابی نما سالی سے خود ہی بات کر لو۔'' سعید علی نے زویا بیگم کو فون پکڑا دیا۔

''السلام علیکم! محسن بھائی کیسے ہیں آپ؟'' زویا بیگم کا لہجہ باوقار اور انداز ٹھہرا ہوا تھا لیکن دوسری طرف سے محسن سیٹھ کا انداز ان کے ساتھ دوستانہ اور آواز چہک رہی تھی۔ ''وعلیکم السلام! سالی آدھے گھر والی۔''

''ویسے اگر گورنمنٹ آپ کے فون ٹیپ کرے تو انہیں پتہ چلے کہ آپ کیسے سیاستدان ہیں؟'' زویا بیگم کی ہنسی سے بھرپور آواز پر سعید علی بھی مسکرانے لگے۔ ''اچھا زویا! تم اپنی کزن

یعنی میری بیوی مائرہ کے ساتھ آج شام کو سنگاپور جارہی ہو۔'' سیٹھ محسن نے زویا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیا تو وہ حیرانگی سے بولی۔

''مگر کیوں؟'' دوسری طرف سے سیٹھ محسن کا مختصر سا جواب تھا۔ ''اپنے بنّے میاں سے پوچھ لو۔ کیوں؟ اللہ حافظ۔'' دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا تو انہوں نے سعید علی کی طرف دیکھا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی...... یہ مائرہ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ سنگاپور کا پروگرام بنا لیا۔'' انہوں نے موبائل سیٹ سعید علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جبران کی شادی ہے نا۔ اسی لیے وہ سنگاپور شاپنگ کرنے جارہی ہے۔ تم بھی ساتھ ہولو...... ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔'' سعید علی نے اجازت دے دی تو زویا بیگم کی چہکار ابھری۔ ''آپ کہتے ہیں تو میں چلی جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے مت جاؤ۔'' سعید علی نے چھیڑنے والے انداز میں کہا تو زویا بیگم کو تیوری مصنوعی طور پر چڑھ گئی۔ ''آخر وہ بے چاری کہاں ماری ماری پھرتی رہے گی۔ اکیلی۔'' سعید علی ہنسنے لگے۔ ''بے چاری؟ اکیلی؟ نوکروں کی فوج ہے اس بے چاری کے گھر میں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں نہیں جاتی۔'' زویا بیگم بھی مصنوعی غصہ دکھا رہی تھیں۔ سعید علی نے ان کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''زویا بیگم! تم تو جان ہو ہماری...... مگر اس طرح بھی حسین...... بلکہ اور بھی حسین لگتی ہو۔''

''میں کوئی آپ سے ناراض ہو سکتی ہوں...... یہ موسم تو محبتیں بانٹنے اور خوشیاں سمیٹنے کا ہے...... ناراضگی تو اس موسم کو بھی ناراض کر دے گی۔'' یک دم انہیں احساس ہوا کہ ان کے پاس کوئی اور بھی ہے۔ کیونکہ فاطمہ نے گلا کھنکار کر ان دونوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو سعید علی نے کھسیا کر زویا بیگم کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

''السلام علیکم! پاپا السلام علیکم! مما!'' فاطمہ نے حسب معمول ان دونوں کو سلام کیا تو سعید علی نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ زویا بیگم کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم یہاں کیوں آئی...... اگر سردی لگ گئی تو......'' زویا بیگم نے فاطمہ کا گورا چٹا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ تو وہ محبت سے ماں کی مامتا پر قربان ہوتی ہوئی بولی۔ ''مما آپ بھی کمال کرتی ہیں...... میں کوئی نازک سی گڑیا تھوڑی ہوں۔ بلیک بیلٹ ہوں...... اور پتہ ہے سردی مجھ جیسے لوگوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔'' اس کا انداز لڑکوں جیسا تھا۔ دونوں ہی اس کی بات



سن کر ہنسنے لگے۔

''اچھا یہ بتاؤ ناشتہ کر لیا ہے؟'' زویا بیگم نے پوچھا۔ ''آج موسم خراب ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ کالج نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔'' وہ یک دم چونک کر سیدھی ہوتی ہوئی بولی۔ ''ارے مما! آج ہی تو موسم اچھا ہے اور پھر آج کالج میں ہمارا مقابلہ بھی تو ہے۔''

''مقابلہ...... کیسا مقابلہ؟ کیا کوئی کراٹے کا پروگرام ہے؟'' سعید علی پریشان ہوتے ہوئے بولے۔

''نہیں پاپا!'' فاطمہ انہیں مطمئن کرنے لگی۔ ''بیت بازی...... یعنی شعر و شاعری کا مقابلہ۔'' سعید علی نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تو وہ بائے بائے کرتی ہوئی بھاگ گئی۔ بارش کچھ کم ہو گئی تھی۔ سعید علی اور زویا بیگم بھی اٹھ گئے۔ ''اچھا تو پھر شام کو مائرہ کے ساتھ جانا ہے یا...... وہ بے چاری، اکیلی...... ہی جائے گی؟'' سعید علی نے جاتے ہوئے بھی زویا بیگم کو چھیڑا تو دونوں ہنسنے لگے۔ ''آپ کے لیے کپڑے نکال دیئے ہیں آپ آفس جائیں۔'' سعید علی ''اوکے جناب'' کہتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔

☆=======☆=======☆

منو سمجھتا تھا کہ یہ اس کے عشق کی انتہا ہے مگر اس کے خاندان والے اسے جہالت سمجھتے تھے۔ کیونکہ منو ہر روز دور سے ہی صاحبِ مزار کو سلام کرتا اور اڑان بھرتا ہوا شہر کی فضاؤں میں گھوم پھر کر شام کو اپنے گھونسلے میں چلا جاتا تھا۔ یہ اس کا ہر روز کا معمول تھا اس کی اس عادت سے باقی خاندان کے تمام کبوتر نالاں تھے۔ وہ منو کو یہ کہہ کہہ کر زچ کرتے رہتے تھے کہ وہ سرکار سیّد لسوڑی شاہ کے مزار پر تو جاتا ہے مگر ان کے گنبد کو بوسہ کیوں نہیں دیتا۔ منو کا جواب ہوتا تھا کہ وہ اپنے عشق کو داغدار نہیں کرنا چاہتا اسی لیے وہ گنبد پر بیٹھ کر اسے بوسہ نہیں دیتا۔ اس بات پر اس کی بہت لے دے ہوتی تھی مگر وہ اپنی ضد اور بات پر اڑا رہا۔

بابا سیّد لسوڑی شاہ کا مزار جھنگ بازار فیصل آباد میں ہے ان کے مریدین کی طرح منو انسان نہ تھا بلکہ ایک کبوتر تھا اور انسانوں کی طرح وہ بھی صاحبِ مزار کا عقیدت مند تھا۔ اس کے باقی ''شریک'' سارا دن گنبد پر بیٹھ کر بابا جی کے لنگر سے اپنی چونچوں کو تر رکھتے تھے اور جاتے وقت بچوں کے لیے اپنی بساط کے مطابق چونچوں میں دانہ دنکا دبائے گھونسلوں کو لوٹ جاتے تھے۔ مگر اسی خاندان کا کبوتر ہونے کے باوجود منو کی عادت ان سب سے مختلف تھی۔ وہ بس ایک بار ہی گنبد پر بیٹھا تھا۔ بس اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے بعد اس کے

حواس جواب دے گئے تھے۔ وہ اپنی ان معصوم آنکھوں سے دیکھا جانے والا حسین اور خوبصورت منظر آج تک نہ بھولا تھا۔ وہ اس منظر کو یاد کر کے خود ہی ہنسنے اور رونے لگتا تھا۔ اس کی اس عادت سے خاندان کے تمام کبوتر سخت نالاں تھے۔ اس کے کزنوں نے تو اسے کئی بار ''قتل'' کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر ہر بار منو کی قسمت اچھی ہوتی تھی۔

گھونسلے کا ماحول کافی دنوں سے کچھ پراگندہ ہو رہا تھا۔ اُس کے کزنوں اور چچاؤں اور بڑوں نے منو کا تمام قصہ خاندان کے بزرگ کبوتر جگو دادا کو سنا دیا تھا وہ بھی برہم پھر رہا تھا۔ اس کی برہمی کی بڑی وجہ اس کا ذاتی عناد بھی تھا کیونکہ منو جو بھی دانہ دنکا شام کو لاتا تھا وہ اس میں سے دوسرے کبوتروں کی طرح جگو دادا کو حصہ نہ دیتا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کے لیے شہر بھر سے طرح طرح کے میوے وغیرہ اپنی چونچ میں دبا کر لاتا تھا جن کو دیکھ کر جگو دادا کا جی للچاتا تھا مگر منو اتھرا اور خودسر تھا وہ دادا کو ایک دانہ بھی چکھنے نہ دیتا تھا۔ اب جگو دادا کے ہاتھ میں ایک اہم پوائنٹ آ گیا تھا۔ وہ منو کو خاندان سے بے دخل کرنا چاہتا تھا اور اسے کوئی بھی نہ روک سکتا تھا۔ منو کے حمایتی بہن بھائی اور والدین بھی اس کی طرفداری نہ کر سکتے تھے۔

ان سب کی بدمعاشی کے باوجود منو نے کبھی بھی اپنے کزنوں کی شکایت پر برا نہ منایا تھا اور نہ ہی کبھی بڑوں تک بات پہنچائی تھی۔ وہ خاموش طبع تھا۔ کئی کئی گھنٹے بھوک اور پیاس میں ہی گزار دیتا تھا مگر شکوہ نہ زبان پر لاتا تھا۔ اس کے شریکے کی ہر روز کوشش ہوتی تھی کہ منو آج شام کو زندہ نہ ہی لوٹے تو اچھا ہے مگر جب شام کو وہ چونچ میں دانہ دبائے لوٹتا تو بہن بھائیوں سے پیار جتاتا دیکھ کر ''شریکا'' جل جاتا تھا۔

منو کا کل یوم حساب تھا اس کی جگو دادا کی عدالت میں پیشی تھی وہ ذہنی طور پر ہر فیصلہ سننے اور ماننے کو تیار تھا مگر وہ بھی یونہی نہیں چلا جائے گا جگو دادا اور شریکے کی ''پھٹیاں'' اکھیڑ کر ہی جائے گا۔ اس نے اڑان بھرتے ہوئے ایک نظر ہسپتال کے صحن پر ڈالی اور ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ وہ ہسپتال کے ماحول کو اپنی ننھی منی اور گول گول آنکھوں سے دیکھتا ہوا اس بات سے بھی باخبر رہتا تھا کہ کہیں عقاب ہی نہ اس پر جھپٹ پڑے۔ کیونکہ اس فضا میں ان کا سب سے بڑا دشمن وہی ایک پرندہ تھا۔

مریضوں کے لواحقین غم اور سوگواری کی ردا اوڑھ کر چہروں سے چھلکتی اداسی کے ساتھ اپنے مریضوں کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ مگر ان میں ہی بہت سے ایسے تھے جو مریض کے پاس بیٹھ کر تو اسے زندگی کی نعمتوں کی خوشخبریاں سناتے ہوتے تھے مگر وارڈ یا پھر ہسپتال



کی حدود سے باہر آتے ہی ہاتھ جھاڑ کر کہتے۔ ''چلو بھئی یہ بھی کام ختم ہوا۔''

یہ وہ لواحقین ہوتے تھے جو محض رشتہ داری نبھانے آتے تھے مریض کی حالت دیکھ کر انہیں مستقبل قریب میں اپنے کاروبار سے دو چھٹیاں ہونے کا دکھ اور غم پہلے ہی ستانے لگتا تھا۔

منو نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کی ڈاٹسن کار بہت تیزی کے ساتھ ہسپتال کے کھلے ہوئے گیٹ کو کراس کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ لگتا تھا کہ کوئی مریض انتہائی سیریس کنڈیشن میں ہے مگر منو کی تیز آنکھوں نے دیکھ لیا کہ گاڑی کا ڈرائیور اکیلا ہے گاڑی میں آگے اور پیچھے کوئی دوسرا نہ تھا۔ منو کی چھٹی حس پھڑکنے لگی چند سیکنڈ بعد وہ گاڑی ہسپتال کے مرکزی دروازے سے ٹکرا کر زوردار دھماکہ سے پھٹ گئی۔

کان کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکہ سے ہسپتال اور اردگرد کی عمارتیں لرز اٹھیں۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے خوف سے اُڑ گئے۔ منو کا دل تو گویا دھڑکنا بھول گیا تھا مگر سانسوں کی روانی اور دھڑکنوں کی بے ترتیبی اس بات کی گواہ تھی کہ منو اس خوفناک حادثے کو دیکھ کر سہم گیا ہے۔ ہسپتال کی گراؤنڈ میں جگہ جگہ انسانی گوشت کے لوتھڑے بکھر گئے تھے۔ درختوں کے پتے خون سے نہا چکے تھے۔ چند لمحے پہلے جو پُرسکون ماحول تھا اب گریہ زاری اور آہ و بکا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کوئی اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو پکڑے درد کی شدت سے کراہ رہا تھا تو کئی ہاتھ پاؤں سے معذور ہو کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ اَن گنت جانوں کے ضیاع پر منو کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔

وہ اس عظیم سانحہ پر دل کھول کر رو دیا، اس کی دادرسی کے لیے کوئی نہ آیا تھا اور نہ ہی کسی کو آنے کی فرصت تھی کیونکہ انسانیت تڑپ رہی تھی۔ انسانیت کے دشمنوں نے ہسپتال کو بھی نہ چھوڑا تھا۔ خونِ انسان کی ارزانی پر وہ انسانوں کی عقل پر ماتم کناں تھا۔ انسان ہی انسان کا قاتل تھا اور پھر اتنا بھیانک جرم کرنے کی کیا مجبوری تھی۔ اس انسانیت سوز جرم کو وہ کوئی بھی ام نہ دے پا رہا تھا مگر اسے معلوم تھا اور سن بھی رکھا تھا کہ اس طرح انسانیت کے قاتل اپنے اپ کو جہاد کا داعی کہہ کر جنت کا حقدار سمجھنے لگے تھے۔

وہ اس لمحہ کو کوسنے لگا جب اس نے خودکش حملہ آور کو گاڑی میں اکیلا دیکھا تھا۔ وہ خود کو لناہگار تصور کر رہا تھا۔ وہ چیخ و پکار کر کے سب کو اس کی جانب متوجہ کر سکتا تھا۔ وہ بتا سکتا تھا لہ اس آدمی سے بچو جو نام نہاد جہادی تنظیموں کے ہاتھ چڑھ کر انسانیت کا قتل کرنے والا

ہے۔ وہ بے قراری سے اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ زار وزار رو رہا تھا اس کی دلی
کیفیت کا اندازہ صرف رب کائنات کو ہی تھا۔ وہ اپنی بے زبانی پر بہت رویا۔ وہ خون کی اس
ندی کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا مگر وہاں سے اُڑنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ اس نے بے بسی سے
نظریں آسمان کی جانب اٹھائیں اور وہاں سے اُڑان بھرتا ہوا شہر کی جانب بڑھ گیا۔

اس خوفناک بم دھماکے سے بازار اور گلیاں سنسان ہو گئے تھے۔ ایمبولینس اور پولیس کی
گاڑیاں اپنے ہوٹر بجا کر لوگوں کو مزید خوفزدہ کر رہی تھیں۔ لوگ دیوانہ وار ہسپتال کی جانب
بھاگ رہے تھے۔ کئی تو اپنے پیاروں کو چیتھڑوں سے پہچان کر ان کے گوشت کو چوم رہے
تھے۔ زخمی آنکھیں خون برسا رہی تھیں۔ ہوش وحواس کھو دینے والوں کو ہوش دلانے اور آہ وبکا
کرنے والوں کو دلاسہ دینے کی فرصت اور وقت کسی کے پاس نہ تھا۔

منو نے ایک اداس سی آہ اس فضا میں چھوڑی اور گھونسلے کی جانب رخ کر لیا۔ اس کی
آنکھوں سے غم اور افسوس کی برسات جاری تھی۔ وہ اُمتِ محمدی ﷺ کو اس طرح کشت وخون
میں ڈوبا ہوا دیکھ کر ربِ واحد سے شکوہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ خالق کائنات ہے ہر چیز اس کے حکم
کے تابع ہے اور سبھی کچھ اسی کے فرمان کے مطابق ہوتا ہے۔ اس نے ہر انسان کی زندگی اور
موت کا وقت متعین کر رکھا ہے۔ مگر منو کی ناقص عقل میں یہ بات بھی تھی کہ رب واحد اپنے
محبوب ﷺ کی اُمت سے بہت پیار کرتا ہے اتنا پیار کہ ایک ماں ستر مرتبہ بھی اپنے بیٹے کو اتنا
پیار نہیں کر سکتی۔ تو پھر اس اُمت کا کیا گناہ ہے کہ اُمتی ہی اُمتی کا قاتل بن گیا ہے؟ اس بات
کا جواب منو کی ناقص عقل اور چھوٹی سوچ سے بالاتر تھا۔ اس نے گھونسلے میں پہنچ کر ہی دم لیا
تھا۔ صبح اس کی جگو دادا کی عدالت میں پیشی تھی۔

☆=======☆=======☆

"تمہارے پاپا تمہاری وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں۔" زویا بیگم نے احمد سبحانی کو
سمجھانے والے انداز میں کہا تو وہ بے فکری اور بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف ہو
گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ گویا اس نے زویا بیگم کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔ "میں نے تم سے
کچھ کہا ہے؟" زویا بیگم کا انداز جھلاہٹ بھرا تھا۔ وہ سالن کی ڈش اس کی طرف بڑھاتی ہوئی
بولیں تو احمد سبحانی کے جس ہاتھ میں نوالہ تھا وہ رک گیا۔ وہ انتہائی بے زاری سے بولا۔

"کم آن مما! آپ پاپا کی کسی بھی بات پر ٹینشن نہ لیا کریں۔" زویا بیگم حیرانگی سے
بیٹے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ "کسی بھی بات پر......؟" ان کا انداز ایسا تھا کہ انہیں احمد سبحانی



کے رویہ سے سخت دکھ پہنچا ہے۔

"تم خود سر اور ضدی ہو مجھے یہ علم ہے مگر بدتمیز بھی ہو گئے ہو...... یہ جان کر مجھے دکھ ہوا
ہے۔" انہوں نے ناراضگی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

احمد سبحانی کو نوالہ حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی کرسی پیچھے گھسیٹی اور کھانا
چھوڑ کر ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "مما! میرا یہ مقصد نہیں تھا...... میں یہ کہنا چاہتا
تھا کہ آپ میرے بارے میں پاپا کو سمجھائیں۔ وہ کوئی ٹینشن نہ لیا کریں۔" وہ کرب سے اس
کی طرف دیکھنے لگیں۔

"تم ماشاءاللہ جوان ہو گئے ہو۔" انہوں نے اٹھ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا
اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگیں۔ "تمہارے پاپا کے کندھے ناتواں ہو گئے
ہیں۔ فاطمہ کے لیے اچھا رشتہ اور تمہاری شادی کی بھی فکر ہے...... ہم اس گھر میں ننھے منے
بچوں کی چہکار سننا چاہتے ہیں...... بی سیریس بیٹا...... پلیز، کم از کم ہماری زندگیوں میں تو ایک
بار سنجیدہ ہو کر دکھا دو۔ مرنے کے بعد تو ذمہ داری تم سنبھال ہی لو گے۔"

وہ جوان بیٹے کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں۔ پلکوں پر آئے ہوئے آنسوؤں کو
چھپاتی ہوئی دوسری جانب چلی گئیں۔ احمد سبحانی چند ثانیے گنگ کھڑا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔
اب اس کی واپسی کا کوئی وقت کنفرم نہ تھا۔ اس نے گاڑی گیراج سے نکالی اور زن کی آواز
سے گیٹ کی جانب بڑھائی۔ ہاشم خان اگر سمجھدار نہ ہوتا اور گزشتہ گیارہ سال سے یہاں
ملازمت نہ کر رہا ہوتا تو گاڑی لازمی سٹیل کے گیٹ سے ٹکرا جاتی۔ وہ احمد سبحانی کے طور
طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ بلکہ اسے گود بھی کھلایا تھا۔

"خدا تم کو اپنا حفظ وااماں میں رکھے۔" ہاشم خان کے منہ سے ہر روز کی طرح آج بھی
دعا نکلی۔ احمد سبحانی کی گاڑی کا رخ سیدھا ساحل سمندر کی طرف تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر ڈوبتے
ہوئے سورج کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا معمول نہ تھا لیکن آج نہ جانے کیوں اس کا دل
چاہتا تھا کہ وہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کو تو سالوں سے دیکھ نہیں پایا آج سورج کو اس طرح
دیکھے کہ ڈوبتا کہاں ہے؟

اس نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی تھی سعید علی کا اصرار تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی
دوسرے ملک چلا جائے مگر زویا بیگم بیٹے کی جدائی کی وجہ سے اور احمد سبحانی کی یہ منطق تھی کہ
اس نے کون سا جاب کرنی ہے۔ اس بنا پر سعید علی کو اپنی خواہش کو کفن پہنانا پڑا۔ اس نے

اونچی آواز میں گانا لگا رکھا تھا۔ وہ گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ سر کو بھی ہلا رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ میوزک سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اس نے گاڑی ساحل پر روکی اور ایک ویران جگہ کی جانب چل پڑا۔ وہ رش اور بھیڑ میں بیٹھ کر اپنی شام کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ساحل پر کافی رش تھا۔ کئی فیملیاں اور کئی نوجوان جوڑے سمندر کی لہروں کو آتے جاتے دیکھ کر لطف محسوس کر رہے تھے۔ وہ بھی ننگے پاؤں چلتا ہوا ساحل کی ریت کو اپنے قدموں کے نشان دیتا ہوا کافی دور نکل آیا تھا۔ سمندر کا پانی اس کے پاؤں سے آ کر ٹکراتا تھا اور پھر واپس اپنی حد میں جانے کے لیے لوٹ جاتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس جگہ قدرے سکون ہے اور شور بھی کم ہے۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر دورِ افق پر سورج کا نظارہ کرتا ہوا اپنی نظروں کے زاویے کو ان جہازوں پر لے گیا جو سمندر میں پہاڑوں کی مانند کھڑے تھے۔

وہ آس پاس کے لوگوں کو دیکھتا ہوا برے برے منہ بنا رہا تھا۔ وہ اس کام میں بھی بوریت محسوس کرنے لگا تو اٹھ کر جانے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا سرپٹ بھاگتا ہوا سمندر کی جانب جا رہا تھا۔ احمد سجانی کو اچنبھا ہوا کیونکہ وہ پانی میں ڈوب کر مر سکتا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی بھی نہ لپکا تو احمد سجانی نے دوڑ لگا دی۔ لڑکا خطرناک حد تک آگے جا چکا تھا۔ اب پانی کی تیز لہروں اور گہرائی کی وجہ سے وہ بھاگ تو نہ رہا تھا مگر ابھی بھی آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ احمد سجانی کے اس طرح بھاگنے پر بہت سے دوسرے نوجوان بھی اسی طرف بھاگے مگر وہ ان سب سے آگے اور لڑکے کے زیادہ قریب تھا۔

"رک جاؤ...... تم مر جاؤ گے...... رک جاؤ۔" اب اس سے بھی بھاگا نہیں جا رہا تھا وہ چیخ چیخ کر لڑکے کو روک رہا تھا مگر یک دم ایک تیز اور بڑی لہر آئی اور لڑکے کو کافی آگے بہا کر لے گئی۔ احمد سجانی کے لیے یہ صورتِ حال کافی پریشان کن تھی۔ چند ثانیے تو اسے لڑکا نظر نہ آیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے تیراکوں والے انداز میں پانی میں خود کو اچھالا اور ہاتھوں اور پاؤں کی مدد سے لڑکے کی جانب بڑھنے لگا جو اب گردن تک ڈوب چکا تھا اور تیز لہریں اسے اپنا لقمہ بنانے پر مُصر تھیں۔ مگر احمد سجانی کی سر توڑ کوشش رنگ لائی وہ لڑکے کو اپنے بازوؤں میں بھرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"کیوں مرنا چاہتے ہو؟" اس نے موقع کی سنگینی کی پرواہ کیے بغیر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ واپس ساحل کی طرف بھی کھینچنے لگا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا اور لڑکا بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔



"مجھے چھوڑ دو...... مجھے زندہ نہیں رہنا ہے۔" لڑکے نے پاؤں سے ریت ٹکرانے پر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو تب تک کئی اور نوجوان ان تک پہنچ گئے تھے انہوں نے اس لڑکے اور احمد سجانی کو پکڑ لیا اور باہر ریت پر لے آئے۔ دونوں ریت پر لیٹے بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان کے ارد گرد لوگوں کا جم غفیر لگ گیا تھا۔

چند لمحات یونہی گزر گئے تو احمد سجانی اٹھا اور اسے بھی گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکا اور مجمع حیرت سے اس "تماشے" کو دیکھ رہے تھے۔

"اب بکواس کرو۔ کیوں مرنا چاہتے تھے؟" احمد سجانی نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو وہ نوجوان اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ تماشہ دلچسپ ہوتا گیا اور مجمع بھی بڑھ گیا اور سورج بھی اپنا سفر طے کرتا ہوا دور سمندر کی تہہ سے ٹکراتا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔

"کیا کروں گا جی کر؟" اس نے احمد سجانی سے الٹا سوال کر دیا۔ "ایک ماہ ہو گیا ہے گھر میں راشن نہیں ہے۔ جوان بہنوں کے رشتے طے کرنا ہیں۔ بی کام کیا ہے مگر ہر جگہ سے نو ویکنسی کا بورڈ نظر آتا ہے۔ جمع پونجی پڑھائی پر خرچ کر کے بوڑھے والدین اب مقروض ہو گئے ہیں۔" وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا مگر مجمع میں موجود کوئی بھی اس کا دُکھ درد بٹانے کا دعویدار نہ بن رہا تھا۔ "بوڑھی ماں کی بیماری کے لیے دوائی لینے کے لیے کوڑی بھی نہیں ہے۔ بس یہ سوچ کر بھیک مانگنے نکلا تھا مگر لعنت ہو...... اسلام کے ان ٹھیکیداروں پر اور وطن کے ان حکمرانوں پر جنہوں نے بھیک مانگنے کا بھی ٹھیکہ مقرر کر رکھا ہے...... کہاں جاؤں؟ کیا کروں...... جس پارٹی کی چالیس سال سے میرے باپ نے خدمت کی ہے آج اس کا کوئی بھی رکن میرے باپ کی خیریت دریافت کرنے کا بھی روادار نہیں ہے...... ظالم حکمرانو! کس منہ سے خدا کے حضور پیش ہو گے...... کس منہ سے......؟" وہ روتا ہوا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھ کر کھسکنا شروع کر دیا کہ یہ مر گیا ہے۔ مگر احمد سجانی جان گیا تھا کہ وہ کمزوری اور نقاہت سے ہی بے ہوش ہوا ہے۔ اس نے اسے اپنے کندھے پر لادا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆=======☆=======☆

"میں ضرور آؤں گا سرکار! ضرور آؤں گا۔" منو کے منہ سے یہ الفاظ سن کر خاندان کے تمام افراد کی آنکھ کھل گئی کیونکہ منو خود تو گہری نیند سویا ہوا تھا مگر وہ کسی سے بات کر رہا تھا اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ انتہائی با ادب اور با احترام ہو کر کسی معزز اور اعلیٰ ترین ہستی کے سامنے کھڑا

ہے یا پھر پاؤں میں گرا ہوا ہے۔ اس کے کزن اور دوسرا شریکا اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے نالاں تھے۔ وہ راتوں کو سویا سویا ہی بڑبڑانے لگتا تھا اور کبھی کبھار قہقہے لگا کر ہنسنے لگتا تھا اور بعض اوقات تو اخیر ہی ہو جاتی وہ سویا سویا ہی اونچی آواز میں رونے لگتا تھا جس سے اس کے تمام خاندان کی نیند خراب ہو جاتی تھی۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس وقت منو کو قتل کر دیں مگر جگو دادا کی دہشت آڑے آ جاتی تھی۔ آج کی بات نے تو جگو دادا کے بھی ہوش اُڑا دیئے تھے۔ وہ بھی کن اکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منو ایک بار پھر عرض گزار تھا۔

’’آپ نے تو مجھ سے بہت دور ڈیرہ لگا لیا ہے...... مگر آپ کی محبت میں مَیں یہ سفر طے کروں گا...... میں ہار نہیں مانوں گا اس کے شریکا میں کزنوں کی بہتات تھی ان میں ببلو اور جلو بھی تھے۔ جو اس سے خدا واسطے کا بیر رکھتے تھے۔ اب بھی جلو اس کی بات سن کر ببلو کے قریب ہوا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

’’میں اس سالے کے روز روز کے ڈراموں سے تنگ آ گیا ہوں۔‘‘ ببلو کا قہقہہ نکل گیا اب نیند تو سب کی خراب ہو چکی تھی۔ ’’میری دو تین سٹیج ایکٹروں کے گھروں کی منڈیر پر بیٹھک ہے...... اگر کہو تو ان میں سے کسی ایک سے بات کروں؟‘‘ جلو بھی اس کی بات میں تائیدی انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

’’ویسے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ منو انسانوں سے بھی بڑا اداکار ثابت ہو سکتا ہے۔‘‘ ببلو کا پھر نکلتا ہوا قہقہہ یک دم تھم گیا۔ وہ منو کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے کی رنگت زرد ہونے لگی تھی۔ اس کے کمزور اور ناتواں پر کانپنے لگے تھے۔ اس کا سر ہلنے لگا تھا۔
ببلو نے جلو سے سرگوشی کی ’’وہ ’’چاچی‘‘ کو جگا کر بتا دے کہ اس کا چہیتا کتنا بڑا ڈرامہ باز ہے۔
مگر دوسرے ہی لحہ منو کی چیخ نے باقی چند سوئے رہنے والوں کی بھی نیندیں حرام کر دیں۔ اس کی چیخ سے سب کے دل دہل گئے تھے۔ ایک تو صبح کا خودکش دھماکہ اور پھر رات کو منو کے ڈراموں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو اسے لگا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے ماحول سے دل اور دماغ کا رشتہ جوڑا تو اس نے اپنے خاندان والوں کی خون خوار آنکھیں دیکھ کر کانپنا شروع کر دیا۔

’’اوئے!‘‘ یہ جگو دادا کی اوئے تھی منو کے ماں باپ کانپ کر رہ گئے کیونکہ آج تک کسی کی بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ دادا کے سامنے دم مارنے کی جرأت کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ سوہنی اور



چندو دادا کی طرف فکرمندی سے دیکھ کر رہ گئے۔

’’کیا ہوا ہے تجھے؟‘‘ جگو دادا کی دہشت بھری آواز گونجی تو گھونسلے کا تمام ماحول رات کے اس پچھلے پہر میں نئے تماشے کا منتظر ہو گیا۔ ’’کچھ نہیں دادا جی!‘‘ منو حوصلہ کر کے بولا۔
’’نیند میں مجھے ایسا لگا کہ سانپ آ گیا ہے۔‘‘ اس کی بات سن کر سب کو واقعی سانپ سونگھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے گھونسلے میں بھی محفوظ نہ تھے اور پھر آج کے واقعہ نے تو ان سب کو دہلایا ہوا تھا۔ منو کی بات سن کر جگو دادا بھی لرز گیا مگر اپنا رعب داب بھی تو قائم رکھنا تھا وہ منو کی ماں سوہنی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ’’سوہنی! اس سے کہہ دو...... بلکہ کوئی سو رہا ہے تو اسے بھی بتا دینا...... صبح سے کوئی بھی ایک دن کے لیے دانہ کی تلاش میں نہیں جائے گا۔‘‘ سب اس کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ ’’گھر میں پڑا ہوا راشن استعمال کریں گے اور......‘‘ جگو دادا اپنی عادت کے مطابق آدھی بات کر کے خاموش ہوا تو منو کو بے چینی اور بے قراری ستانے لگی۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ ’’یہ سالا بڈھا سسپنس بہت پیدا کرتا ہے...... آگے کچھ مر بھی...... کچھ تو بکو......‘‘ وہ ان الفاظ کو اپنے دل میں ہی دفن کرتا ہوا جی جان سے دادا کی طرف متوجہ ہو گیا۔
’’صبح اس بات کا فیصلہ ہو گا کہ منو اس گھر میں رہے گا یا نہیں۔‘‘ جگو دادا نے یہ بم سوہنی اور چندو پر گرایا تو ان کے ہونٹ (چونچیں) پھڑپھڑا کر رہ گئیں۔ مگر دوسرے تمام خاندان والوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مبارکبادیں دے دیں۔

’’میں......‘‘ سوہنی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو چندو نے اسے اشارے سے منع کر دیا مگر وہ ماں تھی۔ دل کی بات ہونٹوں تک لانے کی جرأت کر گئی۔ ’’میں منو کو سمجھانے کی کوشش کروں گی بابا۔‘‘ سب نے سوہنی کی جرأت پر لعن طعن شروع کر دیا لیکن جگو کی ایک ہی جھڑکی نے سب کو پر جھاڑنے پر مجبور کر دیا۔

’’تم ماں ہو...... تمہیں اپنے بچے کی صفائی میں دلیل دینے کا پورا حق ہو گا اور پورا موقع دیا جائے گا۔‘‘ اس نے سب کی طرف دیکھا اور پھر گونجدار آواز میں بولا۔ ’’بس...... اب صبح ہی بات ہو گی۔ عدالت لگے گی اور مجرم حاضر ہو گا۔‘‘ جگو کی آخری بات نے ان سب کی زبانوں پر تالے لگا دیئے مگر دشمنوں کے دلوں میں خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کی وجہ سے نیند دور ہو گئی تھی جبکہ سوہنی اور چندو غم اور فکر کی وجہ سے جاگنے لگے۔ منو کو کوئی پروا نہ تھی مگر اس کی پرواہ کرنے والی اور اس کے عشق میں لڑنے والی خاندان کی سب سے خوبصورت کبوتری (چاندنی) بھی غمگین اور پریشان ہو گئی تھی۔

سوہنی کے دو آنسو نکل کر اس کے وجود کو گیلا کر گئے مگر منو نے دیکھ لیا تھا ان دو آنسوؤں سے منو کا وجود پگھل گیا۔ وہ مغموم اور اداس نظروں سے ماں باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مدھم چال چلتا ہوا آکر سوہنی کے قدموں میں لیٹ گیا۔ وہ لوٹنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ کبوتروں کے خاندان کا نافرمان اور نکھٹو ہے۔ وہ اپنی غلطی کی وجہ سے والدین کی بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔ وہ معافی مانگنے والے انداز میں سوہنی کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ مگر آنکھوں سے ندامت اور شرمندگی کا سیلاب جاری تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ میری اس گھر میں یہ آخری رات ہو۔'' وہ آہستگی سے بولا تو سوہنی نے تڑپ کر اسے اپنے پروں میں چھپا لیا۔ سردیوں کی سرد رات میں اس نے ماں کی ممتا کے گرم پروں کی حدت محسوس کی تو آنکھوں نے آنسوؤں کے سیلاب کے بند توڑ دیئے۔ وہ ہولے ہولے کانپنے لگا۔ آج تک وہ ممتا کی اس محبت بھری حدت سے ناآشنا ہی رہا تھا۔ اس کا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سوہنی کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی منو!'' چندو بھی منو اور سوہنی کو دلاسہ دیتا ہوا بولا۔

''میں برادری میں تمہاری وکالت کروں گا...... میں بہت پڑھا لکھا ہوں۔'' چندو کے ہونٹوں پر کرب کی لکیر بن گئی تھی۔ منو نے دُکھ سے باپ کی طرف دیکھا اور کربناک انداز میں بولا۔

''بابا! میں جوان ہوں اور تمہاری اولاد بھی...... اگر آپ میری وکالت کرو گے تو برادری والے آپ کو بھی برادری سے نکال دیں گے۔'' آنسوؤں کی موج لگ گئی تھی۔ ''آپ اس بڑھاپے میں کہاں دھکے کھاتے پھریں گے۔'' سوہنی کرب سے بولی۔ ''منو! میرے بچے تجھے کیا تکلیف ہے؟ مجھے بتا میں تیری ماں ہوں۔'' وہ ماں کی ممتا پر قربان ہوتا ہوا اس کی نگاہوں میں دیکھنے لگا جہاں پیار محبت کا بے لوث سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''میرے درد کا درماں یہ پرندے نہیں ہیں۔'' وہ دور اداسی سے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا انداز کھویا ہوا تھا۔ ''میں اس بستی کا باسی ہی نہیں ہوں۔ میری منزل کہیں اور ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تو جگو کے ''کھنگورے'' نے انہیں خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ان تینوں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ آج صبح نہ ہونے کی دعا کرنے لگے جبکہ شریکا من ہی من میں خوشی مناتا ہوا صبح دو گھنٹے پہلے ہو جانے کی دعا میں مشغول ہو گیا۔

☆=======☆=======☆

''ہماری گھٹی میں محبت اور عشق نام کی کوئی شیرینی نہیں ہوتی مسٹر احمد سبحانی!'' نوجوان



اور ہزاروں دلوں پر راج کرنے والی خوبصورت طوائف ''حیاء'' نے ایک مغرور ادا سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش میں دھڑام سے گر پڑا۔ اس نے کھڑا ہونے کو ایک مشکل کام جانا اور وہیں بیٹھے بیٹھے ہی حیاء کی بات کا جواب دینے کا فیصلہ کیا۔

''میں عشق و محبت کا سوداگر ہوں مِس حیاء!'' وہ کھسیانی ہنسی سے بولا۔ ''جس طرح مٹھائی بیچنے والا اس کی خوشبو سے اکتا گیا ہوتا ہے۔ بالکل میں بھی عشق و محبت کا بیوپار کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔'' وہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے پر قابو پاتا ہوا بولا۔ ''میں نشہ کی حالت میں ایک چیز نہیں بھولتا...... پوچھو کیا؟'' اس نے اپنا سوال حیاء کی ذہانت کی ٹوکری میں پھینکا تو وہ حیرت سے بولی۔ ''کیا بات نہیں بھولتے؟''

''یہی...... یہی بات نہیں بھولتا کہ میں عشق و محبت کا سوداگر ہوں...... میں جس سے محبت کروں...... کبھی بھی اس کے جسم کو نہ چھوؤں...... بالکل اسی طرح جس طرح مٹھائی بنانے والا خود مٹھائی نہیں کھاتا۔'' حیاء اس کی اس بات پر اسے داد دے کر رہ گئی وہ گزشتہ ایک سال سے اس کا گانا سننے آ رہا تھا مگر اس نے کبھی بھی حیاء کو چھوا تک نہ تھا۔ وہ دوسرے عام تماش بینوں سے بالکل الگ تھا۔ وہ کبھی نشہ کی زیادتی پر بھی آپے سے باہر نہ ہوا تھا۔

''احمد سبحانی!'' حیاء نے اس کا پورا نام اس کی فرمائش پر ہی لینا شروع کیا تھا۔

''بولو'' وہ نشے سے مخمور نگاہیں اوپر کرتا ہوا بولا۔ حیاء کے پنکھڑی جیسے ہونٹ وا ہوئے تو احمد سبحانی کے دل کو دھچکا لگا۔ وہ شیطان کے اس وار کو سہہ گیا۔ ''کب تک اس کوٹھے پر آتے رہو گے؟''

حیاء کے اس سوال پر اس کا قہقہہ اتنا جاندار تھا کہ اس کوٹھے کی ہر اک چیز حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مخملی اور قیمتی پردے اس کی حالت زار پر افسوس کرنے لگے کہ آج احمد سبحانی بھی کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ ڈھولکیاں اور طبلے، قیمتی فانوس بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا کیونکہ حیاء بھی محو حیرت تھی کہ آج تک کسی نے بھی احمد سبحانی کو سوائے مسکاتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ مگر حیاء نے کون سا انوکھا سوال کر دیا کہ وہ پُرزور قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے کبھی بھی دوسرے تماش بینوں کی طرح بڑھکیں نہ ماری تھیں۔

''مِس حیاء!'' اس بار وہ اٹھ کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ''جب تک تمہارے

گھنگھرو......تمہاری جوانی اور شباب کا ساتھ دیتے رہیں گے...... میں اس کوٹھے پر آتا رہوں گا۔'' وہ پھر گرنے لگا تو حیاء نے اپنا نازک سا ہاتھ سہارا دینے کے لیے آگے بڑھایا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ حیاء دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ ایک بار اسے چھو لے۔ اس نے دل کی بھڑاس اگلا سوال کر کے نکالی۔

''خود کو محبت و عشق کا سوداگر کہتے ہو...... آج تک کتنی محبتیں بیچی اور خریدی ہیں تم نے؟'' وہ اس سوال پر کانپ گیا اس کے چہرے پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوئے مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ ''بس حیاء! تم ایک طوائف ہو اور بقول تمہارے تمہیں اس بات کی گھٹی دی جاتی ہے کہ تماش بین کی جیب پر نظر رکھو...... معاف کرنا یہ سوال تمہاری زبان سے نکل کر خوبصورت تو ہوا ہے مگر......؟'' وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گیا تو حیاء کی بے قراری بول اٹھی۔

''مگر کیا......''

''کسی تماش بین کے عشق میں گرفتار ہو جانا تمہارے پیشے کی توہین ہے...... مگر یہ کہ یہ سوال تمہارے منہ سے جچا نہیں۔''

''کائنات کا ہر رنگ وجود زَن سے ہے اور محبت و عشق بھی حسن زَن کے محتاج ہیں۔'' وہ مغرور ادا سے بولی۔ وہ غور سے اس کو دیکھنے لگا اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

''زَن، زر، زمین...... کائنات کے تین جھگڑے ہیں اور انسان کی محبت بھی ان تین ناموں کے گرد گھومتی ہے...... مگر میری محبت اور میرا عشق ان تینوں جھگڑوں سے بالاتر ہے...... میں اپنے اندر کے انسان سے عشق کرتا ہوں۔'' یہ سن کر وہ طنزیہ انداز سے بولی۔

''کیا خوب عاشق ہو تم بھی۔ جب تمہارا عشق کہتا ہے شراب پی لیتے ہو...... جانتے ہو احمد سبحانی؟'' وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی اور پُرجوش انداز میں بولی۔ ''جو اپنے اندر کا عاشق ہے وہ اس کا مطیع بھی ہے اور کوئی بھی محبوب ایسا نہیں ہوتا جو اپنے عاشق کو شراب جیسی لعنت کا مشورہ دے...... جاؤ احمد سبحانی...... جاؤ جا کر کوئی ایسا محبوب ڈھونڈو...... جو طوائف نہ ہو...... جو شرابی نہ ہو۔ جو ہر عیب سے پاک ہو...... جاؤ۔'' احمد سبحانی کی چرخی گھوم گئی تھی۔ وہ ایک طوائف کی باتیں سن کر لرز گیا تھا۔ مگر جواب ضروری تھا۔

''مگر میں نے کبھی بھی اندر کے عاشق کے کہنے پر تمہیں چھوا نہیں...... میں اس کا مطیع نہیں ہوں اور نہ ہی میں اس کا غلام ہوں۔''



''تو پھر شراب کیوں پیتے ہو؟'' وہ تنک کر بولی۔ حالانکہ احمد سبحانی بھی دوسروں کی طرح اس کے گانے کا چاہنے والا تھا۔ اسے یہ ہمدردی کیوں ہونے لگی کہ وہ اسے شراب سے منع کرے۔

''شراب، تماش بین اور طوائف تینوں ازلی اور ابدی دوست ہیں مگر تینوں ہی بے وفا ہیں...... جب جیب خالی ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے طوائف تماش بین کا ساتھ چھوڑتی ہے اور پھر بوتل میں میسر ہونے والی شراب پیمانے تک پہنچتی ہے اور پھر وہ بھی ختم...... میں ان چیزوں سے عشق نہیں کرتا بلکہ وقت گزارتا ہوں۔''

یہاں جتنے بھی محبت کرنے والے ہوں گے
گردنوں میں غم کے طوق ڈالے ہوں گے

''گردنوں میں غم کے طوق ڈالے ہوں گے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا حیاء کے کوٹھے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ اسے کوٹھے کے گرم ماحول میں بالکل پتہ نہ چلا تھا کہ باہر موسم کی کیا پوزیشن ہے۔ اس نے تیز برسنے والی بارش میں اپنے آپ کو بھگویا تو اس کی مخمور آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ بارش سے بچ کر چلنے والے رہگیر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے کیونکہ رات کے پچھلے پہر سردی میں وہ بارش سے نہا رہا تھا۔ اس کی عجیب ہی منطق تھی۔ اسے کسی کی پرواہ نہ تھی وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جی رہا تھا۔ بارش میں اچھی طرح نہانے کے بعد وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور بارش میں گاڑی گھر کی طرف بھگا دی...... اس کو ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر کپڑے تبدیل کر کے کمبل میں گھسنا چاہتا تھا مگر ایک موڑ مڑتے ہی اسے یک دم بریک لگانے پڑے۔ گاڑی اس شخص کے بالکل قریب جا کر رک گئی جو اچانک سڑک کے درمیان آ گیا تھا۔ وائپر چل رہے تھے احمد سبحانی نے دیکھا کہ کوئی مخبوط الحواس شخص ہے مگر اس کا چہرہ بہت روشن تھا۔ وہ اس کی طرف والی کھڑکی کے پاس آیا۔ اس نے کچھ کہا مگر احمد سبحانی کو اس کی بڑبڑاہٹ سنائی نہ دی۔ اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تو باہر کھڑے شخص کی آواز سنائی دی۔

''عین...... تم عین ہو...... وہ قاف ہے...... تو پھر شین کہاں ہے؟'' احمد سبحانی کی سمجھ سے یہ الفاظ اور اس شخص کا سوال بالاتر تھا وہ کچھ نہ سمجھ پایا تو مخبوط الحواس شخص نے آنکھیں بند کر لیں احمد سبحانی نے گاڑی کا شیشہ اوپر کرنے کے لیے بٹن دبایا مگر شیشہ تو اس شخص نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ بٹن نے کچھ کام نہ کیا۔ اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ''شین......

اب انسان کو نہیں ملے گا...... وہ مجھے مل گیا ہے...... یاد رکھنا...... تم عین ہو...... وہ قاف ہے......تم عین ہو......وہ قاف ہے۔'' وہ شخص ایک طرف چلا گیا تو شیشہ بغیر بٹن دبائے ہی یک دم بند ہو گیا احمد سبحانی چونک گیا۔ اس نے گاڑی تیزی سے بھگائی اور گھر جا کر ہی سانس لیا۔

☆=======☆=======☆

''تم جب سے پیدا ہوئے ہو اس پُر سکون گھر کا ماحول خراب اور بے سکون ہو گیا ہے۔'' منو کے تایا نے اس پر پہلا اعتراض لگایا تو چندو نے دکھ سے بھائی کی طرف دیکھا مگر اس کی زہریلی زبان سے مزید زہر اگلنا شروع ہو گیا۔ ''تمہاری بد دماغی ہماری برداشت کی حدیں پار کر گئی ہے۔ اب ہمارا تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا۔'' چندو سوہنی اور چاندنی کے دل میں یہ الفاظ کھب رہے تھے مگر منو خاموش تھا وہ ذہنی طور پر ان الفاظ کو سننے اور برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ جگو دادا نے خاموشی سے تایا کا بیان سنا اور مجمع پر نظر ڈالی۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ محض اسی بنا پر منو کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا۔

''دادا جی!'' جلو آگے بڑھا اور اپنا شریکا ظاہر کرتا ہوا بولا۔ ''یہ بابا جی کے گنبد پر بھی نہیں بیٹھتا۔'' جگو دادا کو اس بات میں وزن لگا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب بلو کی باری تھی۔ ''یہ گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے کبھی بھی کوئی دانہ دنکا نہیں لایا۔'' دادا جگو کی عدالت لگی ہوئی تھی۔ منو سر جھکائے اپنی نارنجی چونچ کو بند کیے ہوئے افسردہ بیٹھا تھا۔ چندو اور سوہنی کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ وہ اپنے بھتیجوں کو دیکھ رہے تھے جن کی چونچیں ان کے بچے کے خلاف کھلی ہوئی تھیں۔ ان بچوں کو انہوں نے بھی بڑی محبت اور محنت سے پالا تھا۔ مگر آج اپنے پرائے کی پہچان ہو رہی تھی۔ ''یہ راتوں کو چیخیں مار مار کر ہمیں نیند سے بے زار کرتا ہے جس سے ہمارے دل دہل جاتے ہیں۔''

وہ سب اس وقت اپنے گھونسلے میں تھے صبح بہت خوشگوار تھی پروردِگار نے اپنی رحمتوں سے بادلوں کا منہ دھویا تھا۔ اب نیلا آسمان اپنی پوری آب و تاب سے اپنا چوڑا چکلا سینہ پھیلائے دنیا پر پڑنے والی بپتاؤں کو دیکھ اور سن رہا تھا۔ منو نے بے بسی سے آسمان کی جانب دیکھا مگر وہ اس پار بیٹھے ہوئے خالقِ کائنات کو نہ دیکھ سکا بس اس کا احساس تھا کہ وہ بھی منو کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی تھکی ماندی نظر لوٹ کر اس بڑی ٹہنی پر آ کر ٹھہر گئی جس پر آج کی عدالت کا منصف جگو دادا بیٹھا ہوا تھا۔



''تم سرکار سیّد لسوڑی شاہ کے گنبد پر کیوں نہیں بیٹھتے؟ تمہیں معلوم ہے تمہاری اس حرکت سے ہماری نسل بدنام ہو گی اور ہمارا عشق ہم سے نادم و شرمندہ ہو گا...... ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے اللہ کے ان نیک بندوں سے انتہا کی حد تک عشق کیا ہے اور تم ہمارے تاریخی عشق کو بدنام کرنا چاہتے ہو؟'' جگو دادا نے الزامات کی تفصیل بتانا شروع کی تو چاندنی تڑپ کر منو کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ حسبِ معمول خاموش تھا۔ ''تم گھر میں ہمیشہ خالی چونچ آتے ہو۔ چھوٹے بچوں کے لیے کوئی دانہ دنکا بھی نہیں لاتے۔'' جگو دادا نے الزامات دہرانے شروع کر دیئے۔ ''تم پر کبھی کبھار غشی کے دورے بھی پڑتے ہیں جو دوسروں کے لیے مہلک بھی ہو سکتے ہیں۔ میں تمہیں اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا اور ان الزامات کے جواب دینے کا پورا موقع دیتا ہوں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ لو۔'' جگو دادا نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے سب کی طرف دیکھا اور نظریں منو کی طرف لگا دیں۔ منو جانتا تھا کہ جگو دادا کو ان تمام باتوں کی تفصیل بلو اور جلو پہنچاتے رہتے ہیں۔

''میں اگر منو کو نہ دیکھوں گی تو مر ہی جاؤں گی۔'' چاندنی کے یہ الفاظ اس کی زبان سے ادا ہونے کی بجائے گولہ سا بن کر آنکھوں کے راستے آنسوؤں کے ذریعے بہہ نکلے۔ چندو اور سوہنی کی بے قراری دیدنی تھی۔ وہ بار بار اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدل بدل کر بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔

''آپ اپنا فیصلہ سنائیے۔'' منو نے پہلی بار چونچ کھولی تو سب کی نظریں پھر اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ''مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہو گا دادا جی!'' بلو نے جلو کے کان میں سرگوشی کی۔ ''دیکھو کس ڈھٹائی اور بے شرمی سے زبان چلا رہا ہے۔'' جگو دادا نے ان کو اپنی کرخت آواز سے جھڑکا اور منو سے مخاطب ہوا۔

''یہ خاندانی عدالت ہے اور اس عدالت کے قانون کے مطابق تم کو اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا جواب دینا پڑے گا۔ یہ ریت برسوں سے چلتی آ رہی ہے کہ مجرم کو صفائی کا پورا موقع دیا جائے گا۔''

''اسے جواب دینا ہو گا بابا!'' تایا نے پھر تیر پھینکا۔ ''ورنہ ہمارا عشق بدنام ہوتا رہے گا۔ کل کو پھر کوئی سر پھرا اسی طرح خاندان کی بدنامی کا سبب بن سکتا ہے۔'' منو نے تایا کی زبان بند کرانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ضروری نہیں سمجھتا کہ ہر سوال کا جواب دوں۔ آپ کو جو کرنا ہے کر لو۔'' منو کے اس جواب نے گھونسلے میں انتشار برپا کر دیا۔ ہر زبان پر

اس کی بدزبانی کا چرچا ہونے لگا تو سوہنی نے بیٹے کی دیدہ دلیری کو دل ہی دل میں داد دی۔ مگر خاندانی روایت کے مطابق اس کو جھڑکی ماری۔

''منو! تم بدتمیز ہو گئے ہو۔ خاندان کے بڑوں کی عزت کا لحاظ کرو اور جیسا بابا جی کہہ رہے ہیں۔ ان کی باتوں کا جواب دو۔'' وہ بھی جانتا تھا کہ اس کی ماں خاندان کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ ماں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پیاری ماں!'' ان الفاظ کے ساتھ ہی آنکھوں کی بستیوں نے آنسوؤں کے سیلاب کے بند کھول دیئے۔ ''میں نے جب اس گھرانے میں آنکھ کھولی تو میں بہت خوش تھا۔ کیونکہ میرے پاس بھی رشتے ناطے موجود تھے جو مجھے باہر کی دنیا میں اڑان بھرنے کے لیے جن سہاروں اور تجربوں کی ضرورت تھی وہ ان میں میری رہنمائی کر سکتے تھے۔'' اب ہر کوئی منو کی بات توجہ سے سن رہا تھا کیونکہ اس کے بعد اس نے چلے جانا تھا۔

''لیکن میں نے جب اُڑنے کے لیے خاندان کے ان بڑوں کا سہارا لینا چاہا تو ہر کسی نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے جب بھی کوئی سہارا ڈھونڈنا چاہا مجھے نفرت سے دھتکار دیا گیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ میرا قصور کیا تھا اور آج تک کیا ہے۔'' منو کی آواز پھٹ گئی تو ببلو کی ترکش سے ایک اور تیر آیا۔ ''ہمیں تمہارے گزرے ہوئے حالات اور ساری عمر سے کچھ نہیں لینا دینا۔'' سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ اور شیر ہوتا ہوا بولا۔ ''بس ان سوالوں کے جوابات دو جو تم سے دادا جی نے کیے ہیں۔ تاکہ وہ اپنا اہم فیصلہ سنا سکیں۔'' چندو اور سوہنی پر رشتہ دار کا نیا چہرہ کھل رہا تھا۔

''میں خود ہی اس ماحول میں نہیں رہنا چاہتا۔'' منو نے جواب دیا۔ تو جگو دادا اس جواب کی تفصیل سننے کے لیے بے تابی سے بولا۔ ''مگر کیوں؟'' جگو کا مختصر سا سوال سن کر منو کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکان پھیل گئی۔

''یہ آپ پوچھ رہے ہیں دادا جی!'' جگو کھسیانا ہو گیا۔ ''ہاں!''

''تو پھر دل پر ہاتھ رکھ کر سنو! مجھے اس شہر اور ماحول سے وحشت ہوتی ہے۔ مجھے خوف آتا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ میں جب دیکھتا ہوں کہ اسلام کے نام پر مسلمان اپنے ہی بھائی کو قتل کرنے کے لیے اپنے جسم کے ساتھ ہزاروں گرام بارود باندھ کر آزادانہ اور بے خوف گھوم رہا ہے۔ کوئی بھی حکومت اس کا سدِباب نہیں کرتی۔ ہر کوئی اپنا پیٹ بھر کر رات کو سو جاتا ہے اور پھر صبح کو نئے سرے سے اس ملک کو کھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک کسی نے بھی



اس خودکش حملہ آور سے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کی کہ وہ کس مجبوری کے تحت نام نہاد ''جہادی'' بن گیا ہے۔''

منو اپنی سانس درست کرنے کے لیے رکا تو جلو نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔

''اس سارے کام سے تمہارا کیا تعلق؟ تم تو انسان نہیں ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ کام انسان کر رہے ہیں؟'' منو نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا تو وہ خاموش ہو گیا۔ ''یہ خون خوار بھیڑیے ہیں جو ہر روز اپنی محکوم رعایا کا خون پینے کے لیے نت نئے بہانے تراشتے ہیں ہسپتالوں میں غریب اور نادار مریضوں کے گردے بیچ کر کھا جاتے ہیں۔ مساجد اور مدرسوں میں مذہب، اور اسلام کے نام پر اور قرآن کے نام پر چندہ لے کر لاکھوں روپیہ ڈکار لیتے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں؟ میں ان حکمرانوں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بم حملوں میں مرنے والے لواحقین کو جو مالی امداد کے لیے چیک دے کر ان کے زخموں پر پھاہا رکھنے کی بھونڈی کوشش کی جاتی ہے کیا اس سے مرنے والا واپس آ جاتا ہے؟ میرے خیال میں کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں پوچھ سکتا کیونکہ ہر کسی نے ''خزانہ کھایا ہوا ہے۔'' منو اپنی آخری بات پر زور دے کر خاموش ہو گیا تو تایا کی زبان میں کھجلی ہوئی۔ ''یہ حکومتوں اور انسانوں کے معاملے میں تم اپنی فکر کرو اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھا کر عدالت کا وقت مت برباد کرو۔'' تایا نے جگو دادا کی آشیرباد کا اشارہ پا کر پرانا سوال دہرایا۔ ''تم بابا سیّد لسوڑی شاہ کے گنبد پر کیوں نہیں بیٹھتے؟ کیا تم بزرگوں کے آداب واحترام بھول گئے ہو؟''

''آداب تو آپ سب لوگ بھول گئے ہیں۔'' منو نے سب کو ہی رگڑا دیا تو سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ ''میں نے کہا تھا دادا جی کہ آپ فیصلہ سنا کر اپنی جان مجھ سے چھڑا لیں تفصیل میں نہ جائیں۔ مگر آپ کو ان کا ڈر تھا کہ اگر میں منو کو گھونسلہ میں رکھوں گا تو آپ کو اپنا ہر روز والا ''بھتہ'' نہیں ملے گا۔'' منو کی گستاخی حد سے بڑھنے لگی۔

''تم انتہائی بدتمیز اور نامعقول ہو۔ تمہیں خاندان والوں کی عزت کا پتہ نہیں ہے۔ تم سادات اور اولیاء کا احترام کیا جانو۔'' جگو دادا کی سرخ آنکھوں نے باغی منو کو گھور گھور کر جرم بڑھنے کا عندیہ دینا شروع کر دیا۔ ''جلدی سے بکو...... کہ گنبد پر کیوں نہیں بیٹھتے...... ورنہ ابھی آگ لگوا دوں گا۔'' سوہنی کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ ملتجیانہ نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگی۔

''گنبد پر بیٹھنے سے پہلے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ صاحب مزار اپنے ''گھر'' میں کیا کر رہے ہیں؟'' منو کا جواب شروع ہوا تو سب کی ہوا نکلنا شروع ہوگئی۔ ''کبھی نیچے دیکھنے کی بھی کوشش کی ہے یا صرف گنبد اور درگاہوں پر گند ڈالنا ہی سیکھا ہے۔'' جگو سرخ آنکھوں پر قابو پاتا ہوا بولا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم بدتمیز ہیں؟''

''ہاں ہاں...... تم بدتمیز بھی ہو اور گستاخ بھی۔'' منو کی گستاخی ان سب پر گراں گزر رہی تھی مگر وہ اس لمحہ مجرم تھا اور اپنی صفائی میں جو کچھ کہنے والا تھا ان سب کو سننا مجبوری تھا۔

''صاحب مزار کی عزت و تکریم کا احساس نہیں ہے تم سب کو کبھی بھی یہ خیال نہیں کرتے کہ صاحب مزار نیچے اپنے گھر میں نماز اور قرآن پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں اور تم...... ان پر گند ڈالتے ہو...... شرم آنی چاہیے تم کو اپنے آپ کو عاشق کہتے ہوئے...... ڈھنڈورا تو پیٹتے ہو کہ ہم تاریخی طور پر ولیوں اور سادات کے عاشق ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے گھروں سے کھا کر ان کے گنبدوں پر بیٹھ کر گندگی پھیلاتے ہو...... ایسا کرتے وقت تمہارا عشق تمہیں ملامت نہیں کرتا۔''

منو کی باتیں سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ چاندنی نے فخر سے منو کی طرف دیکھا اور اپنی گردن اکڑا کر بیٹھ گئی۔ ''مگر میں نے جب سے سیّد لسوڑی شاہ سرکار کو اپنی ''ڈھیری'' کے نیچے قرآن پڑھتے دیکھا ہے۔ میرا ضمیر مجھ سے میرے عشق کی گہرائی اور سچائی کے متعلق سوالات کرتا ہے...... میں تمہاری طرح بے ضمیر اور جھوٹا عاشق نہیں ہوں اور نہ ہی اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ میں تاریخی عاشق ہوں...... میں تو آج کی نسل سے تعلق رکھنے والا ان کا ادنیٰ غلام ہوں......'' اس کا اشارہ بہلو، جلو اور دیگر ان پرندوں کی طرف تھا جو اس کے ہم عمر تھے اور اس سے خار کھاتے تھے۔ اس کی بات سن کر تو ایک بار سب کا دل دہل گیا۔ انہوں نے کبھی بھی اس بات پر دھیان نہ دیا تھا کہ صاحب مزار کی کیا مصروفیات ہیں لیکن اپنی بات پر اڑے رہنے والے بہلو اور جلو نے ایک اور تیر پھینکا۔

''تم ہمارے ہم عمر ہمیں جو جی چاہے کہہ لو۔ مگر تمہیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ تم دادا جی کی بھی توہین کرو۔'' سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی وہ اپنے بڑھتے ہوئے حمایتیوں کی تعداد سے اور بھی شیر ہوگیا تھا۔ سینہ تان کر آگے بڑھا اور جگو دادا سے بولا۔ ''دادا جی! اس سے پوچھیے کہ اس کے پاس وہ آنکھیں کہاں سے آئیں کہ اس نے سرکار سیّد لسوڑی شاہ کو اپنی



کے اندر قرآن حکیم کی تلاوت میں مگن دیکھ لیا؟'' بہلو بہت دور کی کوڑی لایا تھا اس کے اس نقطہ اعتراض پر منو کو دلیل دینی تھی مگر ایک بار تو خاندان میں بہلو کی واہ واہ ہوگئی تھی۔ سوہنی نہ جانے کیوں مطمئن نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ منو آگے بڑھا اور بہلو سے مخاطب ہوا۔

''کبھی عاشق سے ملے ہو؟'' اس کا سوال سن کر شرارتی بچوں نے قہقہے لگائے تو بہلو بھی مسکراتا ہوا بولا۔ ''ہاں کئی بار...... کئی قسم کے عاشقوں سے ملا ہوں۔''

''اونہہ۔'' منو کی توپ نے ایک اور گولہ خاندان کی طرف پھینکا۔ ''میں کئی قسم کے عاشقوں کی بات نہیں کر رہا۔ میں کائنات کے پہلے ''عاشق'' کی بات کر رہا ہوں۔'' اس بار منو کی مدلل گفتگو سن کر سب کو سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔ اب اگر سانپ آ بھی جاتا تو وہ شاید نہ بھاگتے اور نہ ڈرتے کیونکہ منو کی بات نے ان کی ''پھٹیاں'' اکھیڑ دی تھیں اور ان کو لگتا تھا کہ وہ سب مردہ ہوگئے ہیں ان کی روحیں فنا ہوگئی ہیں۔ وہ خود کو زندہ درگور محسوس کرنے لگے تھے۔ کیونکہ ان سب کو بخوبی علم تھا کہ منو کائنات کے پہلے عاشق ''اللہ'' کی بات کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کے بارے میں تو کسی بھی ذی روح کو رتی برابر شک نہ تھا۔ ذرہ ذرہ، ریزہ ریزہ، کنکر، پہاڑ، دریا، شجر، حجر، غرض کہ کائنات کی ہر چیز کو اس کائنات کے پہلے عاشق نے اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے محبوب ﷺ پر درود و سلام کے نذرانے عقیدت و احترام سے پیش کرتے رہیں۔ اس جیسا عاشق نہ کوئی ہوا ہے اور نہ ہی کوئی ہوگا۔ عشق کی انتہا اور کیا ہوگی کہ جیسا محبوب ﷺ نے چاہا آپ ﷺ کو ویسا ہی بنا دیا۔ معراج کی رات عرش بریں پر بلوا کر دیدار سے نوازا اور خود بھی محبوب ﷺ کا دیدار اسی طرح کیا کہ آپ ﷺ کی وہ تمام باتیں مانیں جو اس گناہگار اُمت کی بخشش کا وسیلہ بن گئیں۔

وہ سب کے سب منو کی بات سے پریشان تھے اور اب کوئی بھی جرأت نہ کر رہا تھا کہ منو سے کوئی سوال پوچھے یا پھر اس پر الزام لگائے۔ بہلو جو کچھ دیر پہلے سینہ چوڑا کر کے سوہنی، چندو اور چاندنی کو زچ کر رہا تھا اب اس کی ہوا نکل گئی تھی۔ منو اس کی سوچ سے بھی بڑا نکلا تھا۔ پھر اس خاموشی کو منو نے ہی توڑا۔ ''کیوں......؟ اب مر گئے ہو؟ اس کائنات کا ہر ایک ذرہ رب تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ اسے ہم جیسوں کی عبادت کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ اس کی ثنا کے لیے اس کے اَن گنت فرشتے موجود ہیں۔ مگر اس نے یہ تمام کھیل اپنے محبوب ﷺ کے عشق میں رچایا ہے۔ کائنات کا پہلا محبوب ﷺ اور محبت...... آپ ﷺ کو بنا کر قلم توڑ ڈالا۔ نبوت ختم کر دی گئی۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر ان سے پہلے آئے مگر کسی بھی

نبی کی اُمت کو نماز جیسی پُرسکون عبادت نہ ملی۔ اس نے معراج شریف کی رات یہ تحفہ اپنے محبوب ﷺ کو دیا اور فرمایا کہ جو میری نماز پڑھے گا اس کو بخش دوں گا کیونکہ نماز کے دوران اس نے اپنے محبوب ﷺ پر درود شریف کو لازم کر دیا ہے۔'' منو سانس درست کرنے کے لیے رکا تو اس کی ماں نے سب کی زبان بندی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے منو سے سوال کر دیا۔

''تم نے یہ سب باتیں کہاں سے سیکھی ہیں منو!'' اب جگو دادا سمیت کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس سے بات کرتا۔ منو نے پہلی بار محسوس کیا کہ اب اس کی ماں کے سینے سے بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ ماں کے پاس پہنچا تو چندو اور چاندنی بھی آگے بڑھ گئے۔ وہ پیار سے بولا۔

''پیاری ماں! میں بھی عشق کی گلی کا ایک چکر لگا آیا ہوں۔ بس ایک ہی چکر! میری یہ کیفیت ایک چکر نے کی ہے میں جس منزل کی جانب روانہ ہونا چاہتا ہوں خواب میں دیکھتا ہوں کہ وہ منزل میری پہنچ سے بہت دور ہے اور...... اور دور ہوتی جاتی ہے۔ میں اس منزل کی جانب بڑھتا ہوں تو میرے بازو شل ہو جاتے ہیں مگر میں وہاں تک پہنچ نہیں پاتا۔ بس میں سوتے میں چیخنے چلانے لگتا ہوں۔ میں اپنی بے بسی پر دل کھول کر روتا ہوں۔ مجھ پر وجدانی اور پُرسرور کیفیت طاری ہو جاتی ہے...... میں اپنے آپ میں نہیں رہتا پیاری ماں...... اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے میں اس کیفیت سے نکلنا نہیں چاہتا مگر آپ سب کی نیندیں خراب ہو جاتی ہیں جو میرے لطف اور سرور کو بھی خراب کر دیتی ہیں۔'' منو یہ کہہ کر خاموش ہوا تو چندو نے اسے اپنے پروں میں بھینچ لیا۔ اس کا بیٹا عاشقِ رسول ﷺ تھا۔ اس بات پر اسے فخر ہونے لگا تھا۔

منو آہستگی سے باپ کی شفقت بھری ''گود'' سے الگ ہوا اور چاندنی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''میں اس شہر میں نہیں رہنا چاہتا۔'' چاندنی کا دل زور سے دھڑکا وہ پہلی بار منو سے براہِ راست مخاطب ہوئی۔ ''مگر کیوں منو؟'' اس کا تین لفظی سوال بہت کچھ منو کے دل و دماغ میں چھوڑ گیا۔ وہ دور خلاؤں میں گھورتا ہوا بولا۔

''اس شہر میں موت اس طرح بٹ رہی ہے۔ جیسے کوئی ہر روز خیرات بانٹ رہا ہو...... زندگی زندگی کو ترس گئی ہے۔ میں کسی پُرامن جگہ جانا چاہتا ہوں۔''

''پُرامن جگہ تو اس کائنات میں کوئی نہیں ہے میرے بچے!'' چندو نے پہلی بار زبان کھولی۔ منو کی باتیں سن کر اس خاندان کے بزرگ جگو دادا کا بھی دل پسیج گیا تھا وہ بھی آگے بڑھتا ہوا نگاہیں جھکا کر بولا۔ ''ہاں منو! اس دنیا میں کون سی جگہ ایسی ہے جہاں ''صاحب



بہادر'' نے خون خرابہ نہ کروایا ہو۔ جو پُرامن اور پُرسکون ہو؟'' جگو دادا کی آواز میں مٹھاس نے سب کو عندیہ دیا کہ بازی پلٹنے والی ہے۔ ''اگر تمہاری نظر میں کوئی جگہ ہے تو ہمیں بھی بتاؤ۔ ہم سب اسی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔'' جگو دادا کا آخری فقرہ جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ خاندان کے تمام کبوتر بول پڑے۔ ''اگر منو کے ساتھ ہی جا کر رہنا مرنا ہے تو پھر اتنا کھڑاگ پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اس شہر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔'' جگو دادا کو پہلی بار اپنی سبکی محسوس ہوئی وہ خاموش ہو کر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر پا رہا تھا منو کی مدلل گفتگو نے اس کی کیا پورے شریکے کی بولتی بند کر دی تھی۔ اب بھی منو ہی بولا تھا۔

''سچے عاشق کی نگاہ آسمان کے پار جاتی ہے۔ میں بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مقدس و معطر کا ادنیٰ سا غلام ہوں مگر اُن کی ذاتِ اطہر سے عشق کا دعویدار بھی ہوں۔ بس یہ انہی کی نگاہِ ناز کا خاص کرم ہے کہ انہوں نے مجھے ایسی نگاہ عطا کی کہ میں سرکار سیّد لسوڑی شاہ کو قرآن کریم پڑھتے ہوئے دیکھ سکا...... یہ تمہارے پہلے سوال کا جواب ہے۔''

دوسری بات کا جواب دینے کے لیے وہ الفاظ کا ذخیرہ جمع کرتا ہوا چند ثانیے کے بعد بولا۔

''اس کائنات میں ایک ایسا بھی شہر ہے۔ جہاں امن اور سکون ہی سکون ہے۔ میں اس شہر کو اکثر خوابوں میں دیکھ چکا ہوں۔ بن مانگے خیرات ملتی ہے۔ آرزوئیں ہونٹوں پر آنے کو مچلتی رہتی ہیں کہ ان کو فیض و کرم سے نواز دیا جاتا ہے۔ ہر کسی کی جھولی بھر دی جاتی ہے۔ چھید شدہ جھولیاں لطف و کرم کے پیوند لگا کر لبالب کر دی جاتی ہیں۔ روزانہ ستر ہزار فرشتے اپنا دامن پھیلائے درود و سلام کے گجرے نچھاور کرتے ہوئے اس در کی خدمت میں ساری زندگی گزارنے کی بھیک مانگتے ہیں۔ مگر جو فرشتہ ایک بار آ گیا ہے تا قیامت اس کی باری پھر نہیں آئے گی۔ میں بھی اسی شہر کی طرف جاؤں گا۔ اس شہر کا مسافر بننے کی سعادت حاصل کروں گا...... جانتے ہو...... وہ شہر کون سا ہے؟''

منو کو سانس درست کرنے کا جواز مل گیا تھا جبکہ اس کی باتیں سن کر سب کی چونچیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ منو مدینہ منورہ کی بات کر رہا ہے۔ ان کی نظریں شرم سے اور مدینے کے ذکر پر احترام سے جھکی ہوئی تھیں۔

''میں مدنی مہمان بنوں گا۔ آقائے دو جہاں، محبوب کبریا ﷺ کی ذات پاک پر ان کے قدموں کی طرف بیٹھ کر جنت البقیع میں درود و سلام پڑھا کروں گا۔ ان کو رب تعالیٰ نے

جو تقسیم کرنے کے لیے رزق دیا ہے۔ اسی رزق سے میں بھی اپنا پیٹ پالوں گا۔'' منو کی آواز جوش جذبات سے پھٹ گئی۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔

''تم لوگوں نے میرے عشق پر شک کیا ہے۔ میرے عشق کو مشکوک سمجھتے ہوئے مجھے ننگا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم دیکھنا اپنے عشق کو ہر قسم کے شک سے پاک کرنے کے لیے میں فضاؤں، ہواؤں اور خلاؤں کا سینہ چیروں گا۔ چاہے کیسے ہی طوفان کیوں نہ ہوں میں اپنے ناتواں اور کمزور پروں سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے گنبدِ خضریٰ تک پہنچوں گا۔'' اس کی گریہ زاری بڑھ کر خاندان کے تمام افراد کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ آج تک منو کو نکما اور جاہل ہی سمجھتے رہے تھے۔ اس کے عشق پر شک کرتے رہے تھے۔ مگر وہ ان سب کو مات دے گیا تھا۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگے جب انہوں نے یہ میٹنگ نما عدالت لگائی تھی اور منو کو شہر بدر کرنے کا فیصلہ سنانا تھا۔

''میری خطاؤں کو معاف کرنا۔ میرے عشق کی گہرائی پر شک کرنے والو۔ میرا عشق اس بات کی شہادت بنے گا کہ عشق کا ''شین'' صرف شک پر ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ اس بات کی ''شہادت'' مانگتا ہے کہ اپنی سچائی کو ثابت کرو۔ اس بات کی شہادت کہ عاشق کتنا ہی کمزور اور ناتواں کیوں نہ ہو وہ اپنے عشق کو سرخرو کرنے کی جو جان توڑ کوشش کرتا ہے وہ اس بات کی شہادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے عشق سے کتنا مخلص ہے۔ میرا عشق شہادت دے گا میں ''شین'' سے شک کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے والوں کے لیے ایک مثال بنا ہوں۔'' وہ دادا جگو کی طرف بڑھا اور چند لمحات پُرسکوت گزارنے کے بعد بولا۔ ''دادا جی! میں آپ کا گستاخ ہوں اس بات کی معافی دے دینا۔ بس یہ سمجھ لینا کہ میں کمزور اور ناتواں ہو کر شہر محمد ﷺ کا مسافر بننے کی جرأت کر بیٹھا ہوں'' جگو کا دل لرز گیا۔ وہ اونچی ٹہنی سے اتر کر منو کے قدموں میں آ گیا۔

''میں خطاوار ہوں میرے بچے! مجھے تم پر فخر ہونا چاہیے تھا...... میں غلط مشوروں کی بنا پر تم سے خار کھاتا رہا۔ مجھے تم معاف کر دو۔ کیونکہ یہ جاہل نہیں جانتے کہ تمہارا مرتبہ کیا ہے۔ تم تو ہماری نسلوں کو سنوارنے کے لیے اپنے کام میں مگن تھے۔ مجھے معاف کر دینا۔'' جگو دادا کو پہلی بار ہر کسی نے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ ''اپنے اس عشق کا ڈٹ کر دعویدار بننا۔ عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہر کسی کو عطا نہیں ہوتا...... میرا عقیدت بھرا سلام والئی مدینہ سے کہنا۔'' وہ آگے نہ بول سکا۔

جگو کے بدلے ہوئے رویہ نے اس بات کی آسانی پیدا کر دی تھی کہ منو کے جانے کے



بعد چندو اور سوہنی کو خاندان والوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ''مجھے میری خطاؤں سمیت اپنانے کا شکریہ۔'' اس نے چاندنی سے کہا تو وہ رونے لگی۔ اب وہ اپنے ماں باپ کی طرف بڑھ گیا۔ ''والدین کی اجازت کے بغیر تو حج نہیں ہوتا۔ ان کی رضامندی کے بغیر میرا عشقیہ سفر پورا کیسے ہوگا؟ اور میرا عشق شک سے ہو کر سرخرو کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس نے چندو اور سوہنی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ ''ہم نے تجھے اللہ اور اللہ کے رسول کے حوالے کیا۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔'' اس نے روتی ہوئی آنکھوں سے گھونسلے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور ''اللہ حافظ'' کہتا ہوا گھونسلے سے باہر اُڑان بھری اور فضا میں پرواز کرنے لگا۔

☆=======☆=======☆

''آخر ایسی کون سی ہیری آ گئی ہے کہ اس کے کوٹھے پر تماش بینوں نے آنا چھوڑ دیا ہے۔'' گڈی بائی اس وقت اپنے چمچوں پر خفا ہو رہی تھی۔ ''ہمارے پاس ایک سے ایک بڑھ کر اعلیٰ نگینہ ہے...... کیا نہیں ہے جو اس کمینی حیاء کے پاس ہے۔'' اس کا غصہ عروج پر تھا۔ وہ اپنے بدمعاشوں اور غنڈوں کی فوج لے کر تیزی سے اپنے کوٹھے کی سیڑھیاں اتری اور حیاء کے کوٹھے کی طرف بڑھ گئی۔ بازارِ حُسن میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ آج پھر گڈی اور حیاء میں جوڑ پڑے گا۔

''باہر نکل رنڈی عورت!'' گڈی بائی نے ایک زوردار لات مار کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ حیاء ہاتھ میں جاء نماز پکڑ کر اسے بچھانے لگی تھی۔ مگر گڈی بائی کو دیکھ کر وہ خاموش کھڑی ہو گئی۔

گڈی بائی بولی! ''نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی!'' حیاء سمجھ گئی کہ گڈی غیر مسلم ہونے کی بنا پر اس کے عبادت کرنے پر طنز کر رہی ہے۔ حیاء مسلمان تھی جبکہ گڈی بائی اس نبی کی اُمتی تھی جنھوں نے روزِ محشر خود کو آقائے دو جہاں کا اُمتی بن کر اٹھنے کو ترجیح دی تھی اور رب کریم سے التجا کی تھی کہ وہ مجھے روزِ قیامت انبیاء میں سے اٹھانے کی بجائے اپنے محبوب کی اُمت میں سے جگائے۔

''میری نماز کا وقت ہو گیا ہے...... میں اس وقت کوئی بھی جھگڑا کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' حیاء نے جاء نماز بچھا دی تو گڈی کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی وہ بیخ پا ہو کر آگے بڑھی اور جوتوں سمیت جاء نماز پر چڑھ گئی۔ حیاء نے اب تک صبر کا دامن تھام رکھا تھا۔ اس کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔ مگر گڈی نے جاء نماز پر پاؤں رکھ کر اس کی برداشت کی حد ختم

کردی تو ایک زناٹے دار تھپڑ نے گڈی بائی کا منہ دوسری طرف گھما دیا۔ وہ جاء نماز سے اچھل کر دور قالین پر جا گری۔ وہ حیرت سے کبھی حیاء کو اور کبھی اپنے غنڈوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے اشارہ پر غنڈے آگے بڑھے اور حیاء کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ درد کی شدت سے کراہنے لگی۔ ''حرامزادی! اپنے آپ کو اپسرا سمجھنے لگی ہے۔'' گڈی بائی تھپڑ کھا کر سنبھل گئی تھی اس کی زبان ہذیان بکنے لگی تھی۔ اس کے غنڈوں نے حیاء کو مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اب وہ قالین پر بے سدھ پڑی تھی اور غنڈے گڈی بائی کے اشارے کے منتظر تھے۔ ''اس حرامزادی کو اٹھاؤ اور کوڑا دان میں پھینک آؤ...... ویسے بھی اب فجر کی بانگ ملنے والی ہے۔ جلدی کرو۔'' تمام بازار میں ہُو کا عالم تھا۔ جن لوگوں نے گڈی بائی کو غصہ میں جاتے دیکھا تھا وہ بھی روز روز کی کل کلیان سمجھ کر سو گئے تھے۔ ویسے بھی اب ''دھندہ'' بند ہو گیا تھا۔

غنڈوں نے حیاء کو اٹھایا اور باہر بازار میں کھڑی قیمتی گاڑی میں ڈال کر شہر سے باہر جانے والی سڑک پر گاڑی دوڑا دی۔ گڈی بھی ساتھ تھی۔ شہر سے باہر قدرے سنسان جگہ پر ایک کوڑا دان کے پاس حیاء کو پھینک دیا گیا۔

''یہی تمہاری اوقات ہے...... آج سے بیس بائیس سال پہلے ہی تمہیں یہاں آ جانا چاہیے تھا...... مگر تمہارا کمبخت باپ نہیں مانا تھا...... اب مرو حیاء بی بی۔ جتنی مرضی نمازیں پڑھو...... وہ اوپر بیٹھا ہے تمہاری نمازیں قبول کرنے والا ..... کہو اس سے آئے تمہاری مدد کو۔'' گڈی بائی سگریٹ کے کش لگاتی ہوئی بکواس کر رہی تھی مگر وحدہ لاشریک کی ذات مقدس کو چیلنج بھی کرتی جا رہی تھی۔ ''اسے یہیں رہنے دو اور گاڑی واپس موڑ لو...... اس کی لاش کو ابھی کتے اور بلیاں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔'' اس نے حیاء کو جان بوجھ کر لاش کہا تھا کیونکہ وہ سر میں لگنے والی پاؤں کی ٹھوکروں سے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکی تھی۔

گڈی بائی واپس چلی گئی تو فجر کی اذان کہیں دور سے سنائی دی۔ اس سرد رات کی تاریکی میں کتے بھی اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ حیاء کے بدن پر جو لباس تھا وہ رات بسر کرنے والا تھا۔ وہ تہجد کی نماز کی تیاری کر رہی تھی کہ گڈی بائی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ جس طرح سردی پڑ رہی تھی لگتا تھا کہ چند منٹ تک اگر اسے ہوش نہ آیا تو وہ سردی سے اکڑ کر مر جائے گی!

تقریباً پندرہ منٹ تک کوئی نہ آیا اور نہ ہی حیاء کو ہوش آیا۔ اس کا بدن ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جسم نے اکڑنا شروع کر دیا تھا۔ پھر ایک پچاس سالہ بوڑھا جو کاغذ وغیرہ اکٹھے کر کے اپنی گزر



بسر کرتا تھا وہ اپنے کام پر نکلا تو وہ تیز تیز چلتا ہوا کوڑے دان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ اگر وہ لیٹ ہو گیا تو ''مال'' کوئی اور لے جائے گا۔ مگر جب وہ کوڑا دان کے پاس پہنچا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے بائیس سالہ حسین دوشیزہ کو اندھیرا ہونے کے باوجود بھی پہچان لیا تھا۔ وہ حیاء کو جانتا تھا کیونکہ کام کے سلسلہ میں وہ سارا دن شہر بھر کی خاک چھانتا رہتا تھا۔

پہلے تو اسے لگا کہ کوئی اسے قتل کر کے پھینک گیا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگا تو ایک غیبی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ ''فضل محمد! کیوں انسانیت کی معراج سے گر رہے ہو؟'' وہ رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مگر کوئی بھی نظر نہ آیا تو وہ مزید خوفزدہ ہو گیا کیونکہ سنسان راستہ تھا اور اندھیرا بھی۔ ''اپنے اندر جھانکو...... اپنے ضمیر کی آواز سنو...... اس کی مدد کرو۔'' یہ آوازیں اس کے اندر سے ہی آ رہی تھیں۔ وہ بڑبڑایا۔

''اس کی مدد کروں...... اس کا مطلب ہے کہ یہ زندہ ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر حیاء کی نبض چیک کی تو وہ سردی کے باعث ڈوبنے کو ہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن سینے سے محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی آخری سانسیں چل رہی ہیں۔ فضل محمد کو ہوش آ گیا۔ اس نے کاغذوں والے بورے میں حیاء کو جیسے تیسے کر کے ڈالا اور اس کو بوری کی طرح ٹیڑھی میڑھی حیاء کو اٹھانے میں دشواری تو پیش آئی مگر وہ شہر جانے کی بجائے واپس ادھر ہی چل پڑا جدھر سے آیا تھا۔ وہ مشکل سے چل رہا تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ حیاء کو بچا لے گا۔ کیونکہ پلاسٹک کا بڑا سا بورا سردی کو اندر جانے سے روکنے میں معاون ثابت ہو رہا تھا۔ بے ہوش حیاء اس کی کمر پر لدی ہوئی تھی۔ کوئی آدھا کلومیٹر طے کر کے اس بوڑھے فضل محمد کا گھر آ گیا تھا۔ اس کی جھونپڑی تھی جسے وہ گھر کہتا تھا کیونکہ اس ''گھر'' میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ دو وقت کی سوہنی روٹی اسے مل رہی تھی۔ وہ اللہ توبہ کر لیتا تھا اور روٹی کھا کر شکر الٰہی میں مگن ہو جاتا تھا۔

اس نے پہلے سے جمع کیا ہوا ''مال'' اکٹھا کر کے ان کو آگ لگا دی۔ وہ حیاء کے جسم کو حدت پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے حیاء کو ابھی تھیلے سے نہ نکالا تھا۔ وہ مال کو آگ میں پھینکتا جاتا تھا اور آگ بھڑک بھڑک کر تیز ہو جاتی جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ حیاء ایک ناچنے والی ہے وہ اس گندرًا کو زندگی کیوں دینا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت اس پر انسانیت کی معراج کو بلند رکھنے کا جنون سوار تھ۔ آگ نے زور پکڑا تو اس نے دیکھا کہ بورے میں بھی ہلچل ہوئی ہے۔ وہ غور سے بورے کو دیکھنے لگا۔ آگ کی تیزی میں اس نے دیکھا کہ حیاء کا منہ بورے سے باہر آیا

ہے وہ جلتی ہوئی آگ کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور پھر جب اس نے ماحول پر نظریں دوڑائیں تو اس کی سٹی گم ہوگئی۔

''تمہیں ہوش آگیا ہے بیٹی؟'' فضل محمد کا مٹھاس بھرا لہجہ سن کر اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔''میں کون سی جگہ پر ہوں اور یہاں کیسے آئی بابا!'' وہ فضل محمد کے لہجہ سے بہت متاثر ہوئی تھی۔اب بھی وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

''میرا نام فضل محمد ہے اور میں گلی گلی کوچہ کوچہ گھوم پھر کر کاغذ اکٹھے کرتا ہوں...... اس کام کے لیے مجھے میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ میں شام کو تمام دن کا مال بیچ کر روٹی کھا لیتا ہوں......مگر کبھی بھیک نہیں مانگی......بس میں اپنا کام منہ اندھیرے یہاں سے آدھا میل دور ایک کوڑے دان سے شروع کرتا ہوں......آج بھی حسب معمول میں کام کے لیے نکلا تو وہاں پڑی ہوئی تم مجھے مل گئی......'' فضل محمد نے باقی کہانی اسے سنانا شروع کی تو وہ حیرت سے اس گندے تھیلے کو دیکھنے لگی جس میں وہ اب تک لیٹی ہوئی تھی۔ وہ کراہت سے باہر نکل آئی۔ فضل محمد ہنسنے لگا۔''بیٹی اس غریب کی کٹیا میں تمہارے شایانِ شان کوئی بستر نہیں ہے۔مگر میں چاہوں گا کہ تم صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے اپنے گھر چلی جاؤ۔''

''آپ مجھے جانتے ہیں؟'' حیاء کے سوال میں حیرت تھی۔''ہاں بیٹی! جانتا بھی ہوں اور پہچانتا بھی ہوں۔ میں نے کہا نا کہ میں کاروبار کے سلسلہ میں گلی گلی پھرتا ہوں۔'' حیاء کی آنکھیں شکرانے کے آنسو گرانے لگیں۔وہ روتی ہوئی بولی۔

''آپ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک طوائف ہوں...... میری جان بچائی...... کیوں؟ مجھے مرنے دیا ہوتا۔''

فضل محمد مسکراتا ہوا بولا۔''طوائف تو بعد میں بنی ہوگی۔ پہلے تو انسان ہونا۔ میں نے انسانیت کو شرمندہ ہونے سے بچانے کے لیے تمہیں موت کے منہ میں نہیں جانے دیا۔اگر ایسا ہوجاتا تو روزِ محشر میں سوہنے رب کو کیا منہ دکھاتا؟'' فضل محمد کی بات سن کر حیاء کی آنکھیں برسنے لگیں۔''بابا......! مجھے روشنی ہونے سے پہلے پہلے گھر تک چھوڑ آئیں۔آپ کی مہربانی ہوگی۔''

''چلو بیٹی!'' فضل محمد اس کے ساتھ اٹھ کر چلنے کو تیار ہوگیا۔اس نے ایک میلی سی چادر حیاء کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''اگر اس میں غربت اور افلاس کی بو نہ آئے تو اس سے اپنا جسم ڈھانپ لو تاکہ سردی سے بچ سکو۔'' حیاء نے وہ چادر پکڑ لی اور اپنے بدن کے گرد لپیٹ لی۔جھونپڑی سے باہر نکلے تو سویرا پھیلنے کے لیے اندھیرے کا سینہ چاک کر رہا تھا۔وہ تیز تیز



چلتے ہوئے کوڑا دان تک پہنچے تو فضل محمد اسے وہ جگہ بتانے لگا۔حیاء اس جگہ کو دیکھ کر کانپ کر رہ گئی۔

گڈی بائی نے اس پر کاری ضرب لگائی تھی۔وہ اس کا انتقام اس سے ضرور لے گی...... اس طرح کہ گڈی کی نسلیں بھی کانپ اٹھیں گی......انہیں چند سو میٹر چلنے کے بعد ٹیکسی مل گئی۔ فضل محمد نے اکیلی حیاء کو نہ جانے دیا وہ بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا بلکہ حیاء کی بھی خواہش تھی کہ فضل محمد اسے کوٹھے تک چھوڑ کر آئے۔

ٹیکسی والے کو گھر (کوٹھے) کے باہر پہنچ کر رکوایا اور حیاء جلدی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر گئی اور واپسی پر کرایہ لے کر آئی اس نے کرایہ ادا کر کے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور فضل محمد سے اوپر آنے کو کہا مگر وہ نہ مانا اور پھر کبھی آنے کا وعدہ کر کے آگے بڑھ گیا۔اس نے مڑ کر دیکھا تو حیاء اوپر چلی گئی تھی۔وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''اب ان کوٹھوں کی سیڑھیاں چڑھ کر لٹانے کے لیے فضل محمد سیٹھ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

☆=======☆=======☆

تیز آندھی نے شہر میں ہر چیز کو تہس نہس کر دیا تھا۔درخت جڑوں سے اکھڑ چکے تھے۔ بڑے بڑے سائن بورڈز اور ہورڈنگز لگانے والے مزدوروں کے دعوؤں کی نفی کرتے ہوئے زمین بوس ہوگئے تھے۔ بلکہ کئی بھاری بھرکم بورڈز تو اپنی جگہوں سے اڑ کر کئی انسانوں کی موت بن چکے تھے۔رہی سہی کسر موسلا دھار بارش نے نکال دی تھی۔یوں لگتا تھا کہ اس شہر پر قہر خداوندی آندھی اور طوفانوں کے ساتھ ساتھ بارش کی صورت میں نازل ہو رہا ہے۔مگر ان سب چیزوں سے بے نیاز وہ ننگے پاؤں پانی میں شڑاپ شڑاپ کی آوازیں نکالتا ہوا اپنے بدن اور سر پر موٹا اونی کمبل اوڑھے چلا آرہا تھا۔کاروبارِ زندگی مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

بازارِ حسن کی ویرانی اور سنسانی قابل دید تھی۔کسی بھی بالکنی میں کوئی بھی ''نگینہ'' نظر نہ آرہا تھا۔ چھاجوں برسنے والے مینہ نے تماش بینوں کو تو گھروں تک محدود کر ہی دیا تھا مگر اس طوفانی رات نے طوائفوں کا کلیجہ بھی دہلا دیا تھا۔وہ بھی گرم لحافوں میں لپٹی ہوئی اس طوفان کے تھمنے کا انتظار کر رہی تھیں تاکہ پُرسکون نیند کے مزے لے سکیں۔

وہ ہر قسم کی شدت اور موسم کی سختیوں کو جھیلتا ہوا حیاء کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دوسری طوائفوں کی طرح حیاء نے بھی ''دکان بند ہے'' کا بورڈ اس صورت میں لگایا ہوا تھا کہ کوٹھے کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔صرف ایک قیمتی فانوس کا مریل سا بلب جل رہا تھا۔

جس کی روشنی نے پورے ہال میں عجیب سا منظر پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہال کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے ان کے آگے دبیز اور قیمتی پردے لٹک رہے تھے جن کی بدولت آندھی اور بارش کا شور کم محسوس ہو رہا تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک حیاء کو سنائی نہ دی تھی۔ دوسری بار دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تو حیاء کو تعجب ہوا کہ اتنی تیز بارش اور طوفان میں کوئی غم کا مارا اس کی زلفوں کا سہارا ڈھونڈنے آیا ہوگا مگر گزشتہ آٹھ دن سے جو گڈی نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ اذیت اور دکھ جھیل رہی تھی۔ وہ اتنی طوفانی رات میں کوئی بھی ''کاروبار'' کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ تماش بین کو ٹرخا دے گی۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھی تو دروازے پر تیسری بار زور سے دستک ہوئی۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ اگر اب کی بار دروازہ نہ کھلا تو توڑ دیا جائے گا۔ حیاء ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں اتنی طوفانی رات میں پھر گڈی کے غنڈے آگئے تو وہ کیا کرے گی؟ وہ کمزور اور بے بس تھی وہ ان غنڈوں کا اکیلی مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

''کون ہے؟'' اس کا سوال اسے ہی بے معنی لگا۔ کیونکہ طوائف کے کوٹھے پر کون آسکتا ہے؟''

''صبور احمد!'' دوسری طرف سے اجنبی آواز سن کر وہ حیران رہ گئی کیونکہ وہ نام اور آواز اس نے پہلی بار ہی سنی تھی۔ کیا یہ کوئی نیا تماش بین ہے؟ مگر آواز بتا رہی تھی کہ مٹھاس اور شیرنی اس کے لہجے کی مقروض ہیں۔ وہ ہمت کر کے دوبارہ بولی۔ ''مگر...... کون...... صبور احمد؟''

''وہ صبور احمد...... جس کا تمہارے کاروبار سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ دروازہ کھولو۔'' دوسری جانب سے ہنوز لہجہ با ادب اور مٹھاس سے بھرا تھا۔ حیاء بہت متاثر ہوئی کیونکہ آج تک کسی بھی تماش بین نے اس پیار بھرے انداز میں اس سے بات نہ کی تھی۔ اس نے بے دھڑک ہو کر دروازہ کھول دیا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس کے سامنے کوئی پچاس سالہ شخص کھڑا تھا جس کے سر سے لے کر بدن کے نچلے حصے تک کمبل تھا وہ یکدم اندر آگیا۔ حیاء کو ایک طرف ہونا پڑا۔ وہ حیرانگی سے اس نو وارد کو دیکھ رہی تھی۔

''روشنی کم ہے۔'' صبور احمد کے کہتے ہی فانوس پوری طرح روشن ہو گیا۔ حیاء اب تو واقعی خوفزدہ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ اسے وہ کوئی جادوگر لگ رہا تھا کیونکہ اتنی تیز بارش میں وہ ننگے پاؤں پانی میں چلتا ہوا آ رہا تھا۔ بارش نے اس کے پورے وجود کو گیلا کیا ہوا ہونا چاہیے تھا مگر کمبل بالکل خشک تھا اور اس کے بدن سے بھی پانی کی کوئی بوند نہ ٹپک رہی تھی۔ حیاء نو وارد صبور احمد سے ڈر گئی۔



''کک...... ک...... کون ہو تم؟'' حیاء ہکلا گئی تھی اس کا انداز بالکل ایسا تھا کہ اس کے سامنے کوئی جن آگیا ہو۔

''صبور احمد!'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور ہال کا جائزہ لینے لگا۔ حیاء کو اس کا یہ انداز بالکل پسند نہ آیا تھا۔ وہ خود پر قابو پاتی ہوئی بولی۔ ''کون صبور احمد!'' اس کا اعتماد بڑھا تو مزید بولی۔ ''میں اس نام کے کسی بھی شخص کو نہیں جانتی۔'' اس کی اس نام سے لاعلمی حقیقی تھی کیونکہ وہ ہر تماش بین کو اس کے نام اور کام سے جانتی تھی۔ یہ پہلا شخص تھا جو ننگے پاؤں اس کے کوٹھے پر آیا تھا ورنہ آج تک لوگ ننگے پاؤں اس کوٹھے سے جاتے تھے۔

''تہجد کی نماز کیوں پڑھتی ہو...... حیاء؟'' صبور احمد کے منہ سے یہ راز سن کر وہ کانپ کر رہ گئی۔ کیونکہ یہ اس کا اور خدا کا راز دارانہ معاملہ تھا۔ وہ غور سے صبور احمد کی طرف دیکھنے لگی۔

''طوائف ہو یا عابدہ؟'' دوسرا سوال اس سے بھی بھاری تھا۔ وہ لرزتی ہوئی اتنا ہی کہہ پائی۔

''تم کون ہو؟ صبور احمد!'' یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی۔ ''یہ تو میرا زندگی کا سب سے قیمتی راز ہے...... تم اس سے کیسے واقف ہو؟'' وہ سنجیدہ ہوتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے افسوس ہے کہ تم اس بات سے بھی اندازہ نہیں لگا سکی کہ تیز اور آنکھوں کو اندھا کر دینے والی بارش نے میرے تمام جسم پر ایک بھی بوند نہیں گرائی۔'' یہ تو اس کی سچائی تھی۔ حیاء نے یہ بات ایک نظر میں ہی محسوس کر لی تھی۔ ''بہتر یہی ہے کہ میرے سوالوں کے جواب دو...... میں جلدی جلدی یہاں سے جانا چاہتا ہوں...... تہجد کی نماز کیوں پڑھتی ہو؟''

صبور احمد نے اپنا پہلا سوال دہرایا تو حیاء کو جواب دینا ہی پڑا۔ ''اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنے کا وہ سنہری موقع ہوتا ہے اور اس عظمت والے رب کا فرمان ہے کہ میں اس لمحہ مانگنے والے کو خالی نہیں لوٹاتا۔''

''کیا مانگتی ہو عظمت والے رب سے؟'' یہ دوسرا اور انوکھا سوال تھا۔

''یہ میں اور میرا خدا بہتر جانتا ہے......'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی تو صبور احمد مسکراتا ہوا بولا۔

''میں بتاؤں؟'' حیاء کو شرمندگی ہونے لگی۔ کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ صبور احمد پہنچی ہوئی ہستی ہے۔ بادل زور سے گرجا تو حیاء کی روح تک کانپ گئی اس نے خوفزدہ نظروں سے صبور احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے لب پھڑپھڑائے۔

''جو میں مانگتی ہوں...... تمہاری سوچ اور ذہنیت سے بہت بلند ہے۔'' اس نے پہلی بار

تلخ لہجہ اختیار کیا تھا۔ مگر صبور احمد ڈھیٹ لگتا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔ ’’عشق ...... مانگتی ہو...... حیاء؟‘‘ حیاء کی ٹانگیں لرز گئیں۔ وہ بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی تلاش کرنے لگی مگر قالین پر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ’’احمد سبحانی ...... ہمارا ہے...... تمہارا نہیں بن سکتا۔‘‘ وہ بھی اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ حیاء نے اس کی بات سن کر کرب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی تھی کیونکہ صبور احمد اس کے دل کی بات اپنے ہونٹوں سے ادا کر رہا تھا۔

’’تمہارا ہے......‘‘ وہ مریل سی آواز بولی۔ ’’کیا...... مطلب...... کہ وہ تمہارا ہے...... تم کون ہو اس کے؟‘‘ سوال دل سے نکلا تھا اور خون میں بھیگا ہوا بھی لگ رہا تھا کیونکہ اندر ہی اندر کوئی پرانا زخم کھل گیا تھا۔

’’میں کون ہوں؟ احمد سبحانی ہمارا کیوں ہے؟ تمہیں کیوں نہیں مل سکتا؟ گر وسجدے میں اور پوچھو اس عظمت والے خدا سے کہ تم جو کچھ مانگتی ہو...... تمہیں کیوں نہیں ملتا...... جبکہ اس کا تو وعدہ ہے کہ وہ تہجد کے وقت اپنے بندے کے انتہائی قریب ہوتا ہے اور اس کی ہر وہ آس مراد پوری کرتا ہے جو اس کے دل سے نکلتی ہے۔‘‘

ایک لحہ تو حیاء کو لگا کہ وہ شیطان ہے اور حیاء کو نماز تہجد سے روکنے کے لیے اپنا جال پھینک رہا ہے۔ حیاء نے بھی اس کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ ’’وہ تمہارے بھی کس کام آ سکتا ہے؟ وہ تو نشے اور شراب میں غرق رہتا ہے۔‘‘ اب بال صبور احمد کی کورٹ میں تھی۔ وہ حسب عادت مسکراتا ہوا بولا۔ ’’کسی چیز سے پیار اور لگن ہو جائے تو اس کے خراب ہونے پر اسے پھینکتے نہیں ہیں۔ بلکہ اسے اچھے سے اچھے کاریگر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔ روپیہ پیسہ کی پرواہ کیے بغیر اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیتے ہیں کہ اسے بالکل ٹھیک والی پوزیشن پر لے آتے ہیں۔‘‘ وہ مدلل گفتگو کر کے حیاء کو قائل کرنا چاہتا تھا۔ ’’تم اس شخص سے کیونکر پیار کرتی ہو جو تم سے پیار نہیں کرتا۔‘‘ حیاء نے تڑپ کر آنکھیں اوپر کیں اور رونے والے انداز میں بولی۔ ’’وہ میرا ہے...... میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اس سے عشق کرتی ہوں...... میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر اسے خدا سے مانگا ہے...... اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔‘‘ وہ حیاء کی بات سن کر پُرتحمل انداز میں بولا۔ ’’وہ بھی نہیں...... جس سے اس کو مانگتی ہو؟‘‘ وہ تڑپ گئی۔ اٹھ کر کھڑی ہونے لگی تو پاؤں نے ٹانگوں کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی اور آنسوؤں کو چھپائی ہوئی بولی۔

’’وہ تو صرف دیتا ہے...... چھینتا نہیں ہے...... میں تم انسانوں کی بات کر رہی



ہوں...... کائنات کی ہر ایک چیز سے ٹکرا جاؤں گی مگر...... احمد سبحانی...... میرا ہے۔‘‘

’’وہ تقدیریں بدل دیتا ہے۔‘‘ صبور احمد نے اس کی بات کا جواب دینا شروع کیا۔ ’’دعا کرنے والے کی دعائیں رَد نہیں کرتا...... مگر اپنے قانون اور فیصلے نہیں بدلتا...... جو چیز تمہارے مقدر میں نہیں لکھی...... وہ تمہیں نہیں مل سکتی اور جو تمہارے نصیب میں لکھی ہے اسے کوئی بھی نہیں چھین سکتا...... اس دنیا کا جابر حکمران بھی نہیں...... مگر یاد رکھو...... جو اس سے نہیں مانگتا...... وہ دَر دَر سے مانگتا ہے...... یاد رکھو حیاء بی بی...... احمد سبحانی...... اس کا ہے...... جس کی تم تہجد کے وقت پوجا کرتی ہو۔‘‘

’’ایک شرابی اس کا کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘ وہ اپنے حق میں ایک اور دلیل دیتی ہوئی بولی۔

’’جس طرح ایک طوائف اس کو سچے دل سے مانتے ہوئے سجدہ کرتی ہے اور اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ جو کچھ بھی دے گا۔ ’’اللہ‘‘ ہی دے گا...... بالکل اسی طرح اس شرابی کا بھی عقیدہ ہے کہ اللہ ہی عشق ہے...... دنیاوی عشق کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔‘‘ صبور احمد نے احمد سبحانی کے حق میں دلیل دی تو وہ بھوکی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی بولی۔ ’’میں ثابت کر سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے عشق کرتا ہے۔‘‘ وہ پھر تحمل سے بولا۔ ’’تم ہار جاؤ گی۔‘‘

’’اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا صبور احمد!‘‘ وہ پُرجوش انداز میں بولی تو وہ اٹھتا ہوا بولا۔

’’ٹھیک ہے...... میں پھر تب آؤں گا...... جب تم ہار چکی ہو گی۔‘‘ وہ باہر جانے لگا تو حیاء ہمت کر کے اس کے پیچھے گئی۔ ’’کہاں سے آئے تھے؟ کہاں رہتے ہو؟...... یہ بتا جاؤ...... تم کون ہو......؟ اپنا تعارف تو کروا جاؤ۔‘‘ وہ پیچھے مڑ کر حیاء کو دیکھتا ہوا بولا۔

’’کالج عشق دا میں ہاں پروفیسر
جے پڑھیا نہ بھلاواں تے عشق ای نئیں
جیہڑے سُنن تے ویکھن وچ نہ آون
جے اوہ نہ کم دکھاواں تے عشق ای نئیں
کدی آ جاواں میں موج اندر......
جے نہ دند کڈھواں تے عشق ای نئیں
یارِ غار دی اڈی اُتے میں
جے نہ ڈنگ مرواواں تے عشق ای نئیں

ایتھے شاہ عنایت جئے رائیں اُگے
جے نہ بلّھا نچاواں تے عشق ای نئیں
وچ کربل دی تپ دی ریت اُتے
جے نہ خیمے لگواواں تے عشق ای نئیں
سر چاہڑ حسین دا نیزے اُتے......
جے نہ قرآن سناواں تے عشق ای نئیں"

صبور احمد سیڑھیاں اتر کر اندھیرے کا حصہ بن گیا۔

☆=======☆=======☆

احمد سبحانی اس رات سے کافی پریشان تھا۔ وہ اس لمحہ کو نہیں بھول سکا تھا جب فقیر نما مخبوط الحواس شخص نے اسے کہا تھا کہ تم عین ہو...... وہ قاف ہے...... مگر شین کہاں ہے؟ اس کے بے ربط فقرے نہ سمجھ میں آنے والے الفاظ اور عجیب سے حلیے نے احمد سبحانی کو کافی پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے مسائل اپنے باپ کی دولت اور انکل محسن سیٹھ کے عہدہ کی بدولت چٹکیوں میں حل کیے تھے۔ مگر وہ ان بے ربط الفاظ کے بارے میں سوچتا تو وہ اور ذہنی طور پر الجھتا جاتا۔

ابھی بھی وہ لوگ سیٹھ محسن کے بیٹے جبران کی شادی سے واپس آ رہے تھے۔ سعید علی گاڑی کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ جبکہ فاطمہ اور احمد سبحانی پچھلی سیٹ پر اور زویا بیگم کو مائرہ نے زبردستی روک لیا تھا۔ گاڑی شہر سے باہر نکل کر کھلی اور مین سڑک پر دوڑنے لگی تو سعید علی نے پیچھے منہ کر کے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی کیسی رہی جبران کی شادی کی تقریب؟" ان کا مزاج خوشگوار تھا۔ فاطمہ نے شوخی سے چہکتے ہوئے جواب دیا۔ "پاپا! ہم بھی احمد سبحانی کی شادی ایسی ہی دھوم دھام سے کریں گے۔"

"اور تمہاری!" احمد سبحانی بھی فی البدیہہ بول پڑا تو سعید علی ہنسنے لگے۔

"میں پہلے سٹڈی مکمل کروں گی اس کے بعد انگلینڈ جاؤں گی اور پھر......" فاطمہ اس سے آگے نہ کہہ سکی۔

"بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟" احمد سبحانی کا فقرہ فاطمہ کو چڑا گیا۔

"تم بھی دیکھنا...... تمہارے لیے بھابی ایسی ڈھونڈوں گی جو تمہیں اپنے دوپٹے سے



باندھ کر رکھے۔"

"پاپا پلیز!" احمد سبحانی کی باری تھی اب چڑنے اور جواب دینے کی۔ "اب یہ مجھ سے پٹے گی۔" سعید علی نے سکرین کے پار سڑک پر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ہنس رہے تھے۔

"میری تو دعا ہے کہ تم دونوں بہن بھائی یونہی سدا مسکراتے رہو۔" ڈرائیور نے یکدم موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی کو بریک لگائے تو احمد سبحانی کی ناک بھوں چڑھ گئی۔ مگر وہ سعید علی کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے کچھ نہ بولا اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس کے لیے حیران کن منظر منتظر تھا۔ کیونکہ ان کی گاڑی کے آگے ایک مخبوط الحواس شخص کھڑا تھا جس کے منہ سے رالیں ٹپک رہی تھیں۔ احمد سبحانی نے اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ وہی شخص تھا جو اس رات اسے عشق کا عین کہتا تھا۔ وہ کچھ خوف محسوس کرنے لگا تو فاطمہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر اگلا منظر ان تینوں کے لیے ہی حیران کن تھا کیونکہ سعید علی گاڑی کا دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکلے اور اس شخص کے ہاتھوں کو بوسے دینے لگے۔

"آپ اس طرح اچانک؟" سعید علی کی عقیدت سے بھری آواز احمد سبحانی اور فاطمہ نے سنی تو حیران رہ گئے کیونکہ ایک مخبوط الحواس شخص کے ہاتھ اس شخص نے چومے تھے جو ان کا باپ تھا اور اس ملک کا نامور صنعت کار بھی۔ اس کے آگے پیچھے نوکروں کی فوج ظفر موج ہر حکم بجالانے کو بے تاب و بے قرار رہتی تھی۔

"یہ پاپا کیا کر رہے ہیں؟" احمد سبحانی کی خوف سے بھری ہوئی آواز نے فاطمہ کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ بھی نہ بول پائی۔ ان کے کانوں میں فقیر کی آواز گونجنے لگی۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے سعید علی! کہ ہم "اُس" کی نوکری کرتے ہیں۔" لفظ اُس پر اُس نے انگلی اٹھا کر آسمان کی جانب اشارہ کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ رب کائنات کی بات کر رہا ہے۔

"میں سمجھتا ہوں جناب!" سعید علی کا مؤدبانہ رویہ اور عقیدت بھرا انداز ان دونوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ "اگر آپ اس شہر میں آ ہی گئے ہیں تو مجھے شرف بخشیے کہ میں آپ کی مہمان نوازی کر سکوں۔" وہ شخص گاڑی کے اندر باریک نظروں سے جھانکتا ہوا بولا۔ "میں جس کی نوکری پر ہوں میرا رازق بھی وہی ہے اور میزبان بھی۔"

"آپ نے ایک بار پہلے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں گے۔

اب آ گئے ہیں تو گاڑی میں بیٹھیں اور گھر چلتے ہیں۔'' سعید علی کی لجاجت بڑھ گئی تو وہ شخص پھر بولا۔

''سعید علی! ہم نے اس وقت تم سے اور بھی کچھ کہا تھا...... یاد ہے کہ...... نہیں؟'' یہ بات سن کر نہ جانے کیوں سعید علی کے چہرے کی رنگت زرد ہو گئی۔ وہ شرمندگی سے بولے۔

''ہاں جناب! بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے...... اب تو آپ ہی نگاہ کیجیے...... میں تھک گیا ہوں۔'' اس شخص نے سعید علی کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''میں عشق کو اکٹھا کرنے نکلا ہوں...... افسوس کہ ''عین، شین، قاف'' بکھر گئے ہیں۔ جس دن ان کو اکٹھا کر لیا...... سمجھو...... تمہاری پریشانیاں ختم!'' وہ جانے لگا تو سعید علی نے آگے بڑھ کر اس کو روکنا چاہا مگر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ سعید علی اسے وہاں تک دیکھتا رہا جہاں تک اس کی نگاہ کام کرتی رہی۔

''یہ کون تھا پاپا؟'' فاطمہ اور احمد سبحانی کی زبان سے بیک وقت ہی نکلا تو سیٹ پر اچھی طرح بیٹھنے سے پہلے ہی اس متوقع سوال کا جواب دینے کے لیے سعید علی تیار تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور گاڑی گھر کی جانب جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

''یہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے۔'' سعید علی نے جواب دیا تو فاطمہ نے دوسرا سوال کر دیا۔

''مگر نیکی کی سند کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی نیک بندہ ہے؟'' احمد سبحانی نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ تو اس شخص سے خوفزدہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا حدود اربع واضح ہو جائے تاکہ اگر وہ دوبارہ اسے اکیلے میں ملے تو وہ خوفزدہ نہ ہو۔ ''آپ بتائیے نا پاپا!'' اس بار احمد سبحانی بولا تو سعید علی ٹھنڈی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ''میں اس شخص کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہیں۔ مجھے آج سے پچیس سال پہلے اس اللہ لوک سے حاکم نے ملوایا تھا۔''

''حاکم علی!'' دونوں یک زبان بولے تو سعید علی سر ہلا کر رہ گئے۔ اب احمد سبحانی اور فاطمہ کو اس بات کی جلدی تھی کہ گاڑی جلدی جلدی گھر پہنچے تاکہ وہ اس مخبوط الحواس شخص کا حدود اربعہ حاکم سے معلوم کر سکیں۔ احمد سبحانی کو اس کے ٹوٹے ہوئے الفاظ یاد آ رہے تھے کہ ''تم عین ہو...... وہ قاف ہے...... پھر شین کدھر گیا؟'' اس نے الفاظ کو کوئی اہمیت نہ دی تھی وہ اس شخص کو کوئی فقیر سمجھ کر بھول گیا تھا مگر آج جب وہ اس طرح اچانک ان کی گاڑی کے



سامنے آ گیا تھا اور پھر تعجب والی بات یہ تھی کہ سعید علی نے باہر نکل کر اس شخص سے انتہائی احترام اور مؤدبانہ لہجے میں گھر آنے کی درخواست کی تھی۔ احمد سبحانی کو یہ کوئی لمبا ہی چکر لگتا تھا۔

گاڑی محل نما گھر کا گیٹ کراس کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو سعید علی آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے جبکہ فاطمہ اور احمد سبحانی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور حاکم کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ دو تین منٹ بعد ہی حاکم علی کی آواز ''جی بیٹا جی'' سنائی دی وہ لان کی طرف چلتا ہوا آ رہا تھا گو کہ وہ اس گھر کا پرانا نمک خوار تھا مگر پھر بھی اس کا اندازِ گفتگو اور لب و لہجہ مؤدب ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ احمد سبحانی نے اوپر آسمان کی نظریں دوڑائیں تو مطلع صاف نظر آیا۔ وہ حاکم علی کو لیتا ہوا لان میں بنی چھتری اور سیمنٹ کی کرسیوں کی جانب بڑھ گیا۔

حاکم علی کے لیے احمد سبحانی اور فاطمہ کا اس طرح اس قدر سنجیدہ ہونا حیران کن تھا۔ وہ احمد سبحانی کی طبیعت سے واقف تھا۔ وہ جب بھی موڈ میں ہوتا تو اس سے ہنسی مذاق کر لیتا تھا۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور حاکم علی احترام سے کھڑا ہو گیا تو احمد سبحانی نے کہا کہ وہ بھی کرسی پر بیٹھ جائے وہ ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''مگر...... میں کیسے آپ کے برابر بیٹھ سکتا ہوں؟'' فاطمہ ایک ٹھنڈا سانس خارج کرتی ہوئی بولی۔

''حاکم علی! ہم تمہاری گود میں کھیلے ہیں۔ تم اس گھر کے فرد کی طرح ہو۔ یوں غیریت نہ برتو۔ بیٹھ جاؤ۔'' حاکم علی حاکم مرگ مفاجات کی مثال بن کر کرسی پر سکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ ان کرسیوں پر کئی بار بیٹھا ہوگا مگر اکیلا اور اب مالکوں کے ساتھ بیٹھ جانا اسے عجیب لگ رہا تھا۔ وہ احمد سبحانی کی طرف دیکھنے لگا اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ اس طرح سنجیدگی کا کیا مطلب لے۔ فاطمہ نے بھی بھائی کی طرف دیکھا وہ غالباً الفاظ جمع کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بات کو کیسے اور کہاں سے شروع کرے۔

''کچھ دنوں کی بات ہے کہ میں ایک دوست کے گھر سے آ رہا تھا۔'' احمد سبحانی نے بات کہنا شروع کی وہ فاطمہ کی موجودگی میں حیاء کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بات سنانے لگا تو فاطمہ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی کہ وہ ایک بار پہلے بھی اس مخبوط الحواس شخص سے مل چکا ہے۔ مگر ان دونوں نے غور کیا کہ حاکم علی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا ہے وہ خوفناک

نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔" حاکم علی! پاپا کا اس شخص کو اس قدر احترام دینا اور گھر آنے کی دعوت دینا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔" فاطمہ نے احمد سبحانی کی بات مکمل ہونے پر اپنا خیال ظاہر کیا۔

"مم...... مگر...... میں اس شخص کے بارے میں آپ کو کیا بتا سکتا ہوں؟" احمد سبحانی نے حاکم علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "اگر تم اس شخص کے متعلق جانتے ہو تو ہمیں بتانے سے گریزاں کیوں ہو۔" فاطمہ بھی تائیدی انداز میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔ "کیا تمہارا کوئی نقصان ہو جائے گا۔"

"نہیں...... نہیں...... میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" احمد سبحانی نے اسے پکڑ کر بٹھا لیا وہ خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "نقصان تمہارا ہوگا احمد سبحانی!" دونوں بہن بھائی کے منہ کھلے کے کھلا رہ گئے۔ احمد سبحانی مسکراتا ہوا بولا۔ "حاکم چاچا! مجھے معلوم ہے کہ آپ مذاق اچھا کر لیتے ہو...... مگر مجھے خوفزدہ نہ کریں۔" فاطمہ نے بھی لقمہ دیا۔ "آپ جانتے ہی ہیں احمد سبحانی کتنا بہادر ہے۔" حاکم علی کے لبوں پر ان بچوں کی باتیں سن کر مسکان کی پتلی سی لکیر بن گئی۔ وہ گویا ہوا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ جس طرح ہم لوگ بڑے صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر احترام سے کھڑے ہوتے ہیں۔ صاحب بھی ویسے ہی ان کے سامنے کھڑے تھے۔"

"ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہم کوئی جھوٹ نہیں بول رہے۔" احمد سبحانی کو اس کا متجسس انداز کھٹک رہا تھا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پاپا نے اس شخص کو اتنا احترام اور مقام کیوں دیا؟"

"وہ سیّد زادہ ہے۔" حاکم علی کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر قمیص کے کالر میں جذب ہو گئے۔ دونوں بچے سمجھ دار تھے جان گئے کہ حاکم علی نے کیا کہا ہے۔ حاکم علی روئی ہوئی آنکھوں سے ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "یہ لوگ آلِ رسول ﷺ میں سے ہیں۔ اس گھرانے کی عظمت و رفعت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب مسلمان نماز میں درود شریف پڑھتا ہے۔ تو محمد ﷺ کی آل کے لیے بھی لازمی دعا کرتا ہے۔" حاکم علی بھی چاہتا تھا کہ احمد سبحانی شراب اور شباب چھوڑ کر دین کی راہ پر چلنے لگے مگر یہ تبھی ممکن تھا جب وہ خود گناہ آلودہ زندگی سے نفرت کرتا۔ اب موقع اچھا تھا۔ حاکم علی اسے دین کی راہ پر چلانے کے لیے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔



"پروردگار خود اس گھرانہ اور گھرانہ کے ہر فرد سے محبت کرتا ہے تبھی تو نماز میں اور ہر درود شریف میں آلِ محمد ﷺ کا ذکر اور تذکرہ ملتا ہے۔ اس گھرانے کی شان میں شاعر اپنا اپنا کلام تحفتہً اور ہدیتہً پیش کرتے ہیں اور تا قیامت کرتے رہیں گے۔ اس مخبوط الحواس شخص کا تعلق بھی اس عظمت والے سادات گھرانے سے ہے تبھی تو بڑے صاحب ان سے احترام سے ملے ہیں...... یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام کی خاطر اپنے سر کٹوا دیئے۔ ہم سب کو پہچان اور دین اسلام کی سمجھ اس عظیم گھرانے کی بدولت ہی ملی ہے۔ ہمیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور بخشش کے عظیم تحفے اسی گھر کی بدولت ملے ہیں۔" حاکم علی سانس لینے کے لیے خاموش ہوا تو احمد سبحانی نے اپنا سوال دہرایا۔ "مگر وہ تو پاپا سے کہہ رہے تھے کہ عشق بکھر گیا ہے۔ وہ عشق کو اکٹھا کرنے آئے ہیں اور مجھے تو پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ تم عشق کا عین ہو...... حاکم علی! خدارا ہمیں کھل کر بتاؤ۔"

"میں تو نکما اور ادنیٰ سا غلام ہوں۔" حاکم علی عاجزی سے بولا۔ اس کی آواز میں افسردگی ظاہر ہو رہی تھی۔ "اس گھرانے کا تو بڑے بڑے تاجدار پانی بھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عشق ہی عشق ہے لیکن یہ گھرانہ عشق کی ابتدا ہے۔ جس طرح مختلف جڑی بوٹیاں اکٹھی کر کے ان کو پانی میں ابال کر جب نچوڑا جاتا ہے تو ان کا جوشاندہ بن جاتا ہے۔ جڑی بوٹیوں کے نچوڑ کو جوشاندہ کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کے عشق کا جوشاندہ یہ مقدس گھرانہ ہے۔ جڑی بوٹیوں کا جوشاندہ پی لینے سے دل و دماغ کو سکون ملتا ہے۔ مگر اس گھرانے کے عشق کا جوشاندہ پی لینے سے ایمان کو تقویت ملتی ہے اور رب واحد کی ذات پر اتقاء مضبوط ہوتا ہے۔ اسلام کی عظمت اور سربلندی بھی تو اسی گھرانے کی بدولت قائم ہے۔ اگر یہ عشق کا نچوڑ یعنی سادات گھرانہ نہ ہوتا تو نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد ہم تک جو اسلام پہنچا وہ شاید اس طرح مکمل نہ ہوتا یا پھر اس کا یہ حلیہ نہ ہوتا۔ کیونکہ آپ ﷺ کے بعد کوئی بھی نبی نہیں آنا...... اور نہ ہی آئے گا۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ گھرانہ اور اللہ کے کامل ولی جو دین اسلام کی اشاعت کے لیے راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت الٰہی میں مصروف ہوتے ہیں اللہ جن کی باتیں نہیں ٹالتا ان کی بدولت ہی مکمل دین اسلام اپنی صحیح حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔" حاکم علی نے ان کے ذہنوں کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ وہ اس کی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ انہیں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

"مگر انہوں نے مجھے کیوں کہا کہ تم عین ہو...... وہ قاف ہے۔ شین کو ڈھونڈنا پڑے

گا؟'' احمد سبحانی کا لہجہ اس شخص کے لیے مؤدبانہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ سادات کی حیثیت اور اہمیت کو جانتے تھے۔

''اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر بندے کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کون سا کام کس وقت کرے۔'' حاکم علی احمد سبحانی کے سوال کا جواب دینے لگا۔ ''مگر جب گردش دوراں اور حالات انسان کو رب واحد کی تفویض کردہ ڈیوٹیوں سے بھٹکا دیتے ہیں تو پھر انسان کے روپ میں وہ اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے کہ وہ اس انسان کو اس کی ڈیوٹی یاد دلائے۔'' حاکم علی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر بولا۔

''آج کا انسان حرص و لالچ اور ہوس زر میں رب کے احکامات بھول گیا ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا ہے کہ اللہ کی ذات مقدس عشق ہے مگر عشق تین حرفی لفظ ہے۔ کوئی بھی حرف آگے پیچھے ہو جائے تو وہ بہت کچھ بن سکتا ہے مگر عشق نہیں بن سکتا اور جب رب کائنات کی ذات کو مکمل طور پر نہ سمجھا جائے گا تب تک تو میں غرق ہوتی رہیں گی مگر میں سمجھتا ہوں کہ تم خوش قسمت ہو جو تمہیں اس نے عشق کا عین کہا ہے۔ کیونکہ تمہیں رب تعالیٰ نے کسی نیک کام کے لیے چن لیا ہے اور تمہیں درجہ عشق کی ابتدا کا ملا ہے۔ باقی شین اور قاف کون ہیں کہاں ہیں یہ اس شخص کا کام ہے کہ وہ ان کو اکٹھا کرے۔''

''مگر درجات بانٹنے والا وہ کون ہے؟'' احمد سبحانی کے منہ سے نکلا۔ حاکم علی غور سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''وہ اللہ کا ولی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو یہ اختیارات دیے ہوئے ہیں کہ وہ اللہ کے خزانوں سے جو کچھ بانٹنا چاہیں اللہ کی مرضی اور رضا سے بانٹ سکتے ہیں اور پھر یہ تو وہ گھرانہ ہے جس سے تقدس اور عزت و احترام کو مقام ملا ہے کیونکہ سادات کے گھرانے سے سورج چاند بھی پوچھ کر گزرتے ہیں کہ کہیں کوئی پاک بی بی اپنے گھر میں ننگے سر تو نہیں کہیں سورج چاند کی نظر ان پر پڑ جائے...... عشق کے درجات بانٹنا اس کی ڈیوٹی میں شامل ہوگا۔ مگر پہلے وہ عشق کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے گا پھر درجات تقسیم کرے گا۔ پھر تمہاری ڈیوٹیاں لگیں گی۔ اگر تم عشق کے درجات کو اپنی اپنی بساط کے مطابق سرخرو سکے تو کامیاب ورنہ......؟''

''ورنہ کیا؟'' احمد سبحانی اور فاطمہ بیک وقت یک زبان ہو کر بولے تو حاکم علی دو گھورنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ محل کی پُرشکوہ عمارت کو گھور رہا ہے۔ ''دل و جان کو لرزا دینے والا خراج بھی ادا کرو گے تو عشق سرخرو نہیں ہوگا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے مفکر



بادشاہ وقت ان کی چوکھٹ سے خیرات لے کر اپنی رعایا میں تقسیم کیا کرتے تھے اس گھرانے کے چشم و چراغوں نے کبھی بھی بادشاہت کو ترجیح نہیں دی بس فقیری میں ہی زندگی گزار دی۔ کیونکہ وہ اپنے لیے کبھی بھی کچھ نہیں مانگتے وہ جس حال میں ہوں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ کبھی بھی شاہانہ لباس نہیں پہنتے پیٹ بھر کر کبھی کھانا نہیں کھاتے۔ کبھی بھی کسی کی دل آزاری نہیں کی اور نہ ہی کبھی کسی سائل کو خالی لوٹایا۔ ان کی ظاہری حالت پر نہ جاؤ۔ ان کی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو...... یہ وقت ہوتے ہیں۔

نہ کسی کے رقص پہ طنز ...... نہ کسی کے غم کا مذاق اُڑا

جسے چاہے جیسے نواز دے...... یہ درِ حبیبؐ کی بات ہے

حاکم علی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا تو ان کی محویت ٹوٹی۔ وہ آج تک ان باتوں سے نابلد تھے اور اسلام سے اتنے ہی دور تھے جتنی کم ان کی ناقص معلومات تھیں۔

''ان کی ایک ایک ادا سے احکاماتِ ربی کی بدولت عشقِ الٰہی جھلکتا ہے۔ یہ لوگ اصل میں عشق کی ابتدا ہیں، عشق نے ان کے عظیم گھرانے سے بہت تاوان وصول کیا ہے جسے بعد میں خراج کی صورت عقیدت و احترام اور عظمت بخشی ہے کیونکہ خود عشق ان گھرانوں کا عاشق ہے۔ احمد بیٹا! اگر کچھ اس گھرانے کی بدولت ملتا ہے تو لے لو...... اپنی زندگی اس گھرانے کے لیے وقف کر دو۔ ان شاءاللہ وہ کچھ ملے گا جس کی تمنا تم نے کبھی خواب میں بھی نہ کی ہوگی۔''

حاکم علی نے آخری الفاظ خالصتاً احمد سبحانی سے کہے تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''بھلا مجھے اس گھرانے سے کیا لینا ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے میرے پاس۔'' وہ ان الفاظ کو زبان سے ادا نہ کر سکا۔ اس کی بے قراری اور بے چینی بڑھ گئی تھی۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ حاکم علی اٹھ کر جا چکا تھا مگر احمد سبحانی کی سوچوں کا محور وہ شخص تھا جو سیّد زادہ تھا۔ آلِ رسولؐ تھا۔ وہ اس سے پہلے دن ہی خوف کھا گیا تھا۔ وہ اس کو محض ایک فقیر سمجھا تھا۔ مگر اب اس پر یہ راز کھلا تھا کہ دنیا بھر کی دولت ان کی چوکھٹ کی باندی ہے۔ دنیا کے خزانے ان کے قدموں کی دھول ہیں۔ مگر اس شخص کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اس نے دونوں ہی ملاقاتوں میں انتہائی سادہ اور بوسیدہ سا لباس پہن رکھا تھا اور پاؤں سے بھی ننگا تھا۔ اس نے یک دم چونک کر فاطمہ کی طرف دیکھا جس نے اسے پکارا تھا۔

''احمد بھائی! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ پاپا نے کہا تھا کہ حاکم علی نے انہیں اس شہر سے پچیس سال قبل ملوایا تھا۔ وہ کس لیے؟ اور پھر اس شخص کا نام کیا ہے؟ وہ کہاں رہتا

ہے؟ حاکم علی کو اس کے متعلق کتنی معلومات ہے یہ اس نے کہاں سے لی ہیں؟'' فاطمہ ایک ہی سانس میں سارے سوال کر گئی۔ اس کی بات میں وزن محسوس کرتے ہوئے اس نے حاکم علی کو آواز دینا چاہی تو وہ ان کے لیے چائے لے کر ہی آ رہا تھا۔

''حاکم علی!'' اس کے پاس پہنچتے ہی احمد سبحانی نے سوال داغ دیا۔ ''تم نے پہلی بار اس شخص سے پاپا کو کیوں ملوایا تھا؟'' حاکم علی یہ سوال سن کر پریشان ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان بچوں کا ذہن بٹ جائے مگر وہ آج بہت بڑے کھوج میں نکلے ہوئے لگتے تھے۔ ''بتاؤ نا حاکم علی!'' فاطمہ کے متوجہ کرنے پر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''بڑے صاحب اور بی بی جی کی خواہش تھی کہ اللہ انہیں پہلی اولاد بیٹا ہی دے۔ میں اس شخص کو جانتا تھا میں نے اس سے بات کی تو اس نے صاحب جی سے ملنے کی خواہش کی اور صاحب میری درخواست پر اس کے پاس گئے اور تمہاری پیدائش کے لیے دعا کروائی۔'' احمد سبحانی اور فاطمہ غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔

''مگر اتنا سب کچھ اس شخص کے بارے میں تم کیسے جانتے ہو؟'' فاطمہ نے اپنا سوال سنبھال رکھا تھا۔ اس نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ ''اور اس کا نام کیا ہے؟''

فاطمہ کے اس سوال پر حاکم علی کچھ ٹھٹک گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا وہ ان بچوں کو ٹرخانے والے انداز میں بولا۔ ''ان کے کئی نام ہوتے ہیں۔ عہدوں کے لحاظ سے کبھی فقیر، درویش سائیں لوک، مست، وغیرہ وغیرہ۔'' مگر اس نے دیکھا کہ احمد سبحانی اور فاطمہ دونوں ہی غیر مطمئن دکھائی دیے۔ ''جس طرح پاپا صنعت کار ہیں۔ میں آوارہ ہوں۔ تم ملازمت کرتے ہو۔ ان سب عہدوں کے باوجود ہم سب کے نام تو ہیں نا۔ جیسے سعید علی، احمد سبحانی، حاکم علی وغیرہ وغیرہ۔'' احمد سبحانی کو محض وہ شرابی ہی سمجھتا رہا تھا مگر وہ آج نہ جانے کیوں دور کی کوڑیاں لا رہا تھا۔ ''بتاؤ نا حاکم علی!'' فاطمہ نے ٹکڑا لگایا تو وہ مجبوری والے انداز میں بولا۔ ''اس کا نام صبور احمد ہے'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا تو فاطمہ کے ترکش سے ایک اور سوال تیر بن کر نکلا جو حاکم علی کی رازدارانہ زندگی کو تہس نہس کر گیا۔

''اس کے بارے میں تم اس قدر کیسے جانتے ہو؟'' حاکم علی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا ہو۔ ''سچ بتانا حاکم علی...... ہم نے تمہاری گود میں کھیلا ہے۔ تمہارے چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ تم اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے۔'' احمد سبحانی کی بات پر وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا اور احمد سبحانی اس کی آنکھوں میں



آنے والے آنسوؤں کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

''وہ...... وہ......'' حاکم علی کے لب پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ اس کا انداز ان دونوں کے لیے حیران کن تھا۔

''وہ میرا بیٹا ہے۔'' اس آخری دھماکے نے دونوں بہن بھائیوں کے ہاتھ سے چائے کے کپ چھڑوا دیئے تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور حاکم علی کو حیران کن نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کی طرف کبھی حاکم علی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حاکم علی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان آنسوؤں کی کیا وجہ تھی۔ وہ اس وجہ کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

☆=======☆=======☆

منو کی آنکھوں کے سامنے بہت بڑا جہان تھا وہ اس شہر اور ماحول کی تنگیوں اور سختیوں سے دور شہرِ امن کی جانب پرواز کرنا چاہتا تھا وہ پُر امن شہر کی جانب جانا چاہتا تھا۔ وہ شہر محمد کا مسافر بننا چاہتا تھا۔ وہ مہمان مدینہ بن کر اپنے عشق پر لگا دھبہ دھونا چاہتا تھا۔ مگر اس کے پاس تو نہ پاسپورٹ تھا اور نہ ہی ٹکٹ تھا۔ وہ کیونکر شہر محمد ﷺ کی جانب پرواز کر سکتا تھا۔ وہ اپنے کمزور اور ناتواں پروں کو نہ ہونے کے برابر محسوس کر رہا تھا۔ مگر جو عشق تھا وہ ''ڈاہڈا'' تھا۔

شہر محمد ﷺ کا مسافر بننے کے لیے کچھ قانونی تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔ جن کو پورا کیے بغیر نہ ہی ٹکٹ ملتا ہے اور نہ ہی پاسپورٹ پر مہر لگتی ہے۔ وہ پرواز کرتا ہوا بابا سیّد لسوڑی شاہ سرکار کے دربار کے احاطہ میں اتر گیا۔ صحن میں بکھرے ہوئے دانہ میں سے کوئی بھی دانہ چگنے سے پہلے اس نے محبت اور عقیدت کو جمع تفریق کر کے خلوص سے ضرب دی اور عشق پر تقسیم کیا تو عبادت گزاری والا اسلام پیش کیا۔ دھوپ نے ہر چیز کو نکھار بخش دیا تھا۔ اس نے بابا جی کے قدموں میں بیٹھ کر آتے جاتے مریدین کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کے مراقبہ کی کیفیت میں مبتلا کر لیا۔

کئی عقیدت بھری گھڑیاں یونہی گزر گئیں تو اس نے الوداعی سلام لینے کے لیے آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک حیران شخص کو دیکھ کر خود بھی حیران ہو گیا۔ ''تو تم ہو...... شین؟'' اس نے واضح طور پر اس مردِ کامل کی سرگوشی محسوس کی۔ منو نے حیرت سے اپنے آگے پیچھے دیکھا کہ شاید وہ انسان کسی انسان سے مخاطب ہے۔ مگر اب تو وہ مزید حیران رہ گیا جب اس انسان نے اسے ہی براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے پکارا۔

''پیارے کبوتر! میں تم سے ہی مخاطب ہوں۔'' لوگ اس انسان کو مخبوط الحواس سمجھ کر

اس کے پاس سے گزر رہے تھے وہ دربار کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ''آپ کون ہیں؟'' منو نے اپنی معصوم زبان سے پہلا سوال کیا۔

''میں صبور احمد ہوں۔'' اس انسان کی آواز منو کی نازک اور معصوم سماعت سے ٹکرائی۔

''کون صبور احمد؟'' منو اس بات پر بھی حیران تھا کہ اس کی بولی اور زبان سمجھنے والا کوئی عام انسان نہیں ہو سکتا۔ ''سادات گھرانے کا ادنیٰ سا چشم و چراغ اور رب کائنات کا ادنیٰ بندہ۔'' منو کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ایک سیّد زادے سے محو کلام تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں، دھڑکنیں ''اللہ ھو۔ اللہ ھو'' کا ورد پکارنے لگیں۔ وہ اپنی گول آنکھوں کو اٹھا نہ پایا تھا کہ صبور احمد کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''منو!'' منو نے مختصر سا جواب دیا۔ تو صبور احمد پھر بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے شام کو میرے غریب خانہ پر آ جانا۔'' منو نے پہلی بار آنکھیں اٹھا کر استفسار سے دیکھا تو صبور احمد اس کی مجبوری سمجھتا ہوا بولا۔ ''جہاں نئی سڑک ختم ہو کر کچی سڑک شروع ہوتی ہے۔ بڑے سے پیپل کے دائیں ہاتھ تمہیں میری کٹیا نما حویلی نظر آ جائے گی۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ منو حیرانگی سے اس کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ اس کی آخری بات پر غور کرنے لگا کہ کٹیا نما حویلی؟

اسے معلوم نہ تھا کہ تقدیر اس پر اس طرح مہربان ہو جائے گی کہ وہ سیّد زادے سے ملاقات کا شرف حاصل کر لے گا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں ہونے لگا۔ اس نے شکرانے کے طور پر اپنی گردن اللہ کے حضور جھکا دی۔ وہ آنسوؤں سے وضو کرتا ہوا وہاں سے اُڑان بھر کر ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اسے پہلی ہی نظر میں عجیب لگا تھا کہ کوئی انسان اس سے مخاطب ہو اور وہ اس کی زبان سمجھ سکے۔ مگر صبور احمد سادات گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ وہ کل کائنات کے مالک رب تعالیٰ کے پیارے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی آل میں سے تھا۔ مگر اس نے منو کو دیکھتے ہی یہ کیوں کہا کہ ''تم ہو شین؟'' اس نے پوچھا تھا یا بتایا تھا منو اس کے لہجہ پر غور کرنے لگا تھا۔

صبور احمد نے جس جگہ کا اسے پتہ بتایا تھا وہ جگہ منو کی دیکھی بھالی تھی۔ مگر صبور احمد تو کہہ رہا تھا کہ اس کی کٹیا نما حویلی ہے جبکہ منو کے مطابق وہ حویلی کافی بڑی تھی۔ منو کو اب شام ہونے کا انتظار تھا وہ اُڑ کر مزار کے احاطہ سے باہر آ گیا جہاں پر اندر سے، جلیبیاں، پتاشے،



بدانہ اور دیگر دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ دکاندار گاہکوں کو اپنی دکان کی جانب متوجہ کرنے کے لیے طرح طرح کے ''آوازیں'' لگا رہے تھے۔ کسی دکاندار نے ڈیک کی آواز اونچی کر دی تو منو کے کانوں میں ملک کے نامور نعت خواں کی صدا گونجنے لگی۔

''ڈاہڈا ھاں غریب آقا ﷺ کول میرے زر نئیں
اُڈھ کے میں کیویں آواں نال میرے پَر نئیں
تساں تے ہے ڈیرہ میتھوں بڑی دور لا لیا
سَدھ لو مدینے آقا ﷺ کرو مہربانیاں!

ڈیک والے نے کسی گاہک کو وہ کیسٹ چیک کر کے دے دی مگر منو کی محویت ٹوٹ گئی۔ وہ پر ہونے کے باوجود بھی خود کو بے پر اور بے زر پرندہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنی بے بسی و بے کسی پر آنسو بہانے لگا۔ اب وہ اپنے ''گھر'' سے نکل آیا تھا۔ اس کا شریکا شکر منا رہا ہوگا۔ پیاری ماں رو رہی ہوگی۔ باپ اور چاندنی بھی غمگین اور اداس ہوں گے۔ مگر میں واپس نہیں جاؤں گا...... میں پُرامن شہر کا مسافر بن کر رہوں گا۔

منو نے جی کڑا کر کے وہاں سے اُڑان بھری اور شہر کا چکر لگانے کے لیے تھوڑا سا بلند فضا میں چلا گیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ فضا باز کی پرواز سے پاک ہے۔ ویسے بھی یہ شہر کا علاقہ تھا۔ جہاں کبوتروں اور چڑیوں کا راج ہوتا تھا۔ باز کے حملے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ اس نے شام تک سارے شہر کا چکر لگا لیا تو اس کی پرواز اب صبور احمد کی کٹیا نما حویلی کی جانب تھی۔ وہ با آسانی اس حویلی تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ حویلی کچی مٹی اور گارے سے اینٹیں جوڑ کر بنائی گئی ہے یہ یقیناً پاکستان بننے سے پہلے کی ہوگی کیونکہ اب تو انجینئر جو ''فولاد'' بلڈنگوں کی تعمیر میں استعمال کرتے ہیں وہ بلڈنگ کے افتتاح سے پہلے ہی پگھل جاتا ہے اور اربوں روپے کے پل اور عمارتیں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ کسی کاریگر کے ہاتھوں کا منہ بولتا ثبوت تھی اور ہنوز قائم دائم تھی۔

وہ ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ وہ صبور احمد کے تعارف کروانے پر جان گیا تھا کہ وہ اس وقت کس جگہ پر ہے کیونکہ اس گھرانے کی عظمت و پاکیزگی کا وہ تہہ دل سے قائل تھا اور اس لمحہ وہ خود کو خوش قسمت تصور کر رہا تھا کہ وہ سادات گھرانے کی منڈیر پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ جس پُرامن شہر کی جانب اور جس عظیم ترین ہستی کا عاشق بن کر نکلا تھا یہ گھرانہ آپ ﷺ کی آل کا تھا۔ منو اس وقت اپنے آپ پر رشک کر رہا تھا وہ اپنے خاندان اور شریکے پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا

تھا کہ عشق کا شین شہادت سے ہی سرخرو ہوتا ہے اور میں اس بات کی شہادت بنوں گا کہ میرا عشق شک سے پاک ہے۔

میں اس بات کی گواہی دوں گا کہ میرا عشق ہر قسم کی فضولیات اور لغو چیزوں سے پاک ہے۔عشق کیا ہے۔اس کی گہرائی، لمبائی، چوڑائی اور طول وعرض ماپنے کے لیے ایک پیمانہ ہوتا ہے اور وہ پیمانہ ''دل'' ہوتا ہے جس میں ہر قسم کے آلات ہوتے ہیں وہ عاشق کا مزاج اور انداز دیکھنے کے ساتھ ساتھ نیت بھی دیکھتے ہیں اور پھر عشق کی گہرائی کو ماپنا شروع کر دیتے ہیں اور وہ دل میرے پاس ہے۔میرے پاس ہے......

منو خود ہی بڑبڑا رہا تھا کہ ایک بلا عشق امتحان لینے کے لیے پہنچ گیا۔وہ اپنے سامنے ایک موٹے تازے خونخوار بلے کو دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ہونٹوں پر تازہ خون کی سرخی جمی ہوئی تھی۔وہ اپنی پیلی پیلی اور خونخوار آنکھوں سے منو کو گھور رہا تھا۔وہ منو کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔

''کئی دنوں سے لذیذ گوشت نہیں ملا۔'' بلے کی کرخت آواز نے منو کی جان لرزا دی تھی۔وہ اُڑ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ کالے بلے نے اس پر چھلانگ لگانے کے لیے انگڑائی بھر لی تھی اگر منو اُڑان بھرنے کے لیے ذرہ برابر بھی حرکت کرتا تو وہ اس پر جھپٹ پڑتا اور منٹوں میں منو کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا۔منو اپنی بساط کے مطابق مریل سی آواز میں بڑی ہمت سے بولا۔

''مم......مم......میں شاہ جی کا مہمان ہوں۔'' اس کی بات سن کر بلے کا قہقہہ گونجا تو منو کا دل اور بھی دہل گیا۔''مہمان؟'' وہ طنز سے بولا۔''شاہ جی......کون شاہ جی اوئے......وہ جو خود مست ہے۔جسے اپنا ہی کوئی ہوش نہیں......جسے یہ بھی نہیں پتہ کہ اپنے تن اور مَن کو کیسے پاکیزہ کیا جاتا ہے؟ اس شاہ جی کے مہمان ہو تم؟''

''تمہیں پتہ ہے کہ مست کیا ہوتا ہے؟'' بلے کی طرف سے گفتگو بڑھتے ہوئے منو نے بات آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ دو قدم پیچھے ہٹنا بھی مناسب سمجھا۔وہ اپنے آپ کو اس خونخوار اور بدتمیز بلے سے دور کر لینا چاہتا تھا۔وہ اس کی چھلانگ سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے ذہن کے تمام خانے کھول کر اس سے ہر قسم کی گفتگو پر تیار ہو گیا تھا۔بلے نے ایک اور قہقہہ لگایا اور بولا۔

''یہ سب انسانوں کا ڈھکوسلہ ہے۔مست وست کچھ نہیں ہوتا۔یہ سب انسانوں کو دھوکا دینے کے لیے بہروپ بدلتے ہیں۔'' وہ بھی بڑا کایاں لگتا تھا وہ بھی دو قدم آگے بڑھ آیا۔



''مگر تم تو انسان نہیں ہو؟ تم اس کے دھوکے میں کیسے آ گئے؟ جاؤ تمہاری زندگی معاف کر دوں گا۔ابھی یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' وہ غرایا تو منو کو اس سے مزید خوف محسوس ہونے لگا مگر وہ ابھی اُڑان بھرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔وہ پھر ہکلاتا ہوا بولا۔

''مم......میں......شاہ جی سے عشق کے بارے میں......مم......معلومات لینے آیا تھا۔''

مگر اس بار کالے بلے نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔''بکواس مت کرو......انسانوں کے کام انسانوں کو ہی اچھے لگتے ہیں......عشق......ہونہہ......کس سے عشق کرتے ہو......؟ کبوتری سے؟'' وہ طنزیہ انداز میں بھی اپنی خونخواری نہ چھپا سکا تھا۔

منو اس کو تاؤ دلا کر اس سے اپنا فاصلہ بڑھانا چاہتا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہا تھا کیونکہ اس بار وہ دو قدم پیچھے ہٹا تو کالا بلا اپنی جگہ پر ہی بیٹھا اس کی اگلی بات کا منتظر رہا۔وہ اسی زعم میں مبتلا تھا کہ وہ جب بھی چاہے منو کو پکڑ کر چبا سکتا ہے۔

''مم......میں......اللہ کے حبیب ﷺ سے عشق کرتا ہوں۔'' اتنا سننا تھا کہ کالا بلا تن کر کھڑا ہو گیا۔اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔وہ مسلسل گھورتا ہوا منو کی طرف دیکھنے لگا اس کا انداز ایسا تھا کہ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آ رہا ہو کہ منو نے کیا کہہ دیا ہے۔وہ غرایا۔

''یہ سب بکواس ہے......یہ انسانوں کا پھیلایا ہوا کھڑاگ ہے۔جب کائنات کو چلانے والا ہی نظر نہیں آتا تو پھر اس کا محبوب......اور پھر اس سے عشق کیسا......؟ کیوں تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟'' منو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔کالا بلا سختی سے زمین پر پاؤں مارتا ہوا غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔منو اب اس سے کافی فاصلے پر ہو گیا تھا۔وہ اس بار جی کڑا کر کے بولا۔

''یہی تو ایک دلیل ہے کہ وہ مشرکوں اور عقل کے اندھوں کو نظر نہیں آتا۔میری نظر سے دیکھو گے تو وہ تمہیں کائنات کے ہر رنگ اور ہر ذرے میں نظر آئے گا۔'' منو اب اس پوزیشن پر تھا کہ با آسانی اُڑان بھر سکتا تھا۔تبھی تو وہ کالے بلے کے عزائم کو سمجھ گیا اور مزید دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''تمہاری آنکھ چبا کر کھاؤں گا تو پتہ چلے گا کہ تمہارا اللہ کہاں ہے؟'' یہ غصیلی آواز منو کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ بلے کے ارادوں کو بھانپتا ہوا اُڑان بھر کر دوسری منڈیر پر پہنچ گیا۔تبھی بلے نے اس پر چھلانگ لگا دی۔بلا بھی اس کے پیچھے ہی منڈیر پر پہنچ گیا تھا۔منو چھوٹی سی اُڑان بھرتا ہوا صحن میں بنی ہوئی کوٹھڑی پر پہنچ گیا اور پھر نیچے صحن میں چھلانگ لگائی تو بلا اس کی

توقع سے زیادہ پھرتیلا اور چالاک ثابت ہوا تھا۔ وہ بھی کوٹھڑی اور پھر صحن میں پہنچ کر ایک بار پھر منو کے مدِ مقابل کھڑا تھا۔ منو نے ایک سانس کھینچا اور ایک رسک بھری اُڑان بھری تو بلا بھی ہوا میں اچھلتا ہوا اپنے ایک پنجے سے منو کو زخمی کرنے کی کوشش میں اپنے ہی زور سے آگے نکل گیا اور کوٹھڑی کی دیوار سے ٹکرا کر ''میں مر گیا'' کی آواز نکالتا ہوا کچے صحن میں گر گیا۔ منو اب کوٹھڑی کی چھت پر بیٹھا ہوا اپنا سانس درست کر رہا تھا جبکہ اندر سے صبور احمد نکل آئے وہ ایک ہی نظر میں تمام معاملہ سمجھ گئے۔ انہوں نے انگلی کا اشارہ کر کے بلے کی جانب کچھ پڑھ کر پھونکا تو وہ الٹی قلابازیاں کھا کر ٹیڑھا ہو گیا۔

منو نے چھت پر سے دیکھا کہ وہ اپنی جان توڑ کوشش کے باوجود بھی سیدھا نہیں ہو پا رہا تھا وہ زمین پر تڑپنے لگا۔ منو کو اس لمحہ اس پر بہت ترس آیا مگر دوسرے ہی لمحہ اس کے کانوں میں صبور احمد کی آواز پڑی جو بلے سے مخاطب تھے۔ ''بلاؤ...... اپنے گرو کو...... جو ربِ واحد کا منکر ہے۔'' منو کو اس بات کی سمجھ نہ آئی تو بلا گڑگڑانے والے انداز میں بولا۔ ''مجھے معاف کر دیں شاہ جی...... میں بہک گیا تھا......'' اس کی چیخیں نکلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ''میں نے آپ کا نمک کھایا ہے...... مجھ سے غلطی ہو گئی...... مجھے جانے دیں۔'' صبور احمد خاموشی سے اس کا تڑپنا دیکھتے رہے اور اوپر منہ کر کے منو سے مخاطب ہوئے۔ ''شین! یہ شیطان کا چیلا ہے۔ جو تمہیں راہِ عشق سے ہٹا کر اپنی غلیظ اور شرک بھری راہوں پر چلنے کے لیے مجبور کرنے آیا تھا۔'' منو کی آنکھیں خوف سے اس قدر کھل گئیں کہ اگر وہ خود اپنی حالت دیکھ لیتا تو شاید ڈر جاتا۔ وہ حیرت و استعجاب سے کبھی شاہ جی صبور احمد کو اور کبھی اس سیاہ بلے کو دیکھتا رہا جو شیطان کا ایک کاری وار تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی بچائی تھی۔ وہ جانے انجانے میں کامیابی سے عشق کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ صبور احمد نے اس کے نام ''منو'' کی بجائے شین کہہ کر کیوں پکارا ہے...... یہ تو اس کا نام نہیں ہے کہیں صبور احمد اس کی پہچان تو نہیں بھول گئے۔ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ کر رہ گیا۔

☆=======☆=======☆

حیاء کو ختم کرنے میں گڈی بائی نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی وہ تو بھلا ہو فضل محمد کا جو موقع پر پہنچ گیا اور حیاء کی جان بچ گئی۔ حیاء کا وجود اب قدرے نارمل ہو گیا تھا۔ وہ صبور احمد کے واقعہ کو ذہن سے نکالنا چاہتی تھی مگر ہر بات بھولنے کے بعد اس کا ایک فقرہ اس کے دل و



دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیتا تھا۔ صبور احمد کی زبان سے بڑے اعتماد کے ساتھ نکلا تھا کہ ''احمد سبحانی ہمارا ہے'' تو پھر صبور احمد کون ہے؟ وہ اس کے آخری الفاظ پر غور کر رہی تھی جو شاعری صبور احمد نے کی تھی وہ تو عشق کی اتھاہ گہرائیوں سے بھی گہری تھی۔ وہ صبور احمد سے ضرور ملے گی۔

یہ ارادہ کرتے ہی اس نے اپنے جاننے والے بدمعاش لاڈو سے رابطہ کیا۔ وہ گلی گلی پھرنے والا آوارہ تھا۔ ہر کوئی اس سے خائف رہتا تھا۔ اس کی پیشانی پر کونے میں چاند ستارہ بنا ہوا تھا۔ وہ حیاء سے پیار کرتا تھا اور دل کی گہرائی سے کرتا تھا۔ یہ اس کا اپنا خیال تھا اور حیاء نے کبھی بھی اس کو تماش بین یا بدمعاش سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ اب بھی وہ جانتی تھی کہ پورے شہر میں اس کام کو صرف اس کا نامراد عاشق لاڈو ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ اس نے فون پر صبور احمد کا حلیہ بتایا اور لاڈو کو کام پر لگنے کا کہہ دیا۔ لاڈو حیاء کا فون سنتے ہی ''شرلی'' کی طرح شہر کی گلی گلی میں گھومنے لگا۔ اس نے اپنے کارندے اس کام پر لگا دیئے تھے حیاء اس کام کو گڈی بائی سے خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس پورے بازار میں یہی ایک اس کی دشمن تھی۔

شام تک لاڈو اس کے کوٹھے پر مکمل معلومات کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ زندگی میں پہلی بار حیاء نے اسے اپنے ہاتھوں سے کولڈ ڈرنک پیش کیا تھا۔ اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ حیاء کو شریر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

حیاء اس کی نظروں کے شرارتی تانے بانے کو پہچانتی اور جانتی تھی۔ مگر اس وقت اسے لاڈو سے کام تھا اور وہ اس کا ہر نخرہ برداشت کر رہی تھی۔

''جی تو جناب!'' حیاء اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اور بھی سینہ پھلاتے ہوئے چوڑا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''میرے کام کا کچھ بنا......؟ یا پھر ایویں ای بدمعاش ہو؟'' حیاء اس کی رگ رگ سے واقف تھی وہ تڑپ کر اٹھ کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''حیاء! ہم نے تم سے پیار کیا ہے اور ہم جان دا ہے کہ پیار کی چیز اے؟'' اس کا لہجہ اور گفتگو کا انداز حیاء کو ہمیشہ ہی برا لگا تھا۔ مگر اب برداشت اور ضبط کا مظاہرہ ہی حیاء کا اصل امتحان تھا۔ ''ہم کدی جان دینے سے بھی ناں نہ کریں گے...... وہ مست ہے۔ اس کا نام صبور احمد ہے۔'' حیاء کو اس کے جواب سے چڑ ہو گئی وہ بہت تحمل سے بولی۔ ''یہ تو سب کچھ میں نے تمہیں بتایا تھا...... تم نے کیا معلوم کیا ہے؟ وہ بتاؤ؟'' وہ کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''وہ سیّد زادہ ہے۔ اس کی شہر سے باہر بڑی وڈی

حویلی اے...... اس کے پیو جی کا نام سیّد حاکم علی ہے جو ایک مشہور کاروباری شخص کے گھر ملازمت کرتا ہے۔'' لاڈو نے صبور احمد کی حویلی اور اس کا مکمل حدود اربعہ بیان کر دیا تو حیاء نے پھر لاڈو کو چلتا کیا۔ مگر وہ سیڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو گیا اور پیچھے منہ کر کے بولا۔ ''حیاء...... ہم نے تینوں پیار کیتا ہے...... ساہنوں اس گل سے کوئی لینا دینا نئیں کہ اوہ مست نوں توں کیا کہنا ہے...... بس کدی لاڈو دی جان کی لوڑ پڑی تو دس دینا...... تم پر سوواری قربان ہو جائے گا۔'' وہ اپنے تئیں اپنا کام مکمل کر گیا تھا۔ حیاء اس کی آخری بات پر غور کرنے لگی۔ دوسرے ہی لمحہ اس نے سر کو جھٹک دیا اور اس کا ذہن صبور احمد کی طرف لڑھک گیا۔ وہ سوچنے لگی۔

صبور احمد ایک سیّد زادہ ہے اور وہ بھی سادات کی غلام ہے وہ اس گھرانے سے ٹکر کیسے لے سکتی ہے۔ صبور احمد نے احمد سبحانی پر یونہی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ حیاء کو یہ باور کرانا چاہتا ہو کہ احمد سبحانی کی خاطر اس سے جنگ میں شکست حیاء کی ہو گی۔ وہ جتنا بھی اس کے بارے میں سوچتی جاتی اور ڈوبتی جاتی۔

اس نے اسی رات ہی صبور احمد سے ملنے کا فیصلہ کر لیا...... اگر احمد سبحانی آ گیا تو...... وہ اس سے اس کے پیار کی بھیک مانگے گی۔ وہ صبور احمد کو شکست تو نہ دے سکتی تھی مگر احمد سبحانی کو جیتنا چاہتی تھی۔

وہ شام کو بناؤ سنگھار کر کے اپنے کام پر کھڑی ہو گئی تھی۔ سازندوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر وہ ناچ ناچ کر تھکنے والی ہو گئی تھی۔ احمد سبحانی نہ آیا تھا۔ تماش بین اس کے وجود کو چھونے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ ہمیشہ کی طرح ان کے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی ٹھمکا لگاتی اور ان کی پہنچ سے دور نکل جاتی۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنے سازندوں کو بھی فارغ کیا اور بازار کا نظارہ کرنے کے لیے بالکنی میں گئی تو بازار کی رونقیں ماند ہونے کو تھیں کہیں دور سے گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو سیاہ چادر میں لپیٹا اور منہ پر نقاب لگا کر سیڑھیاں اترتی ہوئی بازار میں آ گئی۔

اسے خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ مست طبیعت کا درویش اس وقت گھر پر نہ ملا تو اس کا چکر بے کار ہی جائے گا۔ وہ چلتی ہوئی بازار سے باہر پہنچی تو ایک رکشہ والے کو اشارہ سے بلایا۔ وہ اس وقت اپنی قیمتی گاڑی میں بھی جا سکتی تھی مگر اس نے رکشہ میں جانے کا فیصلہ کیا۔ رکشہ والا بھی بڑا کایاں تھا اس نے منہ مانگا کرایہ وصول کیا اور آنے جانے کا کرایہ کر لیا۔ حیاء کو وسوسوں اور



خدشوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ ایک دنیا دار شخص کا عشق مانگنے ایک دین دار شخص کے گھر پر سوالی بن کر جا رہی تھی۔ اگر صبور احمد نے اسے خالی لوٹا دیا تو وہ کیا کرے گی؟ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ کر رہ گئی کہ اگر احمد سبحانی اسے نہ ملا تو وہ باقی ماندہ زندگی کیسے گزارے گی...... وہ احمد سبحانی کو دنیا سے چھین لے گی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ ٹکرا جائے گی۔ وہ آج کی دنیا کے نظام کو بدل کر دکھائے گی۔ وہ بتائے گی کہ عشق بڑا اندھا ہوتا ہے۔ یہ اپنے راستے میں آنے والی کسی بھی دیوار کا قیدی نہیں بنتا۔ یہ اپنا آپ منوا کر ہی رہتا ہے۔

''اب دائیں جانا ہے یا بائیں۔'' رکشہ والے کی آواز نے اسے چونکا دیا تو وہ حیرانگی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ جس جگہ پہنچ گئی تھی اسے خود معلوم نہ تھا اب کدھر مڑنا ہے مگر آفرین لاڈو کے، پورا نقشہ کھینچ کر لایا تھا۔ اسی لیے حیا کی حیرت کم ہوئی تو اس نے سامنے جانے کو کہا۔

رکشہ ایک بڑے سے پیپل کے پاس جا کر رک گیا۔ اسے راستے بھر میں کہیں بھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ رات کے تین بج گئے ہیں۔ ٹریفک بھی ختم ہونے کے برابر تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی یہاں تک تو آ گئی تھی مگر اب سنسان اور ویران ماحول سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

''واپس چلیں جی؟'' رکشہ والے کی طنزیہ آواز نے اس کے جسم میں کرنٹ دوڑا دیا۔ اب اگر وہ واپس چلی گئی تو پھر کبھی بھی احمد سبحانی کو نہ پا سکے گی۔ وہ رکشہ سے باہر اتری اور دل کی دھڑکنوں کی صدا واضح طور پر سنتی ہوئی رکشہ ڈرائیور سے بولی۔ ''میرا انتظار کرنا۔'' وہ سر ہلا کر تھوڑا سا نیم دراز ہو گیا۔ اُس کا انداز ایسا تھا کہ جاؤ جہنم میں۔ حیاء آگے بڑھی تو چند میٹر کے فاصلے پر ایک بلب جلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اپنی بساط کے مطابق اتنی بڑی بستی کو روشنی دینے کی جستجو میں مگن تھا۔ حیاء کو اِردگرد کم ہی آبادی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دیکھ لیا کہ جس جگہ پر بلب جل رہا ہے یہی حویلی ہے مگر اس کا دروازہ کدھر ہے؟ یہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ وہ اندھیرے میں چلتی ہوئی اندر ہی اندر یہی خوف کھا رہی تھی۔ اسے اگر کوئی ہزاروں روپے دے کر بھی صبح دن کی روشنی میں یہاں آنے کا کہے تو وہ کبھی بھی نہ آئے مگر اس وقت وہ رات کی تاریکی میں اللہ کے ولی کے گھر سے اپنا عشق مانگنے آئی تھی اور اس کا عشق ہی اندر سے اس کو بہادر بنا کر یہاں تک لایا تھا۔

بلب کی روشنی میں اسے معلوم ہو گیا کہ دروازہ اس دیوار کے دائیں طرف ہے جس دیوار پر وہ بلب روشن تھا۔ وہ ڈری ہوئی تھی اور سہمی سہمی نظروں سے اردگرد دیکھتی ہوئی

دروازے تک جا پہنچی۔ اس کے دیکھے جانے کا ڈر نہ تھا کیونکہ اس لمحہ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ اندر سے بند محسوس ہوا۔ حیاء نے سوچا کہ اگر وہ کنڈا بجائے تو اس وقت کنڈا بجانے کا شور بہت دور تک سنائی دیا جائے گا۔ اس نے غیر فطری اور غیر ارادی طور پر دروازے پر دباؤ ڈالا تو اندر سے کسی مرد کی بھاری بھرکم آواز سن کر لرز گئی۔

''دروازہ کھلا ہے..... فقیروں کے در کبھی بند نہیں ہوتے۔ اندر آ جاؤ......'' اس نے غور کیا کہ یہ آواز صبور احمد کی تھی۔ پہلے جب اس نے دروازے کو دبایا تھا تو وہ بند ملا تھا مگر اب وہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر کھل گیا تھا اور اندر سے یوں لگتا تھا کہ اسے کیمرہ کے ذریعے دیکھا جا رہا ہے۔ وہ خوف سے لرزتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کے پار جا کر ایک کھلا صحن ہے جس میں ایک کم واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ صحن کا فرش کچا تھا۔ اسے بظاہر تو کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ قدموں کی چاپ سن کر پیچھے کو پلٹی تو اس کے سامنے صبور احمد کھڑے تھے۔ وہ حیرت و استعجاب میں مبتلا انہیں دیکھتی رہی تو صبور احمد نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کبوتر کو اپنے کندھے پر بٹھالیا۔ حیاء حیرانگی سے اس کبوتر کو دیکھنے لگی تو صبور احمد کی آواز پر چونک گئی۔ ''عشق راتوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے بی بی۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی۔

''اب میری منزل آسان ہوگئی ہے...... اب مجھے اپنی شکست کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔'' صبور احمد اس کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے کہ پہلی بار دیکھا ہو۔ ''میرا وکیل میرا کیس لڑے گا۔'' صبور احمد کا ہلکا سا قہقہہ گونجا۔

''یہ دنیا کے قانون ان عدالتوں میں نہیں چلتے بی بی...... اور نہ ہی کوئی وکیل تمہارا کیس جیت سکے گا۔ بہتر ہے اسے بھول جاؤ۔'' حیاء دو قدم آگے بڑھی تو کبوتر بے چینی سے غٹرغوں کرنے لگا۔

''مجھے تو اب پتہ چلا ہے کہ یہ عظمت والا گھرانہ ہے اور آپ آلِ رسول ہیں اور اس دان کرنے والے گھرانے کی تاریخ گواہ ہے کہ اس چوکھٹ سے کبھی کوئی خالی نہیں گیا۔'' صبور احمد کچھ بے چین دکھائی دینے لگے۔ وہ حیاء کی بات کو گہرائی تک سمجھ گئے تھے۔ ''آپ ہی میرے وکیل ہوں گے شاہ جی!'' صبور احمد اس بار تو واقعی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''مقدمہ



بھی خدا کی عدالت میں ہوگا اور میرے عشق کی سچائی کا بہترین گواہ بھی آپ خود ہوں گے۔'' وہ الفاظ سے صبور احمد کو شکست دینا چاہتی تھی۔ اس بار تو حیاء نے بھی غور کیا کہ کبوتر بھی ان کی باتیں غور سے سن اور سمجھ رہا ہے۔

''میں تمہارا کیس لینے سے انکاری ہوں...... تم اس کیس کی فیس ادا کرنے کی اہل نہیں ہو۔'' صبور احمد کی بات میں پہلے جیسی گرج نہ تھی۔ ان کا کھوکھلا لہجہ محسوس کرتے ہوئے حیاء ان پر حاوی ہوتی ہوئی بولی۔

''یہ فیصلہ آپ نے کیسے کر لیا کہ میں آپ کی فیس دینے کی اہل نہیں ہوں۔''

''تمہاری اپنی ماں گڈی بائی سے کس بات کی لڑائی ہے؟'' صبور احمد وہ نقطہ اٹھا لائے تھے جو حیاء کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ کانپنے لگی وہ آنکھیں پھاڑے اس مست منش کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گڈی بائی اس کی ماں ہے۔

''دیکھ حیاء بی بی! مجھے تمہارے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر میں قربان جاؤں اس عظمت والے سوہنے خدا کے قوانین کے...... جس کی لسٹ میں تم اہم مقام پر کھڑی ہو۔'' حیاء ان کی بات کو سمجھ نہ سکی۔ ''میں آپ کی گہری باتوں کو نہیں سمجھ سکتی......'' اس نے اپنی لاعلمی کا برملا اعتراف کیا تو صبور احمد نے کبوتر کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر پیار کرنا شروع کر دیا۔

''حیاء بی بی! پہلے اپنی ماں سے اپنا جھگڑا نپٹا لو...... میں پھر تمہاری وکالت کر سکتا ہوں...... اب جاؤ...... میرا خیال ہے کہ تم آج بھی تہجد کی نماز قضا نہیں کرو گی؟'' یہ کہہ کر صبور احمد خاموش ہوگئے گویا کہ اب وہ کچھ بھی نہ بولیں گے۔ حیاء جانتی تھی کہ صبور احمد سے اس کی اور گڈی بائی کی کوئی بھی بات چھپی نہیں ہے۔ اب اس کا یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

''اس اندھیری رات میں یہ عورت اکیلی آئی تھی اسے اپنی عزت کا ڈر نہیں لگا۔'' منو نے حیاء کے جاتے ہی کافی دیر سے ذہن میں کلبلانے والا سوال کر ڈالا تو صبور احمد مسکراتے ہوئے اس کو چوم کر بولے۔

''اس کی عزت کی رکھوالی وہ خود کرے گا جس نے اس کو عشق کے ایک درجے پر فائز کر دیا ہے۔'' اس بار منو کی حیران ہونے کی باری تھی۔ ''عشق کے درجے پر......؟''

''ہاں منو صاحب!'' صبور احمد اس کبوتر کو لے کر اندر کی جانب بڑھتے ہوئے بولے۔

''جس طرح تم عشق کا شین ہو...... یہ طوائف زادی...... عشق کا قاف ہے...... اور وہ عشق کا

عین ہے۔'' منوطوائف زادی کا سن کر ہی حیران تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا بڑا درجہ کیوں اور کیسے دے دیا...... وہ آگے پوچھنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا کیونکہ یہ اللہ اور اس کے دوستوں کے معاملات تھے۔

☆=======☆=======☆

سعید علی، زویا بیگم، احمد سبحانی اور فاطمہ اس وقت ڈرائنگ روم میں قالین پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ حاکم علی صوفے پر اس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابھی اٹھ کر بھاگ جائیں گے۔ ڈرائنگ روم میں عجیب سی خاموشی تھی۔ گھر کے سارے افراد حیرت واستعجاب کے عالم میں اس وقت اور ان لمحات کو یاد کر کے اپنی اپنی جگہ پچھتاوے میں گھرے ہوئے تھے جب وہ حاکم علی سے ملازم کی طرح کام لیا کرتے تھے۔ مگر اس تمام معاملے میں وہ خود کو بے قصور بھی تصور کرتے تھے کیونکہ پچیس سالوں سے کبھی بھی حاکم علی نے اپنی اصلیت ظاہر نہ کی تھی۔

سعید علی نے جب یہ خبر احمد سبحانی اور فاطمہ کی زبانی سنی تو وہ سکتے کی کیفیت میں آ گئے تھے اور انہوں نے فوراً حاکم علی سے کام چھڑوا دیا تھا۔ اب ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کریں۔ ان کے سامنے آلِ رسول میں سے ایک شہزادہ تشریف فرما تھا۔ ان کے حسب نسب اور آل کی نسبت اور پھر ان سے ملازموں کی طرح کام لینے کی تمام باتیں سعید علی پر بوجھ بنی ہوئی تھیں۔

سعید علی کے من میں نہ جانے کیا آیا وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور سیّد حاکم علی کے پاؤں میں گر گئے۔ سبھی ان کی اس حرکت پر حیران رہ گئے جبکہ حاکم علی اکٹھے ہو کر پاؤں صوفے پر رکھ کر بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

''آپ ہمیں معاف کر دیں شاہ جی!'' سعید علی کے منہ سے نکلا۔ ''جانے انجانے میں ہم نے بڑے بڑے گناہ کیے ہوں گے مگر خدا کی قسم...... ہم سے آپ سے کام لینے کا گناہ بالکل انجانے میں ہوا ہے۔'' سعید علی کی آواز بھرا گئی تو باقی افراد کی آنکھیں بھی آنسوؤں کی روشنی سے جگمگ کرنے لگیں۔

''مجھے گناہگار نہ کرو سعید علی!'' حاکم علی شاہ نے پہلی بار سعید علی کو ان کے نام سے پکارا تھا ورنہ گزشتہ پچیس سال سے وہ صاحب جی یا پھر بڑے صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ ''اس میں آپ لوگوں کی کوئی غلطی نہیں ہے...... میں اگر پہلے دن ہی بتا دیتا کہ میں سیّد ہوں...... کوئی بھی مجھے کام نہ دیتا...... بلکہ خدمت اور عقیدت کے طور پر چند روپے اور خیرات دے کر



مجھے ذہنی معذور بنانے کی کوشش کرتا۔'' وہ اب پہلے کی نسبت دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ''ہمارے اعلیٰ خاندان کے لیے بھیک مانگنا اور صدقہ وخیرات واجب نہیں ہے...... میں نوجوان تھا...... کام کاج کر کے اپنے بچے اور بیوی کا پیٹ پال سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے نوکری کی۔'' حاکم علی شاہ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔ وہ پھر پُرسکون آواز میں بولے۔ ''قربان جاؤں تمہارے اعتماد کے سعید علی کہ آپ نے کبھی بھی میرا گھر دیکھنے کی ضد یا بات نہیں کی۔''

احمد سبحانی اور فاطمہ کے لیے یہ نیا انکشاف تھا کہ جس ملازم کو پچیس سالوں سے رکھا ہوا ہے ان کے پاپا نے کبھی بھی اس کا گھر نہیں دیکھا۔ کیوں؟ اس کیوں کا جواب سعید علی کی آواز نے دے دیا۔

''پہلے دن سے لے کر آج تک آپ نے کبھی کوئی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا شاہ جی...... اور پھر...... آپ تو اکثر ہمیں صبح کو آ کر جگایا کرتے تھے۔'' سعید علی ان کے قدموں میں ہی بیٹھے تھے جبکہ حاکم علی شاہ ہنوز صوفے پر پاؤں رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سعید علی کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولے۔

''جب نوکری ہی کرنی ہے تو پھر وقت کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ وقت خود سب سے بڑی تبدیلی ہے اور میں وقت کا نہیں بلکہ وقت میرا محتاج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی نوکری مخلص ہو کر کی تا کہ مالکوں کو میری دیری سویری سے کوئی دکھ نہ پہنچے۔'' سعید علی اور باقی تینوں افراد بھی سر ہلا کر رہ گئے۔

''آپ کا گھرانہ تو سخیوں میں شمار ہوتا ہے۔ دنیا جہان کے خزانے آپ کے قدموں کی دھول ہوتے ہیں شاہ جی۔ پھر آپ نے ہمیں گناہ گار کیوں کیا؟'' حاکم علی شاہ سعید علی کی بات سن کر ہنستے ہوئے بولے۔

''ہم ان خزانوں کے امین ہوتے ہیں۔ تا کہ ان کی تقسیم منصفانہ ہو... تبھی تو ہمارے گھرانے کو رب تعالیٰ نے چنا ہے اگر ہم ہی ان خزانوں کو لوٹنے لگیں تو ہماری تاریخ بدنام ہو جائے گی...... آپ دیکھیں... آج دفاتر میں، ملز، فیکٹریوں اور صنعتوں کے علاوہ ہر شعبہ میں سادات گھرانے کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ایمانداری اور وقت کی پابندی سے... اگر وہ بھی اللہ کی امانت میں خیانت کا خیال کر کے کام کاج محنت مزدوری نہ کریں تو پھر رب تعالیٰ اس گھرانے کو اتنی عظمت تو کبھی بھی نہیں بخشے گا۔''

"پاپا!" پہلی بار احمد سبحانی نے زبان کھولی۔ "جب صبور احمد آپ سے ملے تو آپ نے کہا تھا کہ حاکم علی شاہ صاحب نے ہی آپ سے صبور احمد کو پچیس سال قبل ملوایا تھا...... انہوں نے بھی آپ کو نہیں بتایا کہ وہ ان کے صاحبزادے ہیں۔" احمد سبحانی کا سوال سن کر زویا بیگم اور سعید علی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

"بیٹا!" حاکم علی شاہ نے احمد سبحانی کی بات کا جواب دینے کے لیے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "تمہارے باپ کی خواہش تھی کہ ان کی پہلی اولاد بیٹا ہی ہو...... انہوں نے مجھ سے بات کی تو میں نے ایک اللہ والے کا ذکر کیا وہ اللہ والا صبور احمد تھا۔ میرے گھر میں رب تعالیٰ نے انعام واکرام کی بارش اس طرح کی کہ صبور احمد بچپن سے ہی مست اور اللہ لوک تھا۔ وہ زبان سے کوئی بھی لفظ نکالتا تھا تو اللہ تعالیٰ پورا فرما دیتا تھا۔ مجھے خوف بھی تھا کہ اگر صبور احمد نے اللہ سے پہلی بیٹی مانگ لی تو میں شرمندہ ہو جاؤں گا۔" فاطمہ اور احمد سبحانی اس کہانی میں دلچسپی لے رہے تھے کیونکہ یہ کہانی ان کے گھر کی تھی اور ان کی زندگی کے متعلق تھی۔ حاکم علی شاہ پھر گویا ہوئے۔

"صبور احمد نے میرے ساتھ سعید علی کو دیکھا اور منہ اوپر آسمان کی جانب کرتا ہوا بولا...... اپنے وعدے کی لاج رکھنا...... ربیع الاول کا ماہ مبارک ہے۔ اپنے محبوب ﷺ کا صدقہ اس کو بھی زندگی والا بیٹا دے دے......" حاکم علی شاہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے تو احمد سبحانی کی بے چینی بڑھ گئی...... "پھر کیا ہوا شاہ جی؟" وہ سعید علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"سعید علی! اگر آپ کی اجازت ہو تو بتا دوں؟ اس بار تو سعید علی کا داؤ چل گیا۔ انہوں نے حاکم علی شاہ کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے اجازت مانگ کر مجھے شرمندہ اور گناہگار نہ کریں۔" جبکہ ان دونوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ فاطمہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ حاکم علی شاہ بولے۔

"صبور احمد نے جب منہ نیچے کیا تو اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر سعید علی تو کانپ گئے جبکہ میں اپنے بیٹے کی کیفیت سے باخبر تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ بابا جی! اس سیٹھ کو وعدہ کرنا ہو گا۔ میں نے پوچھا کہ کیسا وعدہ؟ تو وہ بولا۔ اللہ تعالیٰ پہلا بیٹا ہی دے گا۔ زندگی والا بھی ہو گا۔ مگر...... وہ ہمارا ہو گا...... اس سیٹھ کو وعدہ کرنا ہو گا کہ اگر بیٹا لینا ہے تو پھر اس کی زندگی پر ہمارا حق ہو گا۔ وہ ہمارا ہو گا...... کب ہو گا؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ بولو منظور ہے تو مہر لگ جائے گی۔ اگر نہیں منظور تو پھر پہلی اولاد کیا۔ جتنی بھی اولاد ہو گی بیٹیاں ہی ہوں



گی۔" حاکم علی شاہ کی خاموشی اور سانس لینے کے وقفہ نے ان دونوں کا تجسس اور بڑھا دیا تھا۔ اس بار فاطمہ خاموش نہ رہ سکی۔

"آپ نے کیا جواب دیا پاپا!" سعید علی بیٹی کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ پھر ان کی نظریں حاکم علی شاہ سے چار ہوئیں تو وہ نظریں جھکا کر رہ گئے جبکہ حاکم علی شاہ بولنے لگے۔

"سعید علی نے صبور احمد کی بات مان کر وعدہ کر لیا کہ پہلا بیٹا ہی ہو اور میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس کی زندگی پر مکمل اختیار ہو گا...... نہیں نہیں۔ یہ صبور احمد کا جواب تھا۔ زندگی اسی کی ہو گی اور گزارے گا بھی وہ اپنی مرضی اور پسند سے...... مگر اللہ تعالیٰ کو جب پسند ہو گا یا جب وہ چاہے گا وہ اس سے اپنی پسند کا کام لے لے گا۔ سعید علی مان گئے تھے۔ اب صبور احمد ان سے کافی مدت کے بعد ملا ہے تو خدا جانے وہ کیا کر رہا ہے اور کس کام میں مگن ہے۔ مگر وہ اپنی ڈیوٹی اور حکم الٰہی کا سختی سے پابند ہے۔" حاکم علی شاہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے تو احمد سبحانی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"آج کے بعد آپ اس گھر میں کام نہیں کریں گے شاہ جی!" سعید علی نے کرب اور دکھ سے کہا تو ان کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔ "میرا دانہ پانی اتنا ہی لکھا ہو گا سعید علی!" وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولے تو باقی افراد بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "اب مجھے اس عمر میں کہیں اور کام ڈھونڈنا پڑے گا...... کیونکہ یہی مالک کی رضا ہے۔" سعید علی شرمندگی سے سرشار جذبوں کو سرخرو کرتے ہوئے بولے۔

"آپ نے مجھے غلط سمجھ لیا ہے شاہ جی! میں اب آپ کو کوئی بھی کہیں بھی کام نہیں کرنے دوں گا...... بلکہ......"

"بلکہ......؟" حاکم علی شاہ نے سعید علی کی طرف دیکھا۔

"بلکہ آپ نے تو اپنی مدت ملازمت سے بھی زیادہ کام کر لیا ہے...... میں آپ کی خدمت میں آپ کی باقی عمر کی تمام تنخواہ عقیدت کے طور پر آپ کے گھر پہنچا دیا کروں گا۔ ہر ماہ باقاعدگی سے۔" سعید علی کی بات سن کر حاکم علی کے چہرے پر کرب کی ایک پتلی سے لکیر کھنچ گئی۔

"سعید علی! شاید آپ نے غور سے نہیں سنا کہ ہمارے خاندان کو خیرات اور صدقات واجب نہیں ہیں۔" حاکم علی شاہ کی آواز میں صدیوں کا کرب نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ سعید علی کے جذبات کی قدر کرتے تھے مگر یہ بات ان کو ناگوار گزری تھی۔ مگر سعید علی کا لہجہ بھی آزردگی اور

دُکھ بھرا تھا۔

"آپ نے مجھے کمینہ کیسے سمجھ لیا شاہ جی...... میری یہ اوقات کہاں سے ہوگئی کہ میں جس گھر کی برکت اور وسیلہ سے رب کریم سے رزق مانگتا ہوں۔ میں اسی گھر کو خیرات دوں......بس آپ یہ سمجھ کر میری بات کو معاف کر دیں کہ میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں سکتا کیونکہ الفاظ میرے دل و دماغ سے بغاوت کرتے ہیں۔"

"شاہ جی!" احمد سبحانی آگے بڑھتا ہوا بولا۔ "پاپا کا کہنے کا مقصد تھا کہ آپ نے پچیس سال سے زیادہ اس گھر میں کام کیا ہے...... ہم آپ کی محبت اور صحبت کی بدولت ہر قسم کی دنیاوی پریشانیوں سے محفوظ رہے ہیں۔ اب ہم آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں......ہمیں اس نیکی سے نہ روکیے شاہ جی! شاید یہی کام ہماری آخرت سنوار دے اور ہم نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ ﷺ کی شفاعت کے حقدار ٹھہرائے جائیں۔" حاکم علی شاہ کے ساتھ ساتھ سعید علی اور زویا بیگم بھی بیٹے کی طرف دیکھ کر رہ گئے تھے ان کی نظروں میں احمد سبحانی ایک آوارہ اور شرابی تھا۔ مگر وہ کتنا گہرا تھا۔ اس کا اندازہ آج ہو رہا تھا۔

"شاہ جی!" سعید علی کا لہجہ مؤدب اور قابلِ احترام تھا۔ "ہم پر ایک اور عنایت کریں۔ ہمیں وہ آستانہ دکھا دیں جہاں آپ جیسے عظیم لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔" حاکم علی شاہ خاموش رہے تو وہ سب لوگوں کے ساتھ باہر آئے تو احمد سبحانی سعید علی کا اشارہ پا کر گاڑی لے آیا اور اگلی سیٹ کی طرف کا دروازہ کھول کر احترام سے حاکم علی شاہ کو تعظیم سے اندر بیٹھنے کا کہا۔ حاکم علی شاہ زندگی میں پہلی بار اتنی قیمتی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ وہ عجیب محسوس کر رہے تھے۔

کل کا ملازم آج اپنے مالکوں کے پہلو میں اس شان سے تشریف فرما تھا کہ مالک ان کی تعظیم میں پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی رب کریم کی بے نیازی اور شانِ کریمی ہے۔ وہ کسی سے طور پر ملاقات کرتا ہے تو کسی کو آگ میں پھنکوا دیتا ہے۔ وہ بھی تو اس کے نبی ہی تھے جن کو آرے سے چیروا دیا تھا۔ اس نبی کی کیا شان تھی کہ مچھلی کے پیٹ میں بھی ان کو زندگی عطا کی اور زندہ سلامت باہر نکالا اور موسیٰ علیہ السلام کی کیا شان کہ فرعون کے محل میں اس کی بیوی کی گود میں پرورش پائی۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور انبیاء کرام کو کائنات میں دین اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے بھیجا......مگر اس کی قدرت اور شان بے نیازی تو دیکھیے کہ نبوت کو اپنے پیارے محبوب محمد عربی ﷺ کی ذات مقدس و معطر و مطہر پر ختم فرمایا اور ساتھ یہ



بھی فرما دیا کہ جو تمہاری اطاعت کرے گا وہ میری اطاعت کرے گا۔ تمام انبیاء کرام کو بیت المقدس میں نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کروائی...... اس محبوب ﷺ کی شان کا کیا کہنا تھا اور حاکم علی شاہ اسی محبوب ﷺ کی آل کا ایک چشم و چراغ تھے۔ گاڑی شہر سے باہر جانے والے راستے کی جانب چل پڑی۔

ہلکی ہلکی دھوپ موسم کو خوشگوار کر رہی تھی۔ حیاء رات بھر سے سوئی نہ تھی وہ اپنی بے قراری اور بے چینی کو قرار دینے کے لیے صبور احمد سے ملنے صبح کی روشنی میں چلی آئی تھی مگر اسے مایوسی ہوئی کیونکہ صبور احمد موجی آدمی تھے وہ کہیں نکل گئے تھے۔ جیسے ہی حیاء ان کی حویلی سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تبھی احمد سبحانی کی گاڑی حویلی کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ احمد سبحانی نے حیاء کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ان کے پاس سے گاڑی بھگاتی ہوئی لے گئی۔ وہ احمد سبحانی کو نہ دیکھ سکی۔ مگر وہ حیران رہ گیا تھا کہ ایک طوائف کا عظمت والے گھرانے سے کیا تعلق ہے۔ وہ اس گتھی کو سلجھانے نہ پایا تھا کہ حاکم علی شاہ کی طرف کا دروازہ سعید علی کھول چکے تھے۔

وہ ان کی سربراہی میں حویلی میں داخل ہوئے تو جدید دور کی اور نئی نسل کی فاطمہ حیرانگی سے حویلی کو دیکھنے لگی ایسی حویلیاں اس نے فلموں اور ڈراموں میں ہی دیکھی تھیں آج وہ حقیقت میں دیکھ رہی تھی بلکہ گھوم پھر بھی رہی تھی۔ حاکم علی شاہ زویا بیگم اور فاطمہ کو اندر زنان خانہ کی طرف لے گئے۔ جبکہ سعید علی اور احمد سبحانی باہر مٹی کے بنے ہوئے صحن میں بچھی ہوئی صف پر ہی بیٹھ گئے۔

"پاپا! کتنا سکون ہے یہاں۔" سعید علی بیٹے کی بات سن کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"پچیس برس قبل جب میں تمہارے لیے دعا کروانے آیا تھا تو اسی جگہ پر ایسی ہی صف پر بیٹھا تھا۔ تب مجھے علم نہ تھا کہ حاکم علی شاہ مجھے اپنے گھر لائے ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ "یہ فقیر منش لوگوں کے ڈیرے ہوتے ہیں۔ سکون اور چین ان کی شخصیت کا غلام ہوتا ہے۔" اچانک احمد سبحانی کی نگاہ منڈیر پر بیٹھے ہوئے کبوتر پر گئی۔ اس کی نارنجی چونچ اور ہشاش بشاش وجود احمد سبحانی کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کبوتر بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حاکم علی شاہ اندر سے روٹیوں کی چنگیر اور اچار لے کر آئے اور ان کے آگے رکھتے

ہوئے بولے۔

''فقیر کے گھر میں یہی کچھ ہوتا ہے۔'' احمد سبحانی اور سعید علی نے بسم اللہ پڑھ کر روٹیوں کی چنگیر پکڑی اور زندگی میں پہلی بار ہر نوالے پر نئی ''ڈش'' کا ذائقہ محسوس کیا۔ وہ حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ روٹی اور اچار کب ختم ہو گیا ان کو پتہ ہی نہ چلا۔

''ہمیں اجازت دیجیے شاہ جی!'' سعید علی نے عاجزی سے کہا تو حاکم علی شاہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔ ''سعید علی! پچیس سالوں میں مجھ سے کئی کوتاہیاں اور خامیاں کام کے سلسلہ میں ہوئی ہوں گی...... مجھے معاف کر دینا۔'' احمد سبحانی اور سعید علی تڑپ کر رہ گئے۔ دونوں باپ بیٹے نے فوراً ان کے ہاتھ پکڑے اور عقیدت سے چوم لیے۔ ''اور گناہگار نہ کریں شاہ جی!'' سعید علی کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز احمد سبحانی نے واضح طور پر محسوس کی۔ ''سعید علی کو زندہ رہنے دیں تاکہ آپ کی خدمت کر سکے!''

حاکم علی شاہ مسکرائے اور بولے۔ ''خداوند کریم! کسی انسان کو بھی اس کی برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا...... میں تمہاری بہتری کے لیے ہر دم دعا گو رہوں گا۔'' اندر سے زویا اور فاطمہ بھی آ گئیں وہ شاہ جی سے اجازت لے کر رخصت ہوئے اور واپس گھر کی راہ لی۔

احمد سبحانی کو سارا راستہ حیاء کا اس حویلی آنا کھٹکتا رہا۔ وہ اسے وہیں مل کر پوچھ سکتا تھا۔ مگر سعید علی زویا بیگم اور فاطمہ کی موجودگی رکاوٹ بن گئی اور پھر اس کے پہلو میں سادات بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ رات ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا تھا۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حیاء اپنا فن بیچتی ہے۔ جسم نہیں بیچتی۔ مگر کچھ بھی تھا وہ طوائف زادی تھی۔ وہ اس عظمت والے گھرانے میں کیا لینے گئی۔ وہ اس گتھی کو سلجھا نہ پایا تھا۔

☆=======☆=======☆



احمد سبحانی جانتا تھا کہ حیاء اس سے پیار کرتی ہے۔ اس نے کبھی بھی اس کی دولت کو سینے سے نہیں لگایا تھا۔ مگر احمد سبحانی کو معلوم تھا کہ وہ اس کی سوسائٹی اور معاشرے میں کبھی بھی اپنا نام اور مقام نہیں بنا پائے گی۔ وہ کبھی بھی اس کے ساتھ اس پاکیزہ ماحول میں چند گام نہ چل پائے گی۔ اس نے کبھی بھی حیاء کو چھوا نہ تھا۔ بس اس کی اداؤں کا دیوانہ تھا اس کا ناچ دیکھنے کے لیے نشہ میں دھت ہو کر اس کے کوٹھے پر راتیں گزارا کرتا تھا۔ دولت کی فراوانی اور باپ کے اعلیٰ سٹیٹس نے اس کو حیاء کا بہترین گاہک تو بنا ہی دیا تھا مگر اس کی اخلاقیات یافتہ حرکتوں نے حیاء کے دل میں گھر کر لیا تھا حیاء اپنا آپ کھو چکی تھی۔ وہ احمد سبحانی سے بے انتہا محبت کرنے لگی تھی۔ اب بھی وہ اس کے قدموں میں بیٹھی اس کی طرف حسرت و محبت سے دیکھ رہی تھی۔ مگر احمد سبحانی کی آنکھیں ہنوز بیگانگی دکھا رہی تھیں۔ جو گزشتہ تین برس سے قائم تھی۔ ''احمد!'' حیاء نے گلاب کی پنکھڑی جیسے لب وا کیے۔ ''میں نے تمہیں رب سے بے پناہ دعاؤں اور التجاؤں سے مانگا ہے۔'' وہ شراب کے نشہ میں دھت تھا مگر جانتا تھا کہ حیاء کا انداز والہانہ ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ حیاء کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ پھر بولی۔ ''میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔''

''جس چیز کو پسند کرنے کے لیے اس پر ہاتھ رکھ دیا جائے وہ اپنی نہیں ہو جاتی۔'' احمد سبحانی کی مخمور آنکھیں اٹھیں اور حیاء کے چہرے کا طواف کر کے پھر جھک گئیں۔ وہ سمجھ نہ پایا کہ حیاء کے تاثرات کیا ہیں۔

''میں آج تک کام کے لیے اپنے کوٹھے کی بالکنی میں کھڑی نہیں ہوئی۔'' احمد سبحانی اس کی بات کا مطلب سمجھنے کے لیے اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا اور منتظر رہا کہ وہ بات مکمل کرے۔ ''اگر ایک دن بھی اس بالکنی میں کھڑی ہو جاؤں تو سینکڑوں عاشق میری جھلک

جھلک دیکھنے کے لیے آپس میں لڑ پڑیں۔'' حیاء ایک ادا سے بولی تو احمد سبحانی کے ہونٹوں سے طنزیہ قہقہہ اس انداز میں نکلا کہ اس کا حلق دکھائی دینے لگا۔ حیا اس کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگی۔ وہ جان گئی کہ اب احمد سبحانی کوئی ایسی بات کرے گا جو اس کے کام کے منافی ہو گی۔

''مس حیاء!'' وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا تو حیاء کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری گھٹی میں عشق نام کی کوئی شیرینی نہیں ہوتی...... تو پھر کن لوگوں کو اپنا عاشق سمجھتی ہو جو تمہاری ایک ہی جھلک پر آپس میں لڑ پڑیں اور مرنے مارنے پر تل جائیں گے؟''

احمد سبحانی نشہ میں مخمور تھا مگر اس کی مدلل گفتگو حیاء کو گفتگو آگے بڑھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

''تمہاری نسلوں میں آج تک کوئی بھی طوائف اپنا دل نہیں ہاری...... اور پھر بھی تم عاشق کا دعویٰ کر رہی ہو؟'' حیاء تڑپ کر رہ گئی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی تبھی تو اس کے طنزیہ نشتر سہہ رہی تھی۔

''میں اپنے خاندان سے بغاوت کروں گی۔'' وہ مصمم ارادہ سے بولی۔ ''میں تم سے عشق کرتی ہوں احمد...... عشق......'' اس بار اس کا لہجہ مخمور تھا۔

''مگر میں تمہارا عاشق نہیں ہوں۔ مس حیاء؟'' اس کے منہ سے کڑوا سچ سن کر حیاء تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح آگے بڑھی اور...... زندگی کے قیمتی دنوں میں سے آج کا دن بہت قیمتی تھا کیونکہ اس نے احمد سبحانی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس نے کئی بار اس ہاتھ کو تھامنے کی کوشش کی تھی مگر وہ آج کامیاب رہی تھی۔ احمد سبحانی کا ہاتھ برف میں لگا ہوا تھا یا پھر اسے اپنے جذبات پر مکمل اختیار اور قابو تھا۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''مس حیاء!'' وہ لڑکھڑا کر گرنے لگا مگر اس نے حیاء کا سہارا لینا گوارا نہ کیا تبھی تو وہ اس سے چند قدم دور لڑھک گیا۔ ''تم نے لفظ عشق استعمال کیا ہے۔ جانتی ہو...... عشق کیا ہوتا ہے؟'' وہ حیاء کی طرف دیکھتا رہا اور حیاء اس کے سوال کے محرکات پر غور کرتی ہوئی گھنگھرو باندھنے لگی۔ ''مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا؟'' اس کی سوئی ہنوز اپنے سوال پر اٹکی ہوئی تھی وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''عشق محبوب کی اداؤں پر قربان ہو جانے کا نام ہے۔ عشق پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر ناچنے اور روٹھے یار کو منانے کا نام ہے۔'' وہ اپنی کہی گئی بات کا تاثر اس کے چہرے پر دیکھنے کے لیے رکی۔ مگر وہاں پر تاثرات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ پھر بات کو جاری رکھتی ہوئی کہنے



لگی۔ ''عشق تپتی ریت پر عاشق کو ڈھونڈنے کا نام ہے۔ عشق کان چھدوانے کا نام ہے۔ کچے گھڑے پر تیر کر چناب پار کرنے کو عشق کہتے ہیں اور مسٹر احمد سبحانی!'' اس نے پہلی بار اسے اس انداز میں مخاطب کیا تھا۔ ''عشق اپنا آپ کھو دینے کا نام ہے۔''

اس نے حیاء کی باتیں سن کر ایک جاندار قہقہہ لگایا تو حیاء کو لگا کہ اس نے آج بالکل نشہ نہیں کیا۔ یا پھر اس نے بہت زیادہ پی لی ہے۔ وہ ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی بے قابو دھڑکنوں کو اعتدال پر لا رہی تھی کہ احمد سبحانی نے مخمور انداز میں اپنی انگلی سے اس کے بالوں کی آوارہ لٹ سلجھائی تو حیاء کی روح تک اس کی تاثیر اُتر گئی۔

''مس حیاء!'' اس کا لہجہ شرابیوں جیسا اور انداز لڑکھڑاتا ہوا تھا مگر الفاظ پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ ''تم نے جو کچھ مجھے عشق کے بارے میں بتایا ہے اس میں خودنمائی ہے۔ خود پرستی ہے اور میں نے سنا ہے کہ جب تک انسان خود پرستی میں مبتلا رہتا ہے اسے خدا پرستی حاصل نہیں ہوتی۔'' حیاء کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ ایک دنیا دار شخص تھا جو شراب اور ناچ گانے کا رسیا تھا۔ اس کا مذہب سے صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ ایک مسلمان ہے۔ اس کی لڑکھڑاتی زبان سے خدا پرستی کا سن کر بادل اس زور سے گرجا کہ حیاء خوف زدہ ہو کر اس کے ساتھ سمٹ گئی۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر ہولے سے اپنے سے الگ کیا اور بولا۔

''عشق خود کو فنا کر دینے کا نام ہے۔ اس قدر فنا...... کہ فنافی اللہ ہو جاؤ۔ اس طرح کہ سر نیزے پر ہو مگر عشق کی معراج دیکھو کہ تلاوت قرآن مجید ہو رہی ہے۔ معصوم اور چند دنوں کے لعل پیاسے ہیں مگر عشق کی انتہا دیکھو کہ کافر کی بیعت نہیں کی۔ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں گرایا جاتا ہے مگر منہ سے اُف تک نہیں کی۔ اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلانے کا حکم سن کر باپ بیٹا اور ماں عشق کی معراج کو بلند رکھنے کے لیے دل و جان سے راضی ہو گئے۔ عشق تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جلتا ہوا انگارہ منہ میں رکھنے کا حکم ہے اور وہ بلا چون و چرا حکم مان رہے ہیں اور انگارہ منہ میں رکھ کر عشق کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ عشقِ بلالی تو یہ ہے کہ تپتی ریت پر ننگے بدن بلالؓ کو لٹا کر ان کے سینے پر پتھر رکھے جاتے ہیں۔ ان کی جان پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں مگر خدا کی ذات سے انکار ن بجائے وحدۂ لاشریک کا کلمہ اور بھی بلند آواز سے بلند کرتے ہیں اور جس خدا کو دیکھا بھی نہیں اس کی واحدانیت اور بندگی کی گواہی دیتے ہوئے ذرہ برابر بھی ''جھوک'' نہیں مارتے۔ عشق تو کملا جھلا بنا دیتا

ہے۔عشق سولی پر چڑھا کر بھی انالحق کی صدا لگواتا ہے۔عشق عاشق کو اس قدر تڑپا دیتا ہے کہ کائنات کا پہلا عاشق اپنے محبوب ﷺ سے معراج عشق رچانے کے لیے عرش وفرش سجا دیتا ہے۔"

احمد سبحانی کی باتوں سے عشق جھلکتا دیکھ کر حیاء کو احساس ہوا کہ وہ عشق و محبت کے معاملات کو سمجھتا ہے۔وہ بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے ہی دے گا اور اعتراف کرے گا کہ وہ بھی حیاء سے محبت کرتا ہے۔وہ حیاء کے ہر قسم کے احساسات سے بے نیاز ہو گیا تھا وہ پھر بولا۔

"عشق محمد ﷺ اور احمد کا فرق مٹا دیتا ہے۔عشق دیکھنا چاہتی ہو تو میم کا پردہ ہٹا کر دیکھو۔محمد اور احمد کے درمیان سے الف کو نکال کر دیکھو۔ایک "بشر" عرش پر نعلین سمیت جا رہا ہے تو یہ عشق کی انتہا ہے۔مگر تم نے تو ابھی ابتدا بھی نہیں دیکھی......دیکھنا چاہتی ہو تو جاؤ سیّد صبور احمد کو دیکھو......وہ مست عشق کی ابتدا ہے۔" احمد سبحانی نے نشے کی حالت میں جو دلیلیں عشق کے حق میں دی تھیں وہ یقیناً حیاء کے لیے نئی بات تھی۔وہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔وہ حیاء کو احمد صبور کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے پہلے اس سے یہ اگلوانا چاہتا تھا کہ وہ شہر اور اس بازار کی رونق کو چھوڑ کر ویرانے میں سیّد صبور احمد کی حویلی کیا لینے گئی تھی۔

"وہ جب کلام کرتے ہیں تو براہِ راست اللہ سے ہمکلام ہوتے ہیں۔یہ ہے عشق کی ابتدا......مس حیاء اور انتہا کیا ہو گی تمہاری سوچ اور خیالات سے بہت بلند......" اس نے صبور احمد کے نام کا دانہ حیاء کے سامنے ڈال دیا تھا اب وہ کس انداز میں چگتی ہے یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔یوں لگتا تھا کہ احمد سبحانی اب پوری طرح ہوش مین ہے مگر حیاء کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں وہ گھوم کر احمد سبحانی کے سامنے آ گئی۔

"میں اس مست کے پاس گئی تھی۔" احمد سبحانی کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی اس کا مقصد پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔وہ یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ حیاء اس عظمت والے گھرانے میں کیا لینے گئی تھی رات گہری اور مزید تاریک ہو گئی تھی کیونکہ ہلکی ہلکی بارش نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ آج کی رات کا چاند بادلوں میں چھپ گیا ہے۔وہ خاموشی سے سننے لگا۔"وہ تو گھرانہ ایسا ہے کہ کوئی بھی سائل وہاں سے خالی نہیں لوٹتا......مگر وہ مست اتنا کمینہ نکلا کہ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی......" ابھی حیاء کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک زوردار تھپڑ نے حیاء کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔وہ گال پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں آنسو بھرتی ہوئی احمد سبحانی کی



طرف دیکھے جا رہی تھی۔"حیاء بی بی!" وہ شیر کی مانند غرایا تو حیاء کو پہلی بار اس سے خوف محسوس ہوا۔" تم نے اس گھرانے کے چشم و چراغ پر الزام لگانے کی کوشش کی ہے جس گھرانے سے عورت کی عظمت کا تقدس بھرا سفر شروع ہوتا ہے۔وہ لوگ تو قرآن کے وارث ہیں۔" احمد سبحانی کا سارا نشہ کافور ہو گیا تھا۔وہ دھاڑ رہا تھا اور اس گھرانے کی عظمت و تقدس کے گن گاتے ہوئے اس کو حیاء حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔

"کچھ معلوم ہے تمہیں حیاء بی بی! کہ اس گھر کی عورتیں کتنی با پردہ ہیں؟ تمہیں شرم آنی چاہیے......مگر تمہیں شرم کیوں آئے گی......تم طوائف ہو نا......طوائف تو وہی ہوتی ہے جو بے شرم اور بے حیاء ہو۔نام ہی حیاء رکھ لینے سے حیاء آ نہیں جاتی۔" اس کی گونجدار آواز نے کوٹھے کے بے زبان مکینوں کو بھی حیران کر دیا تھا ان کو سوتے میں جگا دیا تھا۔وہ حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی حیرت سے حیاء کو دیکھ رہے تھے۔

"تم نے عشق کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے......تمہیں تو علم ہی نہیں کہ یہی گھرانہ عشق کی ابتدا ہے اور تم تو ابھی عشق کے "عین" کو ہی نہیں سمجھ سکی اور چلی ہو......انتہا تک......یعنی "قاف" تک بہت مشکل ہے یہ سفر مس حیاء......عین، شین، قاف کو پانا بہت مشکل۔" وہ کوٹھے کی سیڑھیاں اترنے کے لیے آگے بڑھا تو حیاء اس کے آگے دیوار بن گئی۔مگر وہ اس کو ایک طرف ہٹاتا ہوا بولا۔

"اللہ حافظ! مس حیاء! آج سے شراب، ناچ گانا سب کچھ بند......تمہیں تو عشق کی ابجد ہی معلوم نہیں......سادات گھرانے کو بھی تم نے نہیں چھوڑا......چھی۔چھی۔" اس کے لب و لہجے سے افسوس جھلک رہا تھا وہ سیڑھیاں اترتا ہوا بازار میں آ گیا۔رم جھم برسنے والی بارش نے پیہم صورت اختیار کر لی تھی۔منٹوں میں ہی اس کا وجود بارش کے پانی سے شرابور ہو گیا۔اسے آج سردی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔وہ مکمل ہوش میں تھا۔آج اس کی ٹانگیں بھی نہ لرز رہی تھیں۔وہ پیدل ہی چلا جا رہا تھا۔وہ آج قصداً گاڑی نہ لے کر آیا تھا۔

اس نے بازار کی ویرانی پر نظر ڈالی تو نگاہ گھومتی ہوئی حیاء کے کوٹھے کی بالکنی پر گئی اسے حیاء کا ہیولہ نظر آنے لگا۔آج وہ احمد کی خاطر بالکنی میں آ گئی تھی۔پھولوں والے اپنے ٹھیلے بند کر کے جا چکے تھے۔وہ بھی کسی گرم کونے کھدرے میں چھپے ہوئے سردی سے بچنے میں مصروف ہوں گے۔پان فروش اور اس بازار سے متعلقہ دیگر کاروباری لوگ بھی اپنے گھروں میں جا چھپے تھے۔

وہ سڑک کے بیچوں بیچ پانی میں شڑاپ شڑاپ کی آوازیں نکالتا ہوا بھیگتا جا رہا تھا۔ وہ ایک موڑ مڑ کر چوک میں پہنچا تو ایک رکشہ والا تیزی سے اس کی طرف رکشہ لے کر آیا اور پاس آ کر ''جانا باؤ جی'' بولا تو احمد سبحانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بارش تیز ہو رہی ہے اور آپ کے پاس تو کوئی چادر بھی نہیں ہے جی...... آ جائیں بیٹھ جائیں۔'' رکشہ ڈرائیور اس کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ رکشہ لے کر چل رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس سواری سے پوری رات کا خرچہ نکال لے۔ مگر احمد سبحانی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''جانا ہے یا مرنا چاہتے ہو؟'' وہ فوراً وہاں سے رکشہ کو تیز کر کے بھگاتا ہوا نکل گیا۔ وہ بھیگتا ہوا جا رہا تھا کہ اسے یوں لگا جیسے سڑک کے عین درمیان میں کوئی کھڑا ہے۔ وہ اسے پاگل سمجھا جو اتنی بارش میں یوں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ وہ اسے پہچان نہ پایا مگر وہ جوں جوں قریب ہوتا جا رہا تھا اس پر اس ''پاگل'' کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے اس نے غور سے دیکھا تو اس کی روح فنا ہو گئی۔ سانسیں اس قدر تیزی سے چلنے لگیں اور دھڑکنوں کی آواز وہ بخوبی سن سکتا تھا اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور ہونٹ لرزنے لگے وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

''شاہ جی آپ؟'' وہ صبور احمد کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح صبور احمد سے ڈرا نہ تھا بلکہ وہ ان کو غور سے دیکھنے لگا ان کے جسم پر ایک کمبل تھا جبکہ ایک کمبل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ کمبل احمد سبحانی کی طرف بڑھایا جو اس نے لے لیا اور اس بات پر بھی حیرت ظاہر کی کہ وہ کمبل اتنی بارش کے باوجود بھی سوکھا ہوا تھا اس پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پڑا تھا۔ تیز بارش میں احمد سبحانی کا وجود تر بتر ہو چکا تھا آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا اس نے غور کیا تو صبور احمد کے لب وا ہوئے۔

''اچھے کام کرنے کے لیے دولت اور اقتدار کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اچھا دل اور مستقل ارادہ ہی اچھے کام کی بنیاد ہوتا ہے۔'' احمد سبحانی نے کمبل اپنے جسم پر اوڑھ لیا تو اسے یک دم محسوس ہوا کہ وہ اس سائبان تلے پناہ لے چکا ہے جو واٹر پروف ہے۔ بلکہ اسے کمبل کے اندر حدت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو۔'' صبور احمد کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''بلکہ یہ پوچھوں گا کہ اب کدھر جانے کا ارادہ ہے؟'' وہ حیرت سے اس سوال کی گہرائی سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''میں...... گھر جا رہا ہوں...... شاہ جی!'' وہ ان الفاظ کو بمشکل ادا کر سکا تھا۔



''وہ اوپر بیٹھا ہوا مالک جو کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ ایک قدم اس کی طرف بڑھو وہ دس رحمتوں کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہوتا ہے۔'' صبور احمد اور احمد سبحانی اس وقت اس سڑک پر کھڑے تھے جہاں عام طور پر بھی ٹریفک کم ہوتا ہے اور اس وقت تو بارش ہو رہی تھی اور پھر رات کا پچھلا پہر بھی تھا۔ وہ دونوں بارش کی تیزی سے بے خبر سڑک کے درمیان کھڑے تھے۔ ''تم نے اپنا پہلا قدم اس کی طرف بڑھا دیا ہے۔ اب پیچھے ہٹنے کی کوشش نہ کرنا......'' وہ یہ کہہ کر ایک طرف کو چل پڑے۔ جبکہ احمد سبحانی ان کی بات پر غور کرنے لگا۔

ہر طرف سیاہ اندھیرے کی چادر تنی ہوئی تھی اور وہ رات کے اس پہر تن تنہا کھڑا تھا جب اسے احساس ہوا تو وہ لرز کر رہ گیا۔ وہ گھر کی جانب چل پڑا۔ بارش کی تیزی اب کم ہو گئی تھی جبکہ کمبل نے اس کو بھیگنے سے بچا لیا تھا اور جسم اور بدن کو کافی حرارت بھی مہیا کی تھی۔

اس نے گھر پہنچ کر کمرے کا ہیٹر آن کیا اور کمبل اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس کی چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی۔ کیونکہ اس نے کمبل کو بالکل خشک پایا تھا۔ وہ اپنی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کمبل کو اتار کر جگہ جگہ سے ٹٹول رہا تھا مگر اس کی حیرت بدستور قائم تھی کیونکہ پورا کمبل بالکل خشک تھا۔

وہ آج کے پہلے واقعہ پر ہی حیران تھا کہ اس نے حیاء کو تھپڑ کیوں مار دیا وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ مگر پھر اس کے دل کی آواز آئی کہ حیاء نے سادات کی توہین کی تھی اور وہ اس توہین کو برداشت نہ کر پایا تھا۔ اس کا جذباتی ہونا فطری عمل تھا کیونکہ حاکم علی شاہ کی زبانی وہ اس عظمت والے گھرانے کی بہت تعریف اور عظمت سن چکا تھا۔ حیاء نے صبور احمد پر ایک انتہائی گھٹیا الزام لگانے کی کوشش کی تھی۔

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر پلکیں اس قدر بوجھل ہونے لگی تھیں گویا ان پر منوں وزن لاد دیا گیا ہو۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو سامنے وہی منظر آ کر اس کو ستانے لگتا جب اس نے حیاء کو تھپڑ مارا تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی کہ صبور احمد کی وکالت کرتا...... نہیں...... نہیں...... اس بے حیا نے سادات گھرانے کے ایک عظیم چراغ کو اپنی گندی پھونک سے بجھانے کی کوشش کی تھی...... یک دم اسے ایک قہقہے کا احساس ہوا جو ہو بہو اسی کا تھا۔ اس کے بالکل سامنے ایک اور احمد سبحانی آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جو اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' احمد سبحانی نے خوف سے پوچھا تو وہ قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

''میں......تم ہوں...... مجھ سے کیسے پیچھا چھڑاؤ گے؟ تمہارا دوست ہوں۔ راز دار ہوں۔ رفیق ہوں۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا گیا تو احمد سبحانی کو غصہ چڑھنے لگا۔

''کون سے راز ہیں تمہارے پاس جنہیں میں بھی نہیں جانتا؟'' احمد سبحانی بولا تو وہ مسکرانے لگا۔

''تم شرابی ہو۔'' اس بات پر احمد سبحانی کا قہقہہ بلند ہوا۔

''میں آج سے شراب چھوڑ چکا ہوں۔''

''لیکن...... زندہ کیسے رہو گے؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینکنے کی کوشش کی۔

''جو چیز میرے مذہب میں حرام اور ممنوع ہے۔ میرا اس سے آج کے بعد کوئی تعلق نہیں ہے۔'' جواب میں وہی جاندار قہقہہ سن کر احمد سبحانی بھڑکنا چاہتا تھا مگر وہ تحمل مزاجی سے اس ''راز دار'' کو قائل کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ وہ پُرسکون ہو گیا تو اندر کا راز دار بولا۔

''گزشتہ پچیس سالوں میں آج ہی مذہب کی یاد کیسے آ گئی؟''

''سچ پوچھو تو مجھے حاکم علی شاہ صاحب کی باتوں نے مذہب کے قریب کیا ہے اور سادات گھرانے کی عظمت نے مذہب میری روح میں پھونک دیا ہے۔'' وہ قہقہہ لگاتا ہوا کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ احمد سبحانی غصے سے بھڑکتا ہوا بولا۔ ''مجھے بہکانے کی کوشش مت کرنا...... میں شراب نہیں پیوں گا...... مر جاؤں گا...... مگر تم بھی میرے پختہ ارادہ کو دیکھو گے...... میں بھی شراب نہیں پیوں گا...... مجھے آزما لینا...... مجھے مت بہکاؤ...... دفع ہو جاؤ......'' اندر کا راز دار رفیق یک دم ختم ہو گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں حرارت بڑھ رہی ہے۔ اس نے ہیٹر بند کر کے صبور احمد کا دیا ہوا کمبل اوڑھ لیا اور آج کی کارروائی سے جان چھڑانے کے لیے کروٹیں لینے لگا...... کافی دیر بعد اس پر نیند کی دیوی مہربان ہوئی تو وہ سو گیا...... مگر قسمت جاگ گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ ایک قبرستان میں کھڑا ہے۔ صاف ستھری اور طریقے سے بنی ہوئی قبریں اور قبرستان بہت ہی صاف ستھرا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کے تھیلے سے دانہ نکال کر قبرستان میں بیٹھے ہوئے خوبصورت کبوتروں کو ڈالنے لگا۔ کبوتر خوشی خوشی اس کا پھینکا ہوا دانہ کھانے لگے۔ وہ حیرانگی سے اس جگہ کو بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گیا...... ابھی اس کی حیرت کم نہ ہوئی تھی کہ سامنے سے ایک شخص چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا



تھا۔ وہ کبوتروں کو دانہ ڈالنا بھول کر اس شخص کو دیکھنے لگا۔ وہ پاس پہنچا تو احمد سبحانی نے اسے پہچان لیا وہ صبور احمد تھے۔ ان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔ ان کے کندھے پر وہی نارنجی چونچ والا کبوتر تھا جو ان کی حویلی میں موجود تھا۔

''تم نے ہمارے گھرانے کی طرف ایک اچھا قدم بڑھا کر آغاز کر لیا ہے...... مگر آقا ﷺ کی محبت اور عشق پانے کے لیے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح پانی نیچی جگہ کی جانب رواں ہوتا ہے۔'' احمد سبحانی ان کی باتیں غور سے سننے لگا۔ ''تمہارا ارادہ ہی تمہارا امتحان ہو گا...... اب زندگی میں کبھی بھی کیسا ہی موقع کیوں نہ آئے شراب مت پینا...... جس جگہ تم کھڑے ہو...... یہاں سے چند قدم ہی دور وہ جگہ ہے جس کی تمنا ایک سچا عاشق کرتا ہے اور اس مقدس جگہ تک پہنچنے کے لیے دن رات آنسو بہاتا ہے...... ابھی تو آغاز ہے کہ تم مقدر کی یاوری دیکھو کہ جنت البقیع کے قبرستان میں پہنچ گئے ہو۔ آزمائشوں سے نبرد آزما ہو جاؤ...... پھر تمہارے قدم یہاں سے آگے کی جانب اٹھیں گے...... دیکھنا یہ ہے کہ تم اس کبوتر کے عشق کو مات دیتے ہو...... یا پھر یہ بے زبان تمہارے عشق کو شکست دے کر اس گنبد خضریٰ تک پہنچتا ہے...... تم دونوں کی منزل یہی ہے...... ذرا نگاہ اٹھا کر تو دیکھو کہ تمہارے عشق کی ابتدا پر ہی تمہیں خداوند کریم نے کون سی منزل تعین کی ہے۔'' صبور احمد کا اشارہ پا کر کبوتر اور احمد سبحانی کی نظریں اسی جانب اٹھیں تو دور ایک چھوٹا سا جنگلہ نما دیوار پار کرتی ہوئی نظر جب سامنے گنبد خضریٰ سے ٹکرائی تو دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ سانس لینا بھول گئے تھے۔ تیز اور نورانی روشنی میں نہایا ہوا گنبد خضریٰ انہیں اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ کبوتر نے تڑپ کر صبور احمد کے کندھے سے اُڑنا چاہا مگر وہیں پھڑ پھڑا کر رہ گیا...... جبکہ احمد سبحانی کی حالت بھی ایسی تھی کہ بن پانی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا تو قدم من من کے ہو گئے۔ اسے یوں لگا کہ اس کے پاؤں جنت البقیع کی مٹی نے جکڑ لیے ہوں۔ کبوتر کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ صبور احمد نے اس کے پر کاٹ دیئے ہوں۔ وہ بے بسی سے کبھی صبور احمد اور کبھی دل و جان کو تسکین پہنچانے والے گنبد خضریٰ کو دیکھنے لگے۔ اپنی بے بسی پر ان کی آنکھیں برسنے لگیں وہ اونچی آواز میں رونے لگا...... پھر اس کی پکار گونجی۔

''مجھے اپنے دَر پر بلاؤ آقا ﷺ جی...... آقا ﷺ جی...... مجھے در پر بلائیں...... پیارے آقا ﷺ...... لجپال آقا ﷺ...... میرے گناہوں سے میری جان چھڑائیں...... خدا

سے مجھے معافی دلا دیں...... میری سفارش کر دیں...... مجھے در پر بلائیں......'' اس کی چیخ وپکار بڑھنے لگی تو صبور احمد ایک جانب چل پڑا۔ اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا کبوتر بھی رو رو کر کہہ رہا تھا۔'' میں بے بس ہوں۔ میرے پر کسی کام کے نہیں ہیں...... پیارے مدنی آقا ﷺ مجھے اس پُرامن شہر میں داخلے کی اجازت دے دیں۔ مہربانی کریں سرکار ﷺ...... میرا مان رکھ لیں...... میں اپنے عشق کو شک سے پاکیزہ کرنا چاہتا ہوں......'' اس کی آواز بھی صبور احمد کے ساتھ ہی دور ہو گئی تو احمد سبحانی کی دل کو لرزا دینے والی آواز نے صبور احمد کا پیچھا کیا۔

'' مجھے بتا دیں شاہ جی!...... مجھے کیا کرنا ہوگا...... میں اس نورانی گنبد کو اپنی پلکوں سے بوسے دینا چاہتا ہوں۔ میں اس سبز گنبد کو چومنا چاہتا ہوں...... میری مدد کریں...... میری رہنمائی کریں شاہ جی...... میں کمزور اور بے بس ہوں۔'' اس کی قمیص کا کالر تر ہو چکا تھا۔ آنسو بے حساب تھے جو اس کی قمیص میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر گھٹنوں کے بل دو زانو ہو گیا۔ اس کی جبیں رب واحد کی بارگاہ میں جھک گئی۔ اللہ کے حضور التجائیں بڑھنے لگیں۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ دعائیں لرزتے ہونٹوں سے ادا ہونے لگیں۔ آنکھیں سرخ یاقوت کی طرح ہو گئیں مگر وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔

'' میں سب کچھ کروں گا...... میں شراب نہیں پیوں گا...... میں گنبد خضریٰ تک پہنچوں گا...... میں آؤں گا آقا ﷺ...... میں آپ کی مقدس و معطر چوکھٹ کو بوسہ دینے کے لیے آؤں گا...... ہر وہ کام کروں گا جو میرا امتحان ہوگا......'' اس کی گریہ زاری بڑھ گئی تھی اور اس کے سرہانے کھڑے سعید علی اور زویا بیگم حیران تھے مگر وہ اس بات سے انجان تھے کہ ان کا شرابی اور آوارہ بیٹا اس وقت کہاں کھڑا ہے اور اس نے اہل بیت سے اپنی محبت کا اظہار کر کے کتنا بڑا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔

☆=======☆=======☆

'' مجھے اجازت دیجیے شاہ جی!'' منو نے صبور احمد سے التجا کی تو وہ پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ پھر ملتمس ہوا۔ '' میری پشت پر اپنی نظر کرم کا سہارا رکھنا۔ میرا سفر کٹھن اور خطرناک ہے اور میں بے بس پرندہ ہوں۔'' شاہ جی نے اس کی چونچ پر ہاتھ پھیرا اور گویا ہوئے۔

'' منو! عشق تین حروف سے مل کر بنتا ہے۔ ان تینوں میں سے اگر ایک بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو عشق میں جو دراڑ پڑتی ہے اس دراڑ کو دنیا بھر کے الفاظ بھی بھر نہیں سکتے۔'' منو نے سمجھنے



والے انداز میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ صبور احمد اپنی پیاری۔ میٹھی اور حکمت بھری باتوں سے اس کے لیے زادِ راہ پیدا کر دیں وہ صبور احمد کی طرف جی جان سے متوجہ تھا۔ '' تم بے بس اور کمزور نہیں ہو۔ تمہاری تاریخ بہت پرانی ہے۔ جب دشمنوں نے نبی کریم محمد ﷺ کو تنگ کیا تو آپ ﷺ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ غار ثور میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ ابوجہل اور اس کے دوسرے کفار ساتھی ان کو ڈھونڈتے ہوئے غار ثور تک پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ غار کے منہ پر مکڑی نے اپنا جال بنا ہوا تھا اور کبوتری نے انڈے دیئے ہوئے تھے۔ تمہاری نسل تب سے آج تک ہم سے اور ہمارے اجداد سے عشق کرتی آ رہی ہے مگر منو...... تم نے جو عشق کو احترام بخشا ہے وہ رب کریم کو بے انتہا پسند آیا ہے۔'' صبور احمد کی زبانی اپنی تاریخ سن کر منو زار و زار رونے لگا بس اس کی چیخیں اور گریہ زاری انسانوں کی طرح دکھاوا نہ تھا۔ بلکہ وہ فخریہ انداز سے آنسو بہا رہا تھا اور ان آنسوؤں کی قدر صبور احمد جانتے تھے۔

'' منو!'' صبور احمد پھر بولے۔ '' اگر لوگ ہمیں عشق کا عین قرار دیتے ہیں تو یہ ان لوگوں کی محبت ہے جو اپنی کتب میں ہمیں خراج پیش کرتے ہیں۔ مگر جو لوگ حب الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں۔ اپنا آپ اللہ کی راہ میں تیاگ دیتے ہیں۔ ان کو ہر سمت اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے وہ بھوک پیاس سے یکسر بے نیاز ہو جاتے ہیں تو ایک دن اللہ تعالیٰ ان کی اداؤں کا صلہ انہیں جس انداز میں دیتا ہے وہ دراصل عشق الٰہی کی ابتدا ہوتی ہے حقیقت میں وہی عشق کا عین ہوتا ہے۔'' شاہ جی خاموش ہوئے تو منو بے چینی سے بولا۔

'' شاہ جی آپ سے بہتر اس کائنات میں اللہ کی حمد و ثنا کون کر سکتا ہے؟'' صبور احمد مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ '' اللہ تعالیٰ کا عشق لامحدود ہے اس کی کوئی حد یا قید نہیں ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی وحدانیت بیان کرتا ہے۔ تم لوگ یعنی پرندے انسانوں سے پہلے بیدار ہو جاتے ہو۔ مرغ رات کو ہی اذان دے کر اس رب کریم کی ثنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ تو ایسا بحر عشق ہے جس کا دوسرا کنارہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایک ہی خاندان یا ایک ہی شخص پر مہربان ہو کر اسے درجات عطا نہیں کرتا۔ وہ چاہے تو زمین پر رینگنے والی چیونٹیوں کو بھی عشق کی ابجد سے روشناس کروا دے۔ ہم تو پھر انسان ہیں۔ جب تم شہر محبوب ﷺ خدا کی جانب سفر کرو گے تو تمہیں وہ بہت سے بہروپوں اور روپوں میں اپنا آپ دکھائے گا۔ وہ کل کائنات کا مالک ہے تمہیں اس کے عاشق اور منکر بھی ملیں گے۔ اس کی حمد و ثنا کرتے ہوئے اس کو تلاش

کرتے ہوئے بہت سے غیر مسلم بھی ملیں گے جو اپنا دین دھرم تیاگ چکے ہیں۔ بس یہ سمجھ لینا کہ وہ بھی سب عاشق ہیں مگر ان کو عشق کا درجہ صرف اسی صورت ملتا ہے جب وہ اس کے محبوب ﷺ کی اطاعت کریں گے۔ اُس نے اپنے عشق کو اپنے محبوب ﷺ کی اطاعت اور محبت سے مشروط کر دیا ہے۔ وہ خالقِ کائنات اس دکھاوے کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی اطاعت اور محبت میں تو کھویا رہے مگر اس کے محبوب ﷺ کی سنتوں، احادیث اور اعمال پر عمل نہ کرے وہ عاشق نہیں محض ڈھونگ ہے۔''

منو کو بہت کچھ مل گیا تھا مگر ابھی تک اس کی تشنگی برقرار تھی وہ بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ صبح صبح ہی اس نے صبور احمد سے اجازت لے کر اس حویلی سے اُڑان بھرنے کی ٹھانی تھی مگر صبور احمد کی اجازت ضروری تھی۔ اب وہ ان کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا کیونکہ یہ اس کے لیے زادِ راہ بھی تھیں اور آخرت کے لیے مشعلِ راہ بھی۔

''منو! آج کی رات ٹھہر جاؤ...... میں تمہیں عشق کے درجات سے ملوانے کی کوشش کروں گا۔ ''عین، شین، قاف'' یہ عشق کے وہ درجات ہیں جو انسانوں میں ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر جاندار اور بے جان چیزوں میں اللہ نے تقسیم کیے ہیں۔ بس عشق کی کسوٹی پر وہ پرکھتا ہے...... یہ مجھ جیسا گناہگار بھی نہیں جانتا کہ وہ کون سا پیمانہ ہے جس کی بنا پر وہ عشق کی سندیں بانٹتا ہے۔'' صبور احمد خاموش ہوئے تو منو بول پڑا۔

''مگر شاہ جی! آپ بھی تو عین ہیں۔'' صبور احمد کے ہونٹوں پر کرب کی ایک پتلی سی لکیر بن گئی۔

''تم نے بہت گہری بات پوچھ لی ہے منو!'' صبور احمد یہ کہہ کر خاموش ہوئے تو منو کی بے چینی بڑھنے لگی وہ اُڑان بھر کر شاہ جی کے کندھوں سے پاؤں میں آ گیا۔ اس نے اپنا سر ان کے قدموں میں اس طرح ڈال دیا کہ وہ اپنے سوال پر نادم ہو گیا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ شاہ جی نے اسے نیچے بیٹھ کر اٹھایا اور پیار سے اس کے ننھے سے وجود پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''منو! اس دنیا میں کبھی بھی کسی کی جگہ خالی نہیں رہی۔ جب کوئی چلا جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا آ جاتا ہے۔ وہ بڑا بے نیاز ہے۔ وہ رنگ، نسل، روپ اور خاندان دیکھ کر درجات کی بانٹ نہیں کرتا۔ بس اس کو کسی نہ کسی کی ادا بھا جاتی ہے تو وہ اس کی ڈیوٹی لگا دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ''نوکر'' کتنا مخلص ہو کر اس کے احکامات کی تکمیل کرتا ہے اور نوکر تو وہ ہوتا ہے جو مالک کے حکم پر ''ناں'' نہ کرے۔''



منو کی سمجھ میں پتہ نہیں ان کی یہ بات آئی تھی یا نہیں مگر وہ صبور احمد کے لہجے کی اداسی دیکھ کر خود بھی غمزدہ ہو گیا تھا۔ ''میں مستقبل کے عاشقوں سے ملنا چاہتا ہوں شاہ جی!'' منو ان کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑایا۔ ''میں ان کی عظمت کو سلام کروں گا...... میں اپنے آقا ﷺ تک اپنا سلام ان کے ذریعے پہنچاؤں گا...... میں کہوں گا...... میں کہوں گا آقا ﷺ جی...... آقا ﷺ جی...... مجھے بھی اپنے ادنیٰ غلاموں میں شمار کر لیں...... میں حقیر اور بے بس پرندہ ہوں...... میری گستاخی دیکھیے کہ دل کتنی اونچی جگہ پر ہار گیا ہوں...... آقا ﷺ جی...... میں خطاوار، مجرم اور گناہگار ہوں...... مگر آپ تو ''رحمتہ للعلمین'' ہیں۔'' منو کی گریہ زاری عروج پر پہنچ گئی اور صبور احمد کی آنکھیں بھی چھلکنے لگیں تو انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ صبور احمد نے اسے پیار سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ دلاسہ دیا۔ محبت سے پچکارا۔ اس کی اداسی اور غمگینی کا اندازہ صرف صبور احمد ہی کر سکتے تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت عطا کی تھی کہ وہ پرندوں اور جانوروں سے بھی باتیں کر لیتے تھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان دونوں کے علاوہ بھی کوئی ان کے پاس ہے۔ صبور احمد نے آنکھیں کھولیں تو سامنے کھڑی حیاء کو دیکھ کر لبوں پر مسکان سجاتے ہوئے بولے۔

''جو چیز پردہ میں ہو گی اس کی قیمت بڑھ جائے گی...... تم نے احمد سبحانی سے اپنے عشق کا واویلا مچا کر عشق کو ننگا کر دیا۔''

منو بھی چونک کر پہلے حیاء اور پھر صبور احمد کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے آپ کے حکم پر آپ پر گھٹیا الزام لگا کر بہت بڑا گناہ کیا ہے...... مجھے معاف کر دیجیے شاہ جی!'' حیاء کے لہجے میں درخواست تھی جبکہ صبور احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

''تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو احمد سبحانی کی آزمائش میرے نام اور تمہاری ذات سے ہی مقصود تھی۔'' حیاء کی آنکھیں بھر آئیں وہ نم لہجے میں ملتمس ہوئی۔ ''مگر مجھے احمد سبحانی سے اپنا عشق اس انداز میں نہیں مانگنا چاہیے تھا۔''

''میں نے کہا تھا کہ وہ ہمارا ہے...... بس ہمارا......''

''مگر میرا کاسہ تو خالی ہی رہا ناں'' اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ صبور احمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہیں بھی نوازے گا...... وہ خدا ہے لینا اور دینا جانتا ہے۔''

''مگر میرے لیے دعا کریں۔'' آپ رب تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں...... مجھے میری

پہچان مل جائے تاکہ میں اس کام کو چھوڑ دوں۔

"وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے......تم اپنی ماں سے پوچھو......وہ بہتر جانتی ہے کہ تم کس کی بیٹی ہو؟" صبور احمد بولے تو حیاء تڑپ کر رہ گئی۔

"اس نے تو مجھے اس جہنم میں دھکیلا ہے...... وہ تو مجھے اپنے مذہب کے راستوں پر چلانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے بغاوت کر دی اور مسلمان ہو گئی......اب اس کی خواہش پر ناچنا گانا میری مجبوری بن گیا ہے۔ آپ ہی کچھ کریں شاہ جی!" منو کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا وہ غٹرغوں کرتا ہوا کبھی حیاء اور کبھی صبور احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صبور احمد کچھ دیر سوچتے ہوئے بولے۔ "جاؤ......اللہ پاک مہربانی کرے گا۔"

"مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے شاہ جی!" حیاء خوفزدہ لگتی تھی۔

"مگر مسلمان تو صرف خدا سے ہی ڈرتا ہے۔ سختیاں اور تنگیاں جھیل کر اس کی ذات پر شاکر و صابر رہنا ہی مسلمان کی معراج ہے۔ اس سے پتہ کرو کہ تمہارا باپ کون ہے؟ باقی معاملات اللہ پر چھوڑ دو۔" صبور احمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اجازت دی۔ حیاء چلی گئی تو انہوں نے منو کو ہوا میں چھوڑ دیا وہ ایک منڈیر پر جا کر بیٹھ گیا۔

☆=======☆=======☆

صبور احمد اپنی ہی لے میں جھومتا جھامتا جا رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی لگی تھی کہ وہ اس علاقے سے عشق کو ایک جگہ اکٹھا کرے۔ کیونکہ اس افراتفری کے عالم میں الیکٹرونک میڈیا کی تباہ کاریوں اور ہمسایہ ممالک کے اسلام مخالف پراپیگنڈے نے نئی نسل کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات سے دور کر دیا تھا۔

اس علاقہ سے تین حروف اکٹھے کرنے کے لیے بدنام کرداروں کو چنا گیا تھا۔ ان میں سے ایک بے زبان منو تھا جس کا خاندان ولیوں کے مزارات پر دانہ دنکا چگتا تھا اور انہی کے گنبدوں پر بیٹھ کر گندگی پھیلاتا تھا۔ مگر ان میں سے منو کو یہ بات سمجھائی گئی کہ عشق اس چیز کے خلاف ہے۔ اس نے بغاوت کر دی اور عشق کو شہادت دی کہ وہ اس خاندان کی کسی بھی پرانی روایت کا حلیف نہیں بن سکتا تو اسے شین کا درجہ مل گیا۔

اللہ کی اطاعت رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ اس مفہوم پر عمل کراتے ہوئے شرابی احمد سجانی کو چنا گیا۔ اس کے گھر کا پچیس سال پرانا ملازم آلِ رسول کا چشم و چراغ تھا اللہ کی حکمت تھی کہ انہوں نے اپنا راز پوشیدہ رکھا وہ احمد سجانی کے توسط سے یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا



سعید علی اور اس کا خاندان سادات کی خدمت و عظمت میں اپنی دولت پر غرور تو نہیں کر رہا۔ مگر جب سیّد حاکم علی کا راز کھلا تو شرابی احمد سجانی سب سے زیادہ ان کی خاندانی شخصیت سے متاثر ہوا۔ اس کا معمول تھا کہ شراب پی کر روزانہ طوائف کا مجرہ سننا، لیکن اس کی آزمائش اس طرح لی گئی کہ طوائف کے منہ سے سادات کے خلاف پوری بات سننے سے پہلے ہی احمد سجانی تڑپ کر رہ گیا اور اس نے طوائف کو تھپڑ اس لیے مار دیا کہ وہ سادات گھرانے کی عظمت کا دل و جان سے قائل ہو چکا تھا اور اس اعلیٰ خاندان کے خلاف کوئی بھی بات سننا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ وہ شراب اور شباب چھوڑنے کا پختہ ارادہ کر کے طوائف کے کوٹھے سے اترا تھا۔ ربِ کریم کو اس کی یہی ادا بھا گئی اور اسے جنت البقیع میں لے جا کر کھڑا کر دیا اور "عین" کے لقب سے نوازا گیا۔

مگر صبور احمد کی سمجھ سے بالاتر کردار حیاء تھا کہ اسے کیوں چنا گیا ہے۔ کیونکہ وہ ایک طوائف زادی تھی اور اس کی طوائف ماں غیر مسلم تھی مگر اس نے خاندان سے بغاوت کر کے مسلمان ہو کر زندگی گزارنے کو ترجیح دی مگر اس کی بغاوت پر خاندان نے یہ فیصلہ سنایا کہ وہ آج سے اپنا کاروبار اکیلی کرے گی اور ہم اس کے باپ کا نام پتہ بھی اسے نہیں بتائیں گے۔ مگر صبور احمد کے لیے یہ کوئی بڑا معرکہ نہ تھا۔ طوائفوں کی اکثر یہی لڑائی ہوتی ہے کہ ان کے باپ کون ہیں مگر نائیکہ نے آج تک اس راز کو راز ہی رکھا تاکہ خاندان میں بغاوت نہ پھیل سکے۔

حیاء کو کس لیے چنا گیا تھا وہ رب کریم کی اس انوکھی اور نرالی منطق پر حیران و پریشان بازار میں گھوم رہا تھا کہ بڑے بڑے خطرناک جسموں والے غنڈوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کی گھبراہٹ لازمی امر تھا کیونکہ وہ خطرناک ارادوں سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پہلے تو صبور احمد سمجھا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے اس نے مڑ کر دیکھا تو بازار خالی ہو چکا تھا۔ اس کی طرف بڑھنے والے غنڈوں میں سے ایک اس کے سر پر پہنچ گیا تو صبور احمد نے دوڑ لگا دی۔

مگر آگے سے آنے والے غنڈوں نے اسے گھیر کر نیچے گرا لیا اور فلمی انداز میں ان کے گرد قہقہے لگانے لگے۔ صورتِ حال فلموں سے بالکل مختلف تھی کیونکہ ان غنڈوں کے درمیان "رضیہ" نہ تھی بلکہ سیّد زادہ تھا۔ وہ حیرانگی سے ان کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "تمہاری میرے ساتھ کیا دشمنی ہے؟ بھائی صاحب! آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"غلط فہمی؟" ان میں سے ایک دھاڑتا ہوا بولا۔ "تم نے ہمارے کاروبار کا بیڑہ غرق کر

دیا ہے۔'' اس بار صبور احمد کی حیرانگی دو چند ہو گئی۔

''میں آپ کو نہیں جانتا تو پھر کاروبار کو کیسے جانوں گا اور آپ لوگوں کے کاروبار سے میرا کیا تعلق؟'' صبور احمد عاجزی سے بولے تو ان بدمعاشوں کو اور ہلا شیری مل گئی۔

''اوئے! تمہاری یہ مستا مستی یہاں نہیں چلے گی۔ خود کو مست بھی کہتے ہو اور بات پوری سن کر پورا جواب بھی دیتے ہو۔'' اس نے آگے بڑھ کر صبور احمد کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا تو وہ سہم گئے۔ ''لے چلو اس کو اس کی مستی میڈم خود ہی نکالے گی اور یہ جو اسلام کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ ان کی غیرت اور عزت کا جنازہ بھی نکلے گا۔'' آخری الفاظ میں جو زہر بھرا ہوا تھا وہ صبور احمد نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ انہوں نے ہمت کر کے اٹھتے ہوئے ایک غنڈے کے ناک پر زوردار سر کی ٹکر ماری تو وہ تڑپ کر دوہرا ہو گیا۔ ان کو توقع بھی نہ تھی کہ بکری کی طرح منمنانے والا یہ صبور احمد اتنا پھرتیلا اور چالاک ہو گا۔ ٹکر کھانے والے بدمعاش کے ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی وہ منہ پر ہاتھ رکھے چیخ و پکار کر رہا تھا۔ اس کے منہ اور ناک سے بہتا ہوا خون دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی کچھ خوفزدہ ہو گئے مگر زخمی بدمعاش نے چیخ چیخ کر ان کو حکم دینا شروع کر دیا۔

''اسے مارو...... اتنا مارو کہ اس کی ساری مستی باہر نکل آئے۔'' اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے باقی بدمعاشوں نے صبور احمد کو لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ مگر اس بھرے بازار سے کوئی بھی ان کی مدد کو نہ آیا تھا۔ اس بازار پر ان بدمعاشوں کی دہشت اور خوف چھایا ہوا تھا۔ صبور احمد تو ان کو نہ جانتے تھے شاید بازار والے ان بدمعاشوں کے کارناموں سے اچھی طرح واقف تھے اسی لیے کسی نے بھی مداخلت کرنے کی جرأت نہ کی۔ مار کھا کر صبور احمد بے ہوش ہو کر گر پڑے تو ان غنڈوں نے اٹھا کر انہیں ایک گاڑی میں ڈالا اور نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔

☆=======☆=======☆

صبور احمد کو چند دنوں سے اپنے سینے پر جو تکلیف محسوس ہو رہی تھی وہ خوفناک پھوڑے کی شکل میں سینے پر اُبھر آئی تھی اس تکلیف اور چلتی ہوئی گاڑی میں ہوا لگنے کی وجہ سے صبور احمد کو ہوش آ گیا اور جس جگہ جا کر گاڑی رکی وہ جگہ اس کے لیے نئی نہ تھی وہ تیز بارش میں صرف ایک ہی بار حیاء سے ملنے کے لیے اس بازار میں آ چکے تھے۔ وہ حیرانگی سے بازار کے اردگرد دیکھنے لگے۔ طبلوں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے ان کی روح کو زخمی کرنا شروع



کر دیا تھا۔ وہ چکرا کر ایک بار پھر گرنے ہی لگے تھے کہ ایک غنڈے نے انہیں بازو سے پکڑ کر گاڑی سے نیچے اتارا اور گھسیٹتے ہوئے ایک کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

صبور احمد ان غنڈوں کے شکنجہ سے نکلنے کی تگ ودو میں مصروف تھے اور غنڈے ان پر اپنے ہاتھ سیدھے کر رہے تھے۔ کیونکہ صبور احمد نے ان کے ایک ساتھی کو زخمی کر دیا تھا۔ جس طرح کسی بڑی مچھلی کو سمندر سے پکڑ کر یا نکال کر جہاز کے عرشہ پر پھینک دیا جاتا ہے کہ وہ تڑپ تڑپ کر خود ہی پانی کی جدائی سے مر جائے گی۔ اسی طرح صبور احمد کو بھی گڈی بائی کے کوٹھے پر قیمتی قالین پر پھینک دیا گیا تھا۔ وہ حیرانگی سے اردگرد کے ماحول کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ یہ غنڈے ان سے کیا چاہتے ہیں اور اس جگہ لانے کا ان کا کیا مقصد ہے؟

سازندے اپنے کام پر ہائی الرٹ تھے۔ کوئی بھی تماش بین یا طوائف نہ تھی کوئی مجرا کرنے والی نہ تھی اور نہ ہی کوئی طوائف کی اداؤں پر لٹو ہونے والا تماش بین تھا۔ پھر یہ سازندے ہائی الرٹ کیوں تھے۔ وہ انہی سوچوں میں غرق تھے کہ بڑے ہال کا دروازہ کھلا اور ایک کمینی صورت والی نائیکہ جس کے بدن پر برائے نام ہی لباس تھا برآمد ہوئی۔ وہ چلتی ہوئی صبور احمد کی طرف بڑھنے لگی۔ صبور احمد اللہ لوک تھے مگر وہ اس عورت کے ارادوں سے بھانپ گئے کہ یہ بدکاری پر آمادہ ہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگی۔

یہی تو اس ربِ رحیم کی آزمائش ہوتی ہے وہ یوسف علیہ السلام کو بھی عورت کے وار سے بچانے کے لیے ان کا ظرف دیکھتا رہا تو یوسف علیہ السلام بھی اللہ کی رحمت اور مدد سے زلیخا کے کاری ''وار'' سے بچ نکلے تھے۔

صبور احمد کو یوسف علیہ السلام کا قصہ یاد آنے لگا تھا۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں کو اللہ کی مدد کے لیے متحرک کر دیا اور اپنی آنکھیں شرم وحیاء سے بند کر لیں۔ مگر دوسرے ہی لمحہ نائیکہ کی کرخت آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ جو اپنے کسی کارندے کو حکم دے رہی تھی۔

''اس کے بدن پر جتنے بھی کپڑے ہیں سبھی اتار دو اور تم لوگ ساز بجا کر اس مست کی مستی کا تماشہ دیکھو۔'' آخری فقرہ اس نے ان سازندوں سے کہا تھا جو الرٹ تھے۔ گویا ان کی بے عزتی کا پورا پروگرام پہلے سے ہی تیار تھا۔ وہ اپنے بارے میں سن کر غصے سے کانپنے لگے۔ بچپن میں وہ کبھی کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ پھر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی والد حاکم علی شاہ صاحب کے سخت حکم کی بنا پر کبھی بھی بے پیرہن نہ گھومے تھے۔ مگر اب ان کو اس عورت کے

رویے اور لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس طرح کپڑے اتارنے میں خدا راضی نہیں بلکہ ناراض ہی ناراض ہے۔

''شاہ جی!'' وہ صبور احمد کے اتنا قریب ہو گئی کہ وہ اس کی سانسیں بخوبی محسوس کر سکتے تھے۔ وہ اپنے تئیں کافی حد تک سکڑ گئے۔ مگر نائیکہ نے ان کی گردن پکڑ کر اپنے کافی قریب کر لیا تو شراب کا ایک بھبھوکا صبور احمد کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ انہوں نے کراہت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھیں۔ دل تڑپ کر باہر آنے کی کوشش میں پسلیوں کے زندان سے نبرد آزما تھا مگر پھوڑہ بھی ابلنے کو بے تاب ہو کر ان کی تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔

مگر اس لمحہ خود پر قابو رکھ کر اس گناہ کی پڑیا سے چھٹکارہ ہی اولین ترجیح تھی۔ ''کیا کہتے ہو حیاء سے؟'' نائیکہ کی آواز آنے لگی تو صبور احمد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کہ اپنے باپ کا پتہ کرو...... میں نہیں بتاؤں گی...... اس کے باپ کا پتہ......'' وہ بھونکنے لگی تو صبور احمد حیرانگی سے دیکھنے لگے۔ ''میں اس کی ماں ہوں......'' اس بات پر صبور احمد کی حیرت دو چند ہو گئی۔

''تو یہ ہے حیاء کی بے غیرت ماں؟'' صبور احمد نے ذہن میں سوچا۔

''ہم دوزخی ہیں اور دوزخ کا کاروبار کرتے ہیں شاہ جی!'' اس نے اپنے نیم برہنہ بدن کو صبور احمد کے بدن سے چمٹایا تو خوفِ خدا کی تیز لہر نے صبور احمد کو اندر تک لرزا دیا۔ شیطان ملعون خوش ہو کر اپنے ترکش سے تیر نکال نکال کر گڈی بائی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر استعمال کر رہا تھا۔ وہ پھر بولی۔

''تب تک نہیں بتاؤں گی...... جب تک وہ واپس مذہب کی طرف نہیں لوٹتی۔''

''وہ پکی مسلمان ہے۔'' صبور احمد نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''وہ واپس کبھی بھی تمہارا مذہب قبول نہ کرے گی۔''

''تو پھر طوائف کیوں ہے؟'' اس کی زہریلی ہنسی نے زہر اگلا۔

''وہ یہ کام مجبوری کے تحت کرتی ہے...... جب اسے تم اس کے باپ کا نام پتہ بتا دو گی...... دیکھنا وہ چھوڑ دے گی۔''

صبور احمد اس کی باتوں کے جواب دینے لگے تھے۔

''وہ بوڑھی ہو جائے گی...... تب بھی نہیں بتاؤں گی۔'' اس نے اپنے آپ کو مزید قریب



کر لیا تھا۔ صبور احمد اس سے دور ہونے لگے تو اس کے کارندوں نے ان کی قمیص پکڑ کر پھاڑ دی۔ ان کی آنکھیں غصے اور شرم سے سرخ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے چھت سے لٹکے ہوئے فانوس کی طرف دیکھا گویا خدا سے اس مشکل گھڑی میں مدد چاہتے ہوں اور عاجزی سے طلبگار ہوں کیونکہ چھت کی وجہ سے وہ آسمان کو نہ دیکھ پا رہے تھے مگر وہ مردِ قلندر تھے۔ ان کی نگاہ آسمانوں سے اوپر رب کریم کی بارگاہ میں پہنچنے کے لیے ہواؤں، فضاؤں اور خلاؤں کا سینہ چیر چکی تھی۔ تو پھر ابھی تک خداوند کریم کی مدد کیوں نہ پہنچی تھی۔ شاید صبور احمد کا امتحان مقصود تھا۔

نائیکہ نے ان کے بدن پر اپنا ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ ''تمہارا اور ہمارا خدا ایک ہی ہے۔ مگر تم خود کو آخری نبی کی اولاد کہتے ہو...... کیا ثبوت ہیں تمہارے پاس کہ تم ہی ان کی اولاد ہو؟'' اس بات کے مکمل ہونے پر ایک زوردار تھپڑ گڈی بائی کے گال کو سرخ کر گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دور جا گری۔

سازندے اور کارندے حیرانگی سے گڈی بائی کی طرف دیکھ رہے تھے اور گڈی بائی کی نظریں مست صبور احمد کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں جن کی آنکھوں سے غصے اور نفرت کی چنگاریاں نکلتی ہوئیں گڈی بائی کے وجود کو جھلسا رہی تھیں۔

''حرامزادی! کتیا کی اولاد، تم جیسی بے غیرت اور بے حیاء عورتیں ہی دوزخ کا ایندھن ہیں۔'' صبور احمد کے منہ سے کف بہنے لگا تھا۔ ''تم نے ہر کسی کو اپنے جیسا ہی سمجھ لیا ہے...... تمہیں خبر ہے کہ تمہیں کس کس باپ نے جنا ہے؟'' صبور احمد کا لہجہ آگ برسا رہا تھا۔ ان کے اس طرح اونچی آواز میں بولنے سے پھوڑے نے رسنے کے لیے راستہ ڈھونڈنا شروع کر دیا وہ اندر ہی اندر اُبل رہا تھا۔

گڈی بائی کی نفرت بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ وہ کافی سنبھلتی ہوئی بولی۔ ''ٹھوکر لگنے سے پہلے ہی سنبھل جانے والا سرخرو ہوتا ہے۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور ایک بار پھر صبور احمد کی طرف بڑھی مگر اس مرتبہ فاصلہ ہی رہا۔ کیونکہ وہ صبور احمد کا تھپڑ کھا کر کافی ڈر گئی تھی۔ ''مسلمان کسی کا نقصان کرے تو بدلے میں دوسرے کو کیا کرنا چاہیے شاہ جی؟'' ہوس اور شیطان اس پر غالب تھے وہ دوڑ کر صبور احمد سے چمٹ گئی مگر انہوں نے اسے اپنے مضبوط اور توانا بازوؤں کی مدد سے دوسری طرف گرا دیا اور خود واپسی کے راستے کی جانب لپکے تو ایک موٹے ڈنڈے نے ان کا استقبال کیا۔ ڈنڈا ان کی ٹانگوں پر ایک غنڈے نے مارا تھا وہ لڑکھڑا گئے تو گڈی بائی

کو موقع مل گیا وہ اپنے برہنہ بدن کے ساتھ آگے بڑھ کر صبور احمد کے جسم سے لپٹ گئی تو ان کی سانسیں بے ترتیب ہو گئیں۔

''میرے اللہ! میرے اعتقاد اور ایمان کو ٹوٹنے سے بچا۔ میں کسی امتحان کے قابل نہیں ہوں۔'' اس دعا کے مانگتے ہی صبور احمد کا سینہ درد کی شدت سے پھولنے اور پچکنے لگا۔ ناقابلِ برداشت کی تکلیف کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یک دم پھوڑے سے پیپ اور خون نکل کر ان کے سینے کو رنگین اور غلیظ کرنے لگا۔ گڈی بائی تڑپ کر ان سے الگ ہوئی اور ناک پر ہاتھ رکھتی ہوئی نفرت کا اظہار کرنے لگی اور کارندوں کو حکم دینے لگی۔

''اس خبیث کو یہیں زندہ درگور کر دو...... یاد رکھو یہ مست یہاں سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ توبہ توبہ کتنے گندے ہوتے ہیں یہ مسلمان؟'' اس کی نفسانی خواہش پر پانی پھر گیا تھا۔ محض سینے پر نکلنے والے پھوڑے کی پیپ اور خون سے اس کا ''رزق خانہ'' بدبو سے بھر گیا تھا۔ کارندے بھی صبور احمد کی حالت دیکھتے ہوئے ان کے پاس آنے سے کترا رہے تھے۔ کیونکہ پھوڑے کی پیپ سے ہلکی ہلکی بدبو اٹھ رہی تھی۔ جو خداوند کریم کی طرف سے اپنے بندے کی عزت بچانے کے لیے تھی۔

نائیکہ اندر کی جانب بھاگ گئی تھی جبکہ صبور احمد کارندوں کو اپنی طرف بڑھنے کے لیے پکار رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے پر اس پھوڑے کو اسی دن کے لیے بنایا تھا۔ ان کے پاس آنے کی بجائے ایک کارندے نے دور سے ہی نشانہ تاک کر ڈنڈا صبور احمد کے سر پر مارا تو خون کا فوارہ ابل پڑا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سر کو پکڑا تو ہاتھ خون سے تر ہو گئے۔ انہوں نے کارندوں کی جانب دوڑ لگا دی۔

پورے ہال میں خون بکھر گیا تھا۔ ڈر اور خوف سے بھاگتے ہوئے ایک غنڈے نے سیڑھیوں کا دروازہ کھول کر نیچے کی جانب دوڑ لگائی تو صبور احمد کو بھی نیچے جانے والا راستہ نظر آ گیا وہ بھی نیچے کی جانب لپکے۔ ان کے ہاتھ خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ سر سے خون نکل کر چہرے کو رنگین کر گیا تھا۔ وہ نقاہت کی وجہ سے گرنے لگے تو ایک طرف دوڑ پڑے۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے ایک کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

یہ پہلے سے بھی شاندار جگہ تھی۔ تماش بینوں سے کوٹھا بھرا ہوا تھا۔ مگر ان کے وہاں پہنچتے ہی سب ناکوں پر رومال اور ہاتھ رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔



طوائف کے پاؤں بھی اس زخمی اور گندے انسان کو دیکھ کر رک گئے اس کے چہرے پر بھی ناگواری پھیل گئی۔ اس نے دیکھا کہ نو وارد نیم برہنہ اور زخمی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی۔ صبور احمد کے منہ سے اس طوائف کا نام نکلا۔ ''حیاء'' اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ حیاء زخمی کے منہ سے اپنا نام سن کر ناک پر ہاتھ رکھتی ہوئی آگے بڑھی۔

''یہ...... یہ صبور احمد ہے۔'' اس نے پیچھے مڑ کر اپنے سازندے کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولی۔

''کک...... کون صبور احمد؟'' وہ خون سے صبور احمد کا چہرہ تر ہونے کی بنا پر اور برہنہ حالت کی وجہ سے پہچان نہ سکی تھی۔

''یہ مست ہے۔'' دوسرا بولا۔ ''کون مست؟'' ایک اور آواز آئی۔ ''مست صبور احمد ہے۔ شاہ جی کا بیٹا ہے۔'' آخری الفاظ سن کر حیاء پر بجلی گر گئی۔ وہ ناک سے رومال ہٹاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی اور غور سے صبور احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا بدن کانپنے لگا۔ وہ آلِ رسول کے چشم و چراغ صبور احمد کو پہچان نہ پائی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔

''ان کی یہ حالت کس نے کی ہے؟'' وہ اپنے سازندوں سے چیخ چیخ کر پوچھنے لگی۔ ''یہ سب کچھ کیسے ہوا؟'' اسے فوراً ہی اس کی بات کا جواب مل گیا۔ ''اس کی یہ حالت ہم نے کی ہے۔'' اس نے آواز کی سمت دیکھا تو گڈی بائی اپنے غنڈوں کے ساتھ اس کے کوٹھے پر کھڑی تھی۔ وہ حیران رہ گئی کہ گڈی بائی کی صبور احمد سے کیا دشمنی تھی۔ کچھ تماش بین چلے گئے تھے اور کچھ موجود تھے جو تماشہ دیکھنے کے منتظر تھے۔

''مگر تمہاری ان کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟'' حیاء کھڑی تھی وہ چار قدم چلتی ہوئی گڈی بائی کی جانب بڑھی تو وہ کچھ قدم پیچھے ہٹ گئی۔ کیونکہ وہ ابھی تک حیاء کے تھپڑ کو نہیں بھولی تھی۔

''حیاء بیگم!'' گڈی نے زہر اگلنے کے لیے لفظوں کا سہارا لیا۔ ''اگر پانی پر کوئی لہر نہیں تو یہ نہ سمجھو کہ تہہ میں کوئی مگرمچھ نہیں۔'' حیاء نے ایک کارندے کو صبور احمد کے سر سے خون صاف کرنے کا اشارہ کیا تو وہ آنکھ بچا کر نکل گیا۔ ''میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔'' حیاء نے جانے والے کارندے کو نظر انداز کرتے ہوئے گڈی بائی سے کہا۔

''تم میں اور ہم میں یہی تو فرق ہے تم دل سے سوچتی ہو...... اور ہم دماغ سے۔'' گڈی بائی طنزیہ انداز میں بولی تو حیاء کا پارہ چڑھ گیا۔

"میں پہیلیوں میں باتیں سننے کی عادی نہیں ہوں۔ اپنی زبان کی گرہیں کھولو اور صاف بات کرو۔" گڈی اس کی ماں تھی اسے حیاء کا لہجہ اور بات ناگوار گزری تھی مگر وہ جانتی تھی کہ حیاء ضدی اور خودسر ہے۔ لہٰذا اس کی بات کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔

"یہ وہ مسلمان ہے جو اس بازار میں آنے سے گاہکوں کو روکتا ہے۔" گڈی نے زہر اگلنا شروع کر دیا تو حیاء کی نظر بے ہوش صبور احمد پر گئی اب ان کی چوٹ سے خون نکلنا بند ہو گیا تھا۔ "اگر ہم ایسے ہی ہرایرے غیرے کو کھلی چھٹی دیتے رہے تو پھر ہمارے چولہے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

"اچھا!" حیاء کے اس ایک لفظ میں کتنا زہر اور کتنا طنز تھا اس بات کا اندازہ گڈی بائی بخوبی کر سکتی تھی۔

"جب اللہ کی ذات سے اعتماد اور بھروسہ اٹھ جائے تو پھر انسان گھاس پھونس کا سہارا لیتا ہے۔ میں کہتی ہوں فوراً یہاں سے چلی جاؤ...... میں اپنے کاروبار میں گندے لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔" حیاء کی بات نے گڈی کے کارندوں کو بھڑکا دیا مگر وہ ٹھنڈے مزاج سے بولی۔

"میں اگر گندی ہوں تو یہ جو تمہارے پاؤں میں گرا ہے یہ کون سا پھول ہے؟" وہ واپس جانے کے لیے مڑی اور پھر بولی۔ "بہت جلد تمہارا خانہ خراب ہونے والا ہے۔ بہت جلد...... تم دیکھنا...... جس بازار کی تم آج زینت بنی پھرتی ہو...... اسی بازار میں تمہیں بھیک منگواؤں گی......" وہ اپنے کارندوں کے ساتھ دفعان ہو گئی تھی۔

حیاء نے بے ہوش پڑے ہوئے صبور احمد کی طرف دیکھا اور بولی۔ "ان کے تو بدن پر گندگی ہے...... مگر گڈی بائی تمہاری نس نس میں گندگی خون بن کر دوڑ رہی ہے۔" اس کی بات اور آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنے سازندوں اور کارندوں کی طرف دیکھا مگر سبھی ایک ایک کر کے نکل چکے تھے۔ وہ ظاہری گندگی دیکھ کر نکل بھاگے تھے حالانکہ حیاء جانتی تھی کہ ان کے دل و دماغ میں گندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اس نے اپنے گھنگھرو بھی نہ اتارے اور اندر واش روم کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس نے پانی کی بالٹی بمشکل اٹھائی اور صبور احمد کے سر پر پہنچ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں رُوئی تھی۔ اس نے صبور احمد کے زخم کو روئی اور پانی سے صاف کرنا شروع کر دیا۔

عجیب بات تھی کہ اب اسے کسی بھی قسم کی بو محسوس نہ ہو رہی تھی۔ اس نے ایک اور بالٹی پانی کی بھری اور قیمتی قالین کی پرواہ کیے بغیر ہی صبور احمد کے بدن کو مل مل کر دھونا شروع کر



دیا۔ وہ گندگی کو روئی اور اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہی تھی۔ اس کے تمام قالین گیلے ہو چکے تھے۔ جگہ جگہ پانی جمع ہو چکا تھا مگر حیاء کو اس کام میں نامعلوم سی راحت اور لگن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہر قسم کی کوفت محسوس کیے بغیر اپنے کام میں مگن تھی کہ صبور احمد کو ہوش آ گیا۔

وہ غور سے حیاء کی طرف دیکھ رہے تھے جس نے اب ان کے بدن کو نرم تولیے سے رگڑنا شروع کر دیا تھا اور تولیے سے ان کا بدن خشک بھی ہو رہا تھا۔ بعد میں اس نے حیران صبور احمد کے بدن پر خوشبو بھی مل دی اور ایک بڑی سی چادر ان کے بدن پر لپیٹ دی جس سے ان کی برہنگی بھی چھپ گئی۔ ان کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔

حیاء کا "رزق خانہ" ایک غسل خانہ کا منظر پیش کر رہا تھا مگر حیاء کو اس کا ملال اور دکھ نہ تھا بلکہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ عشق سکول میں داخل ہو گئی تھی۔ اب اس کی چمڑی بھی ادھڑ جائے وہ ان دیواروں کے سامنے کبھی بھی گھنگھرو باندھ کر نہیں ناچے گی۔

یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے گھنگھرو اتار کر دور پھینکے اور ایک مصمم ارادہ سے اٹھتی ہوئی صبور احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ احمد سبحانی کی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں آ گئی تھی اس نے حیاء کو طعنہ دیا تھا کہ وہ عشق کی دعویدار بنتی پھرتی ہے جبکہ اسے تو عشق کی ابجد بھی معلوم نہیں ہے۔

"احمد سبحانی! میں اب ابتدائے عشق سے انتہائے عشق تک کا سفر کروں گی۔ چاہے میری کھال کی جوتیاں ہی کیوں نہ بن جائیں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی مگر صبور احمد نے اس کی بڑبڑاہٹ اور دل کی بات بخوبی سن لی تھی۔

"میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں شاہ جی؟" اس نے محبت سے صبور احمد کی طرف دیکھا تو حیرت واستعجاب میں مبتلا صبور احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حیاء نے صبور احمد کو نیچے لا کر اپنی قیمتی گاڑی کی اگلی سیٹ پر بٹھایا تو فجر کی اذان کے معطر و مقدس الفاظ مؤذن کی زبان سے ادا ہو کر فضا اور ہوا کو پاکیزگی بخشنے لگی۔ یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا کہ حیاء نے فجر کی اذان سنی ہو بلکہ نماز تہجد کی ادائیگی کے بعد وہ فجر کی نماز بھی ادا کرتی تھی۔ مگر آج مؤذن کی آواز میں جو سوز اور تڑپ تھی اس نے حیاء کو تڑپا دیا تھا۔

اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ "اشھد ان محمد رسول اللہ" حیاء نے ان الفاظ کو سن کر یک دم بریک لگائی تو صبور احمد بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے وہ اپنی مستی میں مگن تھے مگر حیاء کے دل کی کیفیت سے آشنا ہونے کی جستجو میں اس کے دل کے

خانوں کو رب کریم کی دی ہوئی نظروں سے ٹٹول رہے تھے۔ حیاء کی طرف دیکھ کر وہ مسکان لبوں پر سجائے ہوئے بولے۔

''یوں تو ساری اذان ہی محترم اور قابلِ احترام ہے۔ مگر یہ فقرہ اذان کی اصل روح ہے۔'' حیاء کے دل کا چور مست صبور احمد نے پکڑ لیا تھا۔ اذان، نماز، درود اور کلمہ اس نے اپنے محبوب کے معتبر اور اعلیٰ نام کو اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر رکھا ہے۔'' حیاء نے گاڑی آگے بڑھادی۔ فضا اور ہوا باادب ہو رہی تھیں۔ صبور احمد نے پورا راستہ کوئی بات نہ کی تھی جبکہ حیاء چاہتی تھی کہ یہ مردِ قلندر اسے نبی آخرالزمان ﷺ کے بارے میں مزید کچھ بتائے۔ مگر صبور احمد خاموش ہی رہے۔ گاڑی ان کی حویلی کے باہر جا کر رکی تو صبور احمد خاموشی سے نیچے اترے۔

| | |
|---|---|
| ''جیہڑا اسیّد دی کشتی دا مسافر بن جاوے | مطیع اوس دا طوفان سمندر ہو جاندا |
| چور وی قطب بن دا اے نگاہِ ولی نال | رتبہ بصریؒ دا برابر قلندر ہو جاندا'' |

حیاء خاموشی سے صبور احمد کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے بدن میں لہو نام کی کوئی چیز محسوس نہ ہو رہی تھی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ اس نے کتنی بڑی ہستی کے بدن سے گندگی کو صاف کیا تھا۔ وہ روزِ ازل سے ہی سادات گھرانے کی دل سے نوکری کرتی تھی۔ کئی درباروں، درگاہوں اور مزاروں پر جا جا کر اس نے حالِ دل سنا کر اپنی بے قراری اور دل کی تشنگی کو کم کرنے کی کوشش کی تھی مگر آج اس نے صبور احمد کی صورت میں آلِ رسول کو انتہائی قریب سے دیکھا تھا۔ بلکہ ان کے بدن کو اپنے ہاتھوں سے مل مل کر دھویا تھا۔ وہ خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ ایک زبردست جمائی نے اسے اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ کافی تھک گئی ہے۔ اس نے گاڑی بازار کی جانب بڑھادی۔ اس نے اپنے کوٹھے کے نیچے بنے ہوئے گیرج میں گاڑی کھڑی کی اور بازار کی ویرانی اور سنسانی کو دیکھنے لگی۔ اس سے اسے یہ بازار بہت اچھا محسوس ہوا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ بازار ہمیشہ ایسے ہی اجڑا اور ویران رہے۔ مگر یہ اس کی خواہش تھی۔ کیونکہ شام ہوتے ہی یہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

ڈھولک کی تھاپ پر جوانیاں رقص کرتی تھیں۔ گوشت کو بیچنے کا دھندہ عروج پر ہوتا تھا۔ موتیا کے ہار بیچنے والوں کی چاندی ہوتی تھی۔ بوتلیں، کولڈ ڈرنکس اور پان سگریٹ بیچنے والے بھی جا چکے تھے۔ انہوں نے بھی رات بھر کی کمائی کو تکیہ بنا کر پُرسکون نیند کو ترجیح دینا مناسب سمجھا ہوگا۔



اس کی نظریں بالکنیوں پر گئیں۔ جہاں رات کو سریلی آوازوں کی بانسری بجتی تھی۔ مگر اب وہ بالکنیاں بھی اداس اور غمگین تھیں۔ حیاء خمار آلود آنکھوں سے ایک آدمی کو دیکھنے لگی جو کاندھے پر ایک پلاسٹک کا بورا اٹھائے بازار میں بکھرے کاغذ اور گتے جمع کر رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو حیاء پہچان گئی وہ اس کا محسن فضل محمد تھا۔ وہ بھی حیاء کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''کیا بات ہے بیٹی؟'' وہ حیاء کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''آج صبح ہی صبح اٹھ گئی یا پھر ابھی تک سوئی نہیں ہو؟'' حیاء اس کے لہجے کی مٹھاس کو محسوس کرتے ہوئے نم آواز میں بولی۔

''سچ پوچھو بابا...... میں آج ہی جاگی ہوں۔ ساری زندگی سوتے ہی گزار دی۔''

''شکر کرو کہ تمہاری نیند میں تمہاری کوئی چیز کھوئی نہیں۔'' فضل محمد غمناکی سے بولا۔

''میں ساری زندگی جاگتا رہا ہوں...... مگر سب کچھ چوری ہو گیا...... سب کچھ چوری ہو گیا۔''

وہ حیاء کو اداس اور پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ تو حیاء اسے جاتا دیکھتی رہی اور پھر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

ملازموں نے رات ہی رات میں قالین اور فرش دھو ڈالے تھے کیونکہ قالین اپنی جگہ پر نہ تھے اس کا مطلب تھا کہ چھت پر ڈال دیئے ہوں گے۔ فرش پانی اور سرف سے مل مل کر دھوئے ہوئے تھے۔ اس نے کوٹھے کی ایک ایک چیز کو دیکھنا شروع کر دیا۔ کھڑکیوں سے بادِ صبا ہلکی ہلکی سرسراہٹ کرتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ جب سرد اور خوشبودار ہوا اس کے وجود سے مس ہو کر گزری تو اس نے التجائیہ انداز میں اوپر کی طرف دیکھا کہ یہ لمحات یونہی ٹھہر جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جائیں۔ مگر نیند سے بوجھل آنکھوں نے اسے سونے پر مجبور کر دیا۔ نیند کی دیوی تو اس پر جلدی مہربان ہو گئی تھی مگر چند ہی لمحات بعد آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نے اس کے اردگرد نورانی ہالہ تان لیا۔

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی مگر روشنی کرنے والا کوئی بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزار واٹ کے مرکری بلب روشن ہو گئے ہوں اور تمام روشنی دودھ میں نہائی ہوئی لگتی تھی وہ اس اجنبی ماحول سے خوفزدہ ہو کر چیخنے چلانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اپنا منہ کھول کر مدد مدد پکارنا چاہتی تھی مگر یکدم نور کا ہالہ متحرک ہوا اور روشنی سے صدا بلند ہونے لگی۔

''جس کام کے لیے تمہیں چنا گیا ہے وہ کرو۔ جس کے لیے نہیں چنا گیا وہ مت کرو۔''

وہ حیران تھی کہ روشنی کی آواز میں مٹھاس اور نرم لہجہ اس کو اپنا گرویدہ کرنے لگا تھا۔ ''کھیل اور تماشہ۔ تمہاری میراث اور وراثت ہی سہی...... مگر آج کے کام نے تمہیں عظمت و رفعت کی جس بلندی پر پہنچا دیا ہے اس کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے...... عظمت کی سربلندی۔'' نورانی روشنی کی آواز نے اس کے کھوئے ہوئے اوسان بحال کیے تھے۔ وہ اب پُرسکون انداز میں روشنی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس میں سے شیریں آواز نکل کر اس کی سماعت میں رس گھول رہی تھی۔

''تم نے اس انسان کے بدن کو دھویا ہے جو سادات گھرانے کی شان ہے...... جاؤ حیا بی بی...... ہم نے آج سے تمہارے دل و دماغ...... بدن و ذہن کی گندگی کو دھو دیا ہے۔ تم نے عشق کی پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر جو ہماری طرف بڑھنے کا احسن فیصلہ کیا ہے۔ ہم تمہیں عشق کی راہوں میں خوش آمدید کہتے ہیں...... تمہیں عشق ضرور ملے گا...... ضرور ملے گا...... مگر مجازی نہیں...... خود کو تیاگ دو...... اپنا آپ مار دو...... تمہیں عشق ضرور ملے گا۔ جب مزید درجات طے کرو گی تب...... عشق کی راہ پر چلنا ہے تو نیا جنم لو...... عشق تمہارے ساتھ ہوگا...... اللہ تمہاری مدد کرے گا...... بس...... نیا جنم لو...... نیا جنم......'' آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوئی تو حیاء گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ کوئی روشنی نہ تھی۔ کوئی صحر نہ تھا۔ وہی کوٹھے کا اجڑا ہوا ماحول تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی سرہانے پر سر ٹکائے خواب کی ایک ایک بات یاد کرنے لگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شام کو صبور احمد کے گھر جائے گی اور اس خواب کی تعبیر پوچھے گی۔

☆=======☆=======☆

''تیری باتیں تُو ہی جانتا ہے۔'' صبور احمد کا منہ آسمان کی جانب تھا۔ منو منڈیر پر بیٹھا ہوا اس کی اندرونی کیفیت سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''طوائف اس اسلامی معاشرے کے ماتھے پر کلنک ہے۔ مگر مجھ جیسے کو اسی کے سامنے بے پیرہن کر دیتا ہے۔ کیسے سمجھوں تجھے...... کیا کہوں تجھے...... کیا ہے تُو؟ ہر رنگ میں ہے تُو...... میں بہت حیران تھا کہ ایک طوائف عشق کا حصہ کیسے بن گئی...... ہاں...... ہاں...... اب سمجھا تیری مرضی اس میں شامل تھی۔'' وہ آسمان کی جانب منہ کیے باتیں کر رہا تھا جیسے کہ وہ دیکھ رہا ہو اس کی باتیں اوپر والے تک پہنچ رہی ہوں۔ منو حیرانگی سے کبھی اس کی طرف اور کبھی اوپر آسمان کی جانب دیکھنے لگتا۔



''عشق کا قاف! ایک طوائف...... کیا وہ اس درجہ کو سنبھال پائے گی؟ یہ میں نہیں تُو ہی بہتر جانتا ہے اب میں کیا کروں؟ کیا کروں؟ مجھے بتاؤ۔ کیا کروں؟'' وہ اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔ منو اس کی دل جوئی کے لیے اڑ کر صبور احمد کے کندھے پر بیٹھ گیا۔ ''منو!'' انہوں نے پیار سے اس کی چونچ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایک طوائف کے سامنے ننگا ہونا پڑا...... یہ عشق کی کون سی رمز ہے مجھے سمجھ نہیں آئی...... اس کی کیا رضا ہے۔ یہ بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عشق اور نہ جانے مجھ سے کیا کیا کروائے گا...... منو! سنبھل کر ان راہوں پر چلنا۔ بہت کٹھن راہیں ہیں۔'' صبور احمد کی آنکھوں میں اشک دیکھ کر منو کا دل پسیج گیا تھا۔ وہ عشق کے اس مجسمہ کو کوئی بھی دلاسہ نہ دے سکتا تھا۔

وہ اوپر بیٹھے ہوئے ''عاشق'' کی منطق پر حیران تھا۔ پتہ نہیں اس کا کیا حال ہونے والا تھا۔ وہ تو بے زبان پرندہ تھا۔ وہ اپنے عشق کو سرخرو کرنے کے لیے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونا چاہتا تھا۔ وہ اُڑ کر صحن میں زمین پر آ بیٹھا اور اپنی گردن رب کائنات کے حضور جھکا دی۔ اس کی زبان خاموش تھی۔ مگر کمزور سا بدن اس انداز میں ہل رہا تھا گویا وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہو۔

''تم نے دیکھ لیا منو!'' صبور احمد کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو اس نے گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ''احمد سبحانی نے ہماری بدگوئی برداشت نہ کرتے ہوئے طوائف حیاء کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ وہ ''عین'' ہوا۔ تم نے سیّد لسوڑی شاہ سرکار کے مزار کی حرمت و پاکیزگی کے لیے اپنے خاندان سے بغاوت کر دی۔ تم ''شین'' بن گئے۔ حیاء طوائف نے میرے بدن سے گندگی دھو کر ''قاف'' کا مقام پالیا۔'' منو اپنے شین بننے کا سن کر خوشی و غمی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''اب میرا کام ختم ہو گیا۔ تمہیں اپنا اپنا سفر اکیلے ہی طے کرنا ہے...... میں تمہیں شہر امن کی جانب پرواز کی اجازت دیتا ہوں۔'' انہوں نے منو کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر چوم لیا تو دو آنسو منو کے وجود کو متورم کر گئے۔ صبور احمد نے ایک سیاہ رنگ کا سوتی دھاگہ منو کے دائیں پاؤں سے باندھتے ہوئے کہا۔ ''اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ بس ایک التجا کروں گا......'' منو کی آنکھوں میں استفسار تھا مگر صبور احمد کچھ بھی کہنے سے پہلے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''کالی کملی والے آقا ﷺ سے عرض کرنا کہ...... ایک کملا جھلا آپ کا ادنیٰ

اُمتی آپ کی نظرِ کرم کا کافی عرصہ سے طلبگار ہے۔'' آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا تھا منو کی بھی آنکھیں پانی کے قطرے بہا رہی تھیں۔ وہ صبور احمد کی طرف دیکھ کر مزید غمزدہ ہو گیا تھا۔

''میرے مدنی اور پیارے آقا ﷺ سے عرض کرنا۔ بس ایک بار اور...... صرف ایک بار اور اپنے دیدار کی ٹھنڈی برف صبور احمد کی آنکھوں سے لگا دیں...... پھر...... پھر چاہے اللہ میری جان لے لے...... بس مرنے سے پہلے صرف ایک بار......'' منو، صبور احمد کو کوئی دلاسہ نہ دے سکتا تھا۔ مگر وہ اس طرح ان کے رونے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ''کہو گے نا...... منو؟''

''جی شاہ جی! ضرور کہوں گا...... بلکہ آپ کا پیغام ہی اس بات کی گواہی ہو گا کہ آقا ﷺ مجھے اپنے در پر حاضر ہونے کی نوید دیں گے۔ میں خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں شاہ جی...... کہ آپ کی محبتوں بھری نظرِ کرم کی زیرِ سرپرستی میں شہرِ محمد ﷺ کا مسافر بنا ہوں۔''

''منو!'' صبور احمد پھر بولے۔ ''مدینہ جانے سے پہلے مکہ معظمہ کی ابابیل سے ضرور ملنا۔''

''مگر میں اسے پہچانوں گا کیسے؟'' منو کی بے بسی قدرتی تھی۔

''راستے خود بخود تمہارا استقبال کرتے جائیں گے۔ طوفان اور آندھیاں تمہارا راستہ روکیں گی...... مگر تمہاری ثابت قدمی ان کو زیر کر سکتی ہے۔ گھبرانا نہیں...... بس اللہ کو یاد رکھنا اور یاد کرتے رہنا...... جاؤ منو! آج سے تم ''شین'' ہو...... اللہ حافظ!'' صبور احمد نے اسے فضا میں چھوڑ کر منہ نیچے کر لیا گویا وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ منو جو کہ اب شین تھا۔ اس نے پرواز بھری اور منڈیر پر بیٹھ کر صبور احمد کی طرف دیکھتے ہوئے غمگین لہجہ میں بولا۔

''اللہ حافظ شاہ جی!'' شین نے اُڑان بھری اور شہرِ امن کی جانب خطرناک سفر کا آغاز کر دیا۔

''تم نے شین سے یہ کیوں کہا کہ تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔'' یہ حاکم علی شاہ کی آواز تھی جو صبور احمد کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ ''میرے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے شاہ جی!'' صبور احمد کی نظریں اپنے والد اور مرشد کے احترام میں جھکی ہوئی تھیں۔ ''مگر ابھی تو تم نے عشق مکمل نہیں کیا...... پھر اللہ کے حکم سے منکر کیسے ہو سکتے ہو؟''

''میں اس خیال کا خیال بھی گناہ سمجھتا ہوں کہ رب تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کروں۔'' صبور احمد لرز گئے تھے کہ مرشد کیا فرما رہے تھے۔ ''مجھے اب کیا کرنا ہو گا؟'' وہ نئے جوش سے بولے تو حاکم علی شاہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''عین کی مکمل رہنمائی...... وہ ابھی طفلِ مکتب ہے۔''



''اور قاف؟'' صبور احمد اگلا سوال کر بیٹھے۔ یہ دو الفاظ بے ارادہ ہی ان کے منہ سے نکلے تھے۔

''مصیبت کی جڑ انسان کی گفتگو ہے۔'' صبور احمد مرشد کا تلخ رویہ جان کر اپنی بات پر افسردہ ہو گئے۔ ''جب قاف کی باری آئے گی...... تب تک عین مکمل استاد بن چکا ہو گا۔''

''کیا یہ عین اور قاف...... اکٹھے نہیں چل سکتے؟'' اس نے جرأت کر کے یہ سوال پوچھا تھا۔

''کبھی اس گاڑی کو دیکھا ہے جس کے تین پہیے ہوں اور وہ اگلے پہیے کے بغیر ہی چل پڑی ہو اور منزل تک بھی بخیریت پہنچ گئی ہو؟'' حاکم علی شاہ ان کے والد اور مرشد بھی تھے ان کا اشارہ شین کی طرف تھا۔ یقیناً عین، شین، قاف اکٹھے ہوں گے تو عشق مکمل ہو گا۔

''میں ہر طرح سے عین کی رہنمائی کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ دل کی گہرائی سے بولے تھے۔

''تو پھر ٹھیک ہے...... اپنا بوریا بستر باندھ لو...... اپنے ملک میں ہی ایک سفر کرنا ہے۔''

''میں فیضان پور نہیں جاؤں گا۔'' صبور احمد صاحب علم تھے وہ اس وقت باپ سے ضد کر رہے تھے۔

''مگر کیوں؟'' حاکم علی شاہ کے انداز میں حیرانی تھی۔

''آپ کو پتہ ہی ہے۔'' صبور احمد کی بات سن کر حاکم علی شاہ مسکرانے لگے بلکہ قہقہے لگاتے ہوئے بولے۔

''وہ تو سبھی اب دوسرے ملکوں کو جا چکے ہیں۔ اب تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔''

''وہ ماسٹر علی محمد کی بیٹی...... خیراں...... بھی مجھے تنگ کرتی ہے۔'' صبور احمد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''اب نہیں کرے گی...... اب تو بالکل ہی نہیں کرے گی۔'' حاکم علی شاہ کا انداز پُراسرار تھا۔

''مگر اس میں عین کا کردار کیا ہو گا؟'' صبور احمد کا ایک اور سوال سن کر بڑے شاہ صاحب بولے۔

''تم اس کی تعلیم کی تکمیل کرو گے۔ اپنے ساتھ رکھ کر اسے عشق کو سرخرو کرنے کا سلیقہ سکھاؤ گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے...... آ جائے احمد سبحانی...... میں صبح ہی فیضان پور جاؤں گا۔'' صبور احمد مصمم ارادہ سے بولے۔

''اسے خود ہی بلا لو...... وہ صبح سر کے بل چلتا ہوا آئے گا۔'' حاکم علی شاہ نے احمد سبحانی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی ذمہ داری صبور احمد کے سر پر ڈال دی تھی حاکم علی شاہ اندر کی جانب بڑھ گئے تو صبور احمد نے اپنا رابطہ دوبارہ خالق کائنات سے جوڑا۔ اپنا منہ دوبارہ آسمان کی جانب کر کے وہ پھر رب کریم سے یکطرفہ گفتگو کرنے لگا۔

''پھر نہیں رکھنا تھا اپنی ذات کو پوشیدہ...... کبھی جلوہ دکھانے طور پر آتے ہو۔ کبھی اپنے دیدار کرانے کے لیے اپنے پاس بلواتے ہو، خود بھی عشق کے اسیر ہو...... مجھے سب معلوم ہے۔ کیا کیا ہے تُو نے پروردگار...... نور کو بشری لبادہ اوڑھا کر کائنات کی زینت بنا دیا تا کہ کائنات میں رنگ بھر سکیں۔ بشری لبادے والے اعلیٰ ترین انسان کو اپنے پاس عرش بریں پر نعلین سمیت بلواتے ہو۔''

صبور احمد حق و معرفت کی گفتگو میں کافی آگے نکل گیا تھا۔

''اپنی نماز میں کہتے ہو۔ کوئی بھی میرے علاوہ عبادت کے لائق نہیں۔ جو بھی میرے ساتھ کسی اور کو عبادت میں شریک کرے گا وہ میرا منکر ہو گا اور منکر و مشرک کے لیے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ واہ...... واہ...... واہ...... تو پھر نماز میں ایک بشر پر درود کیوں؟'' وہ اپنے ہاتھوں کو اس انداز میں ہلا جلا رہے تھے جیسے کہ کوئی لڑائی جھگڑا کرتا ہے۔ ''بشر کی ذات پر قرآن میں سلام کیوں؟ اذان میں تمہارے ساتھ آپ ﷺ کا نام کیوں؟ کلمہ طیبہ جو کہ دین اسلام کی بنیاد ہے اس میں تمہارے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام کیوں؟ میں جان گیا ہوں...... بس میں سمجھ گیا ہوں۔ خود ہی عاشق ہو اور خود ہی عشق ہو۔ طالب بھی ہو۔ مطلوب بھی۔ محبّ بھی محبوب بھی...... اسی لیے تو قرآن میں کئی صفاتی ناموں سے پکارتے ہو آپ ﷺ کو۔ کبھی بادلوں پر آپ ﷺ کا نام لکھ دیتے ہو۔ کبھی ہواؤں اور فضاؤں کو آپ ﷺ کی خاطر معطر کر دیتے ہو...... ایک بشر ﷺ کی خاطر...... نہیں...... معراج عشق کی خاطر...... ہاں بھئی ہاں ہر چیز پر قادر ہو۔ خالقِ کائنات ہو۔ عظمت و بزرگی والے ہو۔ سب کچھ جانتے ہو...... سب کچھ...... وہ بھی جو میں کہہ نہیں پاتا اور وہ بھی جو میں سوچ بھی نہیں سکتا......'' صبور احمد کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ وہ واپس گھومے تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ حیاء ان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کب آئی تھی؟ اس بات کا صبور احمد کو بالکل بھی علم نہ ہو سکا تھا۔ مگر ان کے اس طرح



اچانک گھومنے سے حیاء بھی سناٹے میں رہ گئی کیونکہ صبور احمد کی سرخ انگارہ بنی آنکھیں وہ دیکھ کر کانپ گئی تھی۔ تبھی تو اس نے نظریں نیچی کر کے صبور احمد کو سلام کیا۔ اس نے چہرے سے چادر کا نقاب ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں حیاء ہوں شاہ جی!'' حیاء کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر صبور احمد کی ان آنکھوں کو عقیدت سے چوم لے۔ اس نے ان کی تمام گفتگو سن لی تھی۔ صبور احمد کی نظریں جھکی ہوئی تھیں کہ حاکم علی شاہ اندر سے آتے ہوئے بولے۔

''میں جانتا ہوں بیٹی!'' حیاء ان کا محبت بھرا انداز دیکھ کر سن ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ ایک طوائف تھی اور اس وقت آلِ رسول کی چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ یہی تو اس گھرانے کی عظمت تھی کہ عورت کو اس کے کام اور رتبے کی بجائے عورت ہی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر حیاء جیسی طوائف بھی سائل بن کر آ جائے تو نگاہیں احترامِ عورت میں جھک جاتی تھیں۔

صبور احمد مرشد کو دیکھ کر نظریں جھکائے اندر چلے گئے۔

''بیٹھو بیٹی!'' حیاء صحن میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھنے لگی تو حاکم علی شاہ جلدی سے بولے۔

''نہ...... نہ...... میری بچی! چارپائی پر بیٹھو...... ہمیں گناہگار مت کرو......'' حیاء کے لیے ان کے الفاظ حیران کن تھے۔ وہ حیرت سے حاکم علی شاہ کی طرف دیکھتی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی جبکہ شاہ صاحب دوسری چارپائی پر ایک طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ''کہو! حیا بیٹی کیا کہنا چاہتی ہو؟'' آج تک وہ مزارات پر جا کر خود ہی دل کی باتیں زبان پر لے آتی تھی۔ مگر آج پہلی بار کسی سادات نے خود کہا تھا کہ وہ اپنے دل کا مدعا بیان کرے تو وہ منمنانے لگی۔

''مم...... میں......'' وہ آگے کچھ نہ بولی تو حاکم علی شاہ گویا ہوئے۔

''احسانات کے درجات ہوتے ہیں۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے بیٹے کے وجود پر لگے خون کو دھو کر تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔'' وہ حیرت سے گنگ ہو گئی کیونکہ اس بات کا صبور احمد اور حیاء کو ہی علم تھا۔ تو گویا حاکم علی شاہ صبور احمد کے والد ہیں۔ حیاء اپنے دل میں ہی سوچ کر رہ گئی۔

''میں اپنی محبت چاہتی ہوں۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی تو شاہ جی مسکرانے لگے۔

''مگر وہ تو انکار کر چکا ہے۔'' یہ راز بھی حاکم علی شاہ نے فاش کیا تو حیاء تڑپتی ہوئی بولی۔

''وہ شراب کے نشہ میں جھوٹ بولتا ہے۔ وہ اپنی محبت مجھ سے چھپاتا ہے...... وہ اپنے

باپ کے اعلیٰ سٹیٹس سے ڈرتا ہے۔''

''شراب کے نشہ میں دھت ہو کر جسے تم جھوٹ بولنا کہتی ہو...... اصل میں وہی سچ ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے سچ تو تم نے سن ہی لیا ہے بیٹی...... وہ اب کبھی بھی تمہاری طرف لوٹ کر نہ آسکے گا۔'' حاکم علی شاہ اسے سمجھا رہے تھے۔

''تو پھر اسے مجھے لوٹا دیجیے شاہ جی!'' اس کی زبان ملتمس ہو گئی تھی۔ ''میں اس سے عشق کرتی ہوں۔''

''عشق مجازی تو ہوس کا نام ہے۔ جسم کی بھوک مٹانے کو دنیاداروں نے عشق کو بدنام کر دیا ہے۔'' حاکم علی شاہ کا لہجہ یک دم تلخ ہو گیا مگر انہیں اپنے اندازِ گفتگو پر بڑا کمال حاصل تھا۔

''عشق تو کھو دینے کا نام ہے۔ پانا ہی عشق کی معراج نہیں ہے بیٹی...... قدرت نے تمہارے لیے ایک بڑا انعام رکھا ہے۔''

''میں مجبور ہوں شاہ جی!'' وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔ ''میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''نہ ہی تم مچھلی ہو...... اور نہ وہ پانی!'' حاکم علی شاہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں تو کہا گیا تھا کہ اپنا آپ تیاگ دو۔'' حیاء کی سٹی گم گئی۔ وہ کانپتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ بات تو وہ صبور احمد سے کرنے آئی تھی۔ اس کے خواب کا راز تھا۔ مگر یہ تو شاہ جی کی آواز تھی۔ ''اپنا آپ تیاگ کر نیا جنم لو۔ اس کے بغیر...... اس عشق میں نیا جنم لو...... جو تمہیں تمہارا اصلی روپ دکھائے۔ دنیا کو تیاگ دو...... تم نے جو ہمارے اوپر احسان کیا ہے۔ بدلے میں ہم بھی تمہیں اللہ کے حکم سے کچھ نہ کچھ دینا چاہتے ہیں۔ کہ یہی ہمارے خاندان کی روایت ہے۔''

''میں سمجھی نہیں شاہ جی!'' حیاء ناسمجھ تھی وہ عشق کے اصولوں سے نابلد تھی۔

''ناسمجھی ہی تو عشق کی بنیاد ہے۔'' حاکم علی شاہ کا انداز نہایت مشفقانہ تھا۔ ''سب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ وہ تمہارا نہیں ہے۔ اس کے پیچھے مت بھاگو۔ نیا جنم لو بیٹی! اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔ انسان کی انسانیت کو تم نے عزت دی ہے تو دیکھو عشق نے تمہیں اپنا پیرہن اوڑھا دیا ہے۔ تمہیں قاف کا درجہ ملا ہے۔''

''قاف!'' حیاء کی حیرت فطرتی عمل تھا۔ وہ ان باتوں سے انجان اور نابلد تھی۔

''ہاں بیٹی!'' حاکم علی شاہ اسے سیدھی راہ پر لا رہے تھے۔ ''اس عشق کا درجہ بنو جو عبادت کی روح ہے۔ تم نے صبور احمد کے بدن سے جو گندگی صاف کی ہے۔ بدلے میں اللہ



تعالیٰ نے تمہارے دل و دماغ کو پاک کر دیا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم ایک کام کر کے کس درجہ پر فائز ہو گئی ہو۔''

''درجہ...... قاف؟ میں سمجھی نہیں شاہ جی!''

''عین، شین، قاف، مل کر عشق بنتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ تم عشق کے خاندان کا حصہ بن گئی ہو...... ہر دور میں وہ اپنے بندوں کو عشق سے نوازتا ہے اور آزماتا ہے۔ کبھی آگ میں پھینکوا کر۔ کبھی سولی پر چڑھا کر۔ کبھی پیٹ پر پتھر رکھ کر۔ کبھی آرے سے چروا دیتا ہے۔ کبھی مچھلی کے پیٹ میں نبی کو زندہ رکھتا ہے تو کبھی طور پر اپنا جلوہ دکھانے آ جاتا ہے۔ کبھی اپنے محبوب ﷺ کے غلام کو تپتی ریت پر لٹاتا ہے اور کبھی...... کبھی کربلا سجا کر آلِ محمد ﷺ کا عشق بھی آزماتا ہے۔'' حاکم علی شاہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

''جاؤ بیٹی! اب وہ تمہیں نہیں ملے گا...... اسے بھول جاؤ۔ یا پھر عشق کی راہوں سے واپس چلی جاؤ...... ورنہ پاؤں خاردار راہوں سے چھلنی ہو جائیں گے۔'' حاکم علی شاہ حیران و پریشان کھڑی حیاء کو چھوڑ کر اندر کی جانب چلے گئے۔

☆======☆=======☆

''یہ ہم کیا سن رہے ہیں کہ تم شراب نہیں پیو گے؟'' یہ نوابزادہ رحمٰن تھا جو احمد سبحانی کا جگری یار بھی تھا اور اس کا ہم پیالہ بھی تھا۔ وہ تمام دوستوں کے ساتھ اس وقت ایک ریستوران میں جمع تھے۔ ایک دوست کی سالگرہ تھی جس میں شراب و شباب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مجرا عروج پر تھا۔ شراب کے جام چل رہے تھے اور منچلے ناچنے والیوں سے اپنی اپنی بساط کے مطابق لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نوٹوں کے ڈھیر پر ناچنے والیاں کسی بھی منچلے کی کسی بھی شرارت کا برا نہ منا رہی تھیں۔

احمد سبحانی کی اس بات نے تمام دوستوں کے منہ کھلے کے کھلے رکھ دیئے تھے کہ وہ شراب نہیں پیئے گا۔ بلکہ اس نے شراب پینا ہی چھوڑ دیا ہے۔

''ابے سالے کیوں ہم سے ڈرامہ کر رہا ہے...... تو ہمیں ستانا چاہتا ہے۔'' یہ احد تھا جو بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا وہ بھی احمد سبحانی کے دوستوں کے لشکر میں شامل تھا۔ ''چل...... میرا بچہ! نہ ستا...... تھوڑی سی پی لے۔'' اس نے نشہ کی حالت میں دھت ہو کر احمد سبحانی کے ہونٹوں سے شراب کا گلاس لگایا تو احمد سبحانی نے دھکا دے کر گلاس ہٹایا، تھوڑی سی شراب احمد کے قیمتی سوٹ کو خراب کر گئی۔ وہ غصے میں جام ایک طرف پھینکتا ہوا احمد سبحانی پر پل پڑا۔

دونوں ہی گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے کو سروں کی ٹکریں مار مار کر زخمی کرنے لگے تو ساری محفل کا نشہ کافور ہو گیا تھا۔ باقی دوستوں کو ہوش آیا تو انہوں نے بیچ بچاؤ کرایا مگر احد کی ناک زخمی ہو کر خون بہا رہی تھی۔ احد کو ایک زوردار دھکا لگا تھا میز سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ چکا تھا۔ اب اس کے منہ سے مغلظات کا طوفانِ بدتمیزی نشر ہو رہا تھا۔ دوست احباب احمد سبحانی کو وہاں سے نکال کر باہر لے آئے وہ ری لیکس ہونے کے لیے اپنے سر پر پانی ڈالنے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی ناک سے بہنے والا خون بند ہو گیا تو وہ پارٹی ادھوری چھوڑ کر اپنی گاڑی میں وہاں سے نکل آیا۔

رات کا پچھلا پہر چل رہا تھا۔ سڑک ویران اور سنسان ہو چکی تھی۔ کیونکہ سمجھدار لوگ سو چکے تھے اور احمد سبحانی جیسے آوارہ نے ہی ان سڑکوں کو رات رات بھر آباد کر رکھا تھا۔ وہ گاڑی کو تیزی سے بھگاتا ہوا لے جا رہا تھا کہ اسے دور سڑک کے درمیان ایک بورڈ رکھا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے رفتار کم کر دی اور گاڑی بورڈ کے پاس رک گئی۔ اس پر کچھ بھی تحریر نہ تھا اور دور تک سڑک بھی صاف تھی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی کہ بورڈ سڑک کے بالکل درمیان میں پڑا ہوا ہے۔ اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اب اس بورڈ کو وہاں سے ہٹائے بغیر گاڑی وہاں سے آگے نہ جا سکتی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو کر سوچنے لگا کہ اب اس کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی واردات ہونے والی ہے۔

اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اپنے دائیں بائیں اور دور تک سامنے نظریں دوڑائیں مگر کوئی بھی غیر معمولی حرکت یا ہل جل نہ تھی جسے وہ مشکوک سمجھتا۔ وہ جی کڑا کر کے گاڑی سے باہر نکلا تو سرد ہوا نے اس کا استقبال کیا اور ایک بار تو پورا بدن کانپ گیا۔ وہ بورڈ کی طرف بڑھا اور ہلکے سے سٹینڈ بورڈ کو پکڑ کر سڑک کے کنارے ایک طرف رکھ دیا۔ وہ چوکنی نظروں سے اپنے اردگرد بھی دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ بھی نہ تھا ہر چیز پُرسکون تھی۔ وہ منہ سے دھواں نکالتا ہوا واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

اس کا پاؤں ایکسلیٹر پر پڑا اور گاڑی ایک بار پھر گھر کی جانب چل پڑی۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور گاڑی ایک چوراہے سے گھر جانے والی شاہراہ پر موڑ دی۔ ابھی گاڑی نے مزید سفر طے کرنا تھا کہ ایک آواز نے اس کی نبضیں روک دیں۔

''بس...... مجھے یہیں اتار دو! نماز کا وقت ہو گیا ہے۔'' یک دم گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور گاڑی اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔ اس نے بیک مرر سے دیکھا تو ایک سفید ریش



بزرگ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اس نے گھوم کے پیچھے دیکھا تو بزرگ کے نورانی چہرے پر برسنے والی نورانیت دیکھ کر وہ گنگ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ زبان کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی مگر آنکھ نے جو کچھ دیکھا تھا۔ دل اس کی دھڑک دھڑک کر تصدیق کر رہا تھا۔

بزرگ نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ ڈرائیور سائیڈ پر آئے تو احمد سبحانی کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اس نے بزرگ کو سر تا پاؤں دیکھا تو وہ ننگے پاؤں تھے اور سبز رنگ کا چولا پہنے ہوئے تھے۔ ماتھے پر سجدوں کا نشان اور چہرے کی بشاشت اور نورانیت اس بات کی غماز تھی کہ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان براہِ راست رابطہ ہے۔ وہ احمد سبحانی کے اس طرح محو ہو کر دیکھنے پر مسکراتے ہوئے بولے۔

''گدھا اگر تم کو لات مارے تو تم بھی اس کو لات نہ مارو۔ کیونکہ تم انسان ہو۔ گدھے کے ساتھ مت الجھو۔'' ان کی زبان سے شیرینی ٹپک رہی تھی۔ احمد سبحانی سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ احد اور اس کی لڑائی کی طرف ہے۔ ''انسان اگر اللہ کی طرف سے حرام کی ہوئی روزی اور رزق سے بچتا رہے گا وہ عابد ہو جائے گا اور عابد ہونا بھی ایک درجہ ہے مگر شرط حرام سے انکار ہے۔'' احمد سبحانی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو انہوں نے ایک پھونک اس کے چہرے پر پھونکی تو اسے سکون محسوس ہوا۔

''اللہ حافظ...... مگر یاد رکھنا...... عشق...... عین سے شروع ہوتا ہے اور قاف پر ختم۔''
بزرگ سڑک پر ایک جانب چل پڑے اور احمد سبحانی حیران پریشان انہیں دیکھتا رہا۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی شراب نہیں پیئے گا اور یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ اس کے حلقہ احباب سے جو بھی اس سے ناراض ہو کر اسے چھوڑنا چاہے بے شک چھوڑ دے۔ وہ گھر پہنچا تو طبیعت پراگندہ ہو رہی تھی۔ بیڈ پر لیٹتے ہی نیند نے مہربان ماں کی طرح اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

اس نے دیکھا کہ وہ ایک بے آباد اور اجاڑ جگہ پر کھڑا ہے اس کے اردگرد کوئی نہیں ہے۔ مگر نہ جانے کہاں سے آواز آ رہی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ مگر آواز والے کسی بھی ذی روح کو دیکھ نہ پایا۔ وہ ایک بار پھر چونک پڑا جب پکارنے والے نے اسے اس کے نام کی بجائے ''عین'' کہہ کر پکارا۔

''عین'' وہ درجہ تھا جو اسے پہلے روز ہی صبور احمد نے دیا تھا۔ آواز دینے والا ہنوز

سامنے نہ آیا تھا۔ وہ آواز کی سمت مخاطب ہوا۔ جو اسے سخت الفاظ میں تنبیہ کر رہی تھی۔

"جس ہستی سے عشق کے دعویدار بنے ہو وہ کبھی بھی اس طرح آرام دہ گدوں اور بیڈ بستروں پر نہ لیٹے تھے۔ کائنات کے کل مختار ہونے کے باوجود بھی ان کا بستر سخت زمین اور سرہانہ اینٹ کا ہوتا تھا اور فرشتے ان کی غلامی کیا کرتے تھے۔ سب کچھ تیاگنا پڑے گا۔" آواز میں سختی آتی جا رہی تھی۔ وہ پریشان اپنے چاروں اطراف دیکھ رہا تھا مگر کسی بھی ذی روح کو نہ پا کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ "خاک میں مل کر خاک اور پھر سب کچھ مل کر راکھ بن جائے گا اور راکھ ایک دن ہوا میں اُڑ جائے گی...... بھاگ جا! بھاگ جا...... بھاگ جا...... عین...... بھاگ جا!" اس آواز کی دہشت نے اسے پسینے میں شرابور کر دیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگا تو حاکم علی شاہ کی آواز نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔

"ٹھہرو احمد سبحانی!" اس نے مڑ کر دیکھا تو صبور احمد اور حاکم علی شاہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ رک گیا۔

"اس شیطان ملعون سے بچنا احمد سبحانی!" ان کی زبان سے یہ سن کر وہ حیران ہو کر پہلی آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ جواب قہقہے لگا رہا تھا۔ "یہ شیطان کا فریب ہے اس کے جال میں مت آنا۔ یہ تمہیں راہِ عشق سے ہٹا کر اپنی راہوں پر چلانا چاہتا ہے۔" احمد سبحانی حیرانگی سے کبھی دونوں آلِ رسول کی سمت دیکھتا اور کبھی غیبی آواز کی سمت دیکھنے لگتا۔

"میں تمہارا دوست ہوں عین...... یہ نام تمہارا خفیہ ہے اور دیکھو مجھے معلوم ہے۔ کیونکہ دوست ہی دوستوں کے حال سے واقف ہوتے ہیں۔" پہلی آواز گونجی تو حاکم علی شاہ اور صبور احمد آگے بڑھے اور احمد سبحانی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ اب ہمارا ہے...... یہ کبھی بھی تمہاری راہ پر نہیں چلے گا۔" صبور احمد کی آواز میں خوشی اور اعتماد تھا۔

"تم اسے میری راہوں سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈالنے والے ہو...... غلط راستے جو عشق نامی بلا کی جانب بڑھتے ہیں۔" شیطان غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس کا شکار اس کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔ "یاد رکھو! میں تم سے اچھی طرح نپٹنا جانتا ہوں...... اور اگر اس نے تمہارا ساتھ دیا تو اس کا جینا دوبھر کر دوں گا......" غیبی آواز جو کہ کافی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔

اس نے غور سے صبور احمد اور حاکم علی شاہ کی طرف دیکھا جنہوں نے مسکرا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ حاکم علی شاہ نے اس کا ہاتھ صبور احمد کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ "لو بھئی صبور احمد!



اسے عشق کے سکول میں داخل کر لو اور پہلا سبق پڑھا دو۔"

"پڑھو!......" صبور احمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولے۔ "الف...... اللہ! الف...... اللہ...... الف...... اللہ۔" احمد سبحانی ان کے پیچھے پیچھے پڑھنے لگا۔ "الف...... اللہ...... الف...... اللہ...... الف...... اللہ۔" وہ اتنا محو ہوا کہ اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ حاکم علی شاہ اور صبور احمد جا چکے ہیں۔ اس نے چونک کر غور کیا تو وہ لق و دق اور اجاڑ جگہ سے خوفزدہ ہو کر اونچی آواز میں پکارنے۔ "الف...... اللہ...... اللہ......" اس کی آنکھ کھلی تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ وہ اپنے قیمتی گھر میں قیمتی بیڈ پر سویا ہوا تھا اور وہیں اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ جلدی سے بیڈ سے نیچے اتر آیا اور قالین پر بیٹھ کر خواب کے متعلق سوچنے لگا۔

صبح ہو گئی تھی سورج کی ایک آدھ کرن اس کے کمرے میں پردوں کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پردے پرے کیے اور کھڑکی کا ایک پٹ کھولا تو تازہ ہوا نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ جلدی سے کھڑکی بند کر دیتا مگر اس کی نظر لان میں کرسی پر بیٹھی ہوئی فاطمہ پر پڑ گئی۔ وہ صبح صبح کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مگر احمد سبحانی کی حیرانی ہنوز برقرار تھی کہ فاطمہ کے تو کوئی ایگزام نہیں ہونے والے...... اور بالفرض ایگزام ہونے والے بھی ہوئے تو وہ اتنی سردی میں صبح صبح لان میں بیٹھی کتاب کیوں پڑھ رہی ہے؟ وہ اس لڑکی کو سنکی ہونے کا خطاب دینے والا تھا کہ اس نے دیکھا فاطمہ جھک کر اس کتاب کو چوم رہی ہے تو احمد سبحانی کو ساری صورتِ حال کا علم ہو گیا اسے یوں لگا کہ کسی نے اس کے بدن پر کرنٹ لگا دیا ہو۔ فاطمہ کے ہاتھ میں قرآن کریم تھا۔ وہ سرپٹ بھاگتا ہوا ننگے پاؤں ہی نیچے لان میں آیا تو فاطمہ اپنی جگہ سے اٹھ چکی تھی۔ وہ احمد سبحانی کو اس طرح بھاگتا دیکھ کر حیرانگی سے اپنی جگہ ٹھہر گئی۔

احمد سبحانی کا پیٹ تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے اندر باہر ہو رہا تھا۔ وہ فاطمہ کے ہاتھوں میں قرآن کریم کو پکڑے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "مم...... مجھے بھی سناؤ...... مجھے بھی یہ کلام سناؤ فاطمہ...... میری بہن۔"

فاطمہ نے اس طرح کبھی بھی اپنے بھائی کی کیفیت نہ دیکھی تھی۔ وہ سمجھی کہ احمد سبحانی شراب کی زیادتی سے بہک گیا ہے مگر اس نے دیکھا کہ وہ گھاس پر سجدہ ریز ہے اور رو رہا ہے۔ فاطمہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اسے کس طرح دلاسہ دے یا کیا سمجھائے؟

"بھائی...... بھائی...... احمد بھائی!" تیسری بار پکارنے پر اس نے سجدہ سے سر اٹھایا تو آنکھیں خون رو چکی تھیں۔

”مجھے پڑھ کر سناؤ خدا کے لیے...... فاطمہ!“ وہ دوبارہ گڑگڑایا۔

”بھائی! آپ وضو کر کے آئیں!“ فاطمہ نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اور سر پر کوئی رومال یا کپڑا بھی لپیٹ کر آیئے گا...... میں آپ کو قرآن پڑھ کر سناؤں گی۔“

”میں ابھی آتا ہوں...... جانا نہیں...... میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے دوبارہ اندر کی جانب دوڑ لگا دی۔ سعید علی اور زویا بیگم ان سے کچھ ہی دور یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر احمد سبحانی ان کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اس پر ”الف...... اللہ“ سوار ہو گیا تھا۔ وہ گرد و پیش سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ فاطمہ نے ان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

انہوں نے احمد سبحانی کو آتے دیکھا تو مجسموں کی مانند بے حرکت و بے جان ہو گئے۔ اب بھی احمد سبحانی نے ان کو نہ دیکھا تھا وہ فاطمہ کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا اور فاطمہ کرسی پر دوبارہ قرآن کریم کھول کر پڑھنے لگی۔

وہ جوں جوں قرآن کریم کی تلاوت کرتی جاتی تو احمد سبحانی کی آنکھیں دریا بہاتی جاتیں۔ وہ سجدہ میں گر گیا اور اس کا بدن ہچکولے کھانے لگا۔ فاطمہ نے سورۃ بقرہ کی آیت کا ترجمہ سنایا۔

”تم میرا عہد پورا کرو۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ہی ڈرو (۴۰) دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے مانگتے ہیں۔“ (۱۸۶)

فاطمہ نے قرآن کریم بند کر دیا تو کچھ دیر بعد احمد سبحانی بھی سجدے سے دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھ گیا۔ وہ اپنے پاس والدین کو کھڑے پا کر حیران اور شرمندہ بھی ہوا۔ سعید علی نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا تو اسے برسوں بعد ایک ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

”میں ترس گیا تھا کہ تم میرے سینے سے اس طرح لگو جس طرح بچپن میں......“ سعید علی کی آواز بھرا گئی۔

”میں کھو گیا تھا پاپا...... میں واپس آنا چاہتا ہوں۔“ احمد سبحانی کی نم آواز نے زویا بیگم اور فاطمہ کی آنکھیں بھی نم کر دیں۔

”اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اس کے دوستوں کی کمی نہیں ہے...... تم آج ہی شاہ جی کے پاس جاؤ۔“ زویا بیگم نے بھی آگے بڑھ کر احمد سبحانی



کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ”ہمیں یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے وسیلہ ہی عطا کیا ہے۔“

”میں ابھی جاؤں گا پاپا...... ابھی جاؤں گا۔“ احمد سبحانی اندر کی جانب بڑھ گیا تو سعید علی نے ایک پُرسکون سانس خارج کی جسے زویا بیگم نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

☆=======☆=======☆

ابھی وہ پاکستان کی حدود میں ہی تھا کہ اسے مغرب کی جانب سے اٹھتے ہوئے سیاہ اور گھنگور بادلوں کے تیور ٹھیک نہیں لگے۔ اس نے پریشانی کے عالم میں کسی محفوظ پناہ گاہ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب تیز آندھی آئے گی جو ہر چیز کو تہس نہس کر دے گی۔ وہ کسی ایسی جگہ رک کر اس طوفان کے گزرنے کا انتظار کرنا چاہتا تھا جس جگہ پر تیز آندھی اور بارش اس کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ وہ اس وقت ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ اس کی اُڑان میں ذرا برابر بھی تھکان کی جھلک نظر نہ آ رہی تھی۔ درختوں سے ہرا بھرا جنگل کراس کرتے ہی اس کی نظر دور ایک قلعہ نما عمارت پر پڑی۔ اس نے پروں کو تیز تیز پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔ اب ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا نے اس کی پرواز کی مخالفت کرنا شروع کر دی تھی۔

وہ طوفان کی رفتار بڑھنے سے پہلے اس عمارت تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ دور سے ہی اسے اچھی اور محفوظ پناہ گاہ لگتی تھی۔ یک دم ایک تیز آندھی کا گولہ سا اس کمزور اور ناتواں منو (شین) سے ٹکرایا وہ الٹی قلابازی کھاتا ہوا چند گز پیچھے کی جانب لڑھک گیا۔ اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔

وہ ایک بار پھر مصمم ارادہ سے آگے بڑھ گیا اور ہوا کا سینہ چیرتا ہوا تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ فی الحال اس کے سامنے ٹارگٹ وہ عمارت تھی۔ یک دم ایک قہقہہ سن کر اس کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے اُڑتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا تو اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ وہ اس قہقہے کو اپنا وہم سمجھ کر سفر جاری رکھتا ہوا منزل کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے آواز پھر ابھری۔

”تجھے جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ کیونکہ میری تمہاری کوئی لڑائی نہیں ہے۔“ شین نے اپنی پرواز جاری رکھی وہ عمارت کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ ”تم...... مجھے میرے ارادوں سے نہیں روک پاؤ گی۔“ اسے شاہ جی کی ایک بات یاد آ گئی جو انہوں نے وقتِ رخصت اسے کہی تھی کہ شیطان ملعون سے بچ کر رہنا۔ اس وقت شیطانی طاقت آندھی کی شکل میں شین کو مقدس و معطر

شہر کی جانب سفر کرنے سے روکنے کے لیے اپنا زور اور طاقت آزما رہا تھا۔
''اگر واپس لوٹ جانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں بحفاظت تمہارے گھونسلے تک پہنچا
ہوں۔'' آندھی نے ایک اور پینترہ بدلا۔ مگر شین اس لمحہ عمارت کی منڈیر تک پہنچ گیا تھا
نے دیوار میں بنے ہوئے ایک کھلے روشندان میں پناہ لے لی۔ اب اگر آندھی اپنا زور لگا
شین اندر گہرے اندھیرے میں گر سکتا تھا۔ کیونکہ سیاہ آندھی اور کالے بادلوں نے دو پہر
سیاہ رات کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ منو (شین) اس لمحہ کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ وہ اپنا سا
درست کرتا ہوا بولا۔ ''کبھی بادِ صبا سے ملی ہو؟'' جواب میں آندھی کا ایک چنگھاڑتا ہوا قہقہہ
ہوا اور پاس ہی ایک درخت اپنی جڑوں سے اکھڑتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ یہ اس کا جوشیلا
غصے سے بھرا قہقہہ تھا۔

''جو چیز انسانوں سے ناطہ جوڑ لے یا پھر اس سے نسبت قائم کر لے۔ وہ انسانو
طرح کوئی نہ کوئی نصیحت ضرور کرتی ہے۔''

آندھی کا غصہ دیدنی تھا۔ منو کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ روشندان میں دبکا ہوا بیٹھا
وہ آندھی کی باتیں سننے پر مجبور تھا۔ ''کیا کیا ہے انسان نے؟'' وہ نفرت سے بولی۔ ''ہاں
بتاؤ...... اللہ کو دیکھا بھی نہیں اور اعتماد اور اعتقاد کی تقریروں سے دوسرے انسانوں کو
وقوف بناتا ہے...... خود کتنا باعمل ہے۔ جانتے ہو؟ بیمار ہو جائے تو اللہ سے اعتقاد اٹھ
ہے۔ تندرستی کے لیے دولت کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔'' وہ چنگھاڑنے لگی تھی۔ اب تیز بارش
ہونے لگی تھی۔ وہ پھر بولی۔

''کوئی مریض راستے میں مر جائے تو کہتا ہے کاش...... کاش کہ ہم ہسپتال پہنچ پا
اس مریض کو زندگی بخش سکتے تھے۔ یا ڈاکٹر اس کی اس طرح موت نہ ہونے دیتا...... مگر
وعظ، خطبوں اور تقریروں میں کہتا ہے کہ موت کی ایک گھڑی مقرر ہے۔ نہ لمحہ آگے اور نہ
لمحہ پیچھے...... کیوں؟ کیوں اتنا تضاد ہے؟ اسی لیے کہتی ہوں بے وقوف ہے انسان اور تم
ان کی صحبت میں رہے ہو...... بکو...... کیا کہنے جا رہے تھے۔'' اس نے انسانوں کی خصلتو
غصہ نکالا تو منو اور بھی سہم گیا پھر بھی وہ ہمت کر کے بولا۔

''میں بادِ صبا کی بات کر رہا تھا۔ وہ بھی تو ٹھنڈی اور تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے اور تم
مختلف ہو؟'' وہ شین کی بات سن کر چنگھاڑنے لگی تو ایک اور درخت پر اس کا غصہ نکلا۔
''اسے ہم نے خاندان سے نکالا ہوا ہے۔ وہ پتہ نہیں صبح صبح کیا ذکر کرنے لگتی ہے



''اگر معلوم ہی نہیں کہ وہ کون سا اور کس کا ذکر کرتی ہے تو پھر اسے کیوں نکالا ہوا ہے؟''
شین کا حوصلہ بڑھ گیا تھا مگر وہ بھی بپھر گئی تھی۔ ''وہ انسانوں کا نقصان کرنے میں ہمارا ساتھ
نہیں دیتی اور اللہ اللہ بھی کرتی ہے۔'' اس بار قہقہہ لگانے کی باری شین کی تھی۔ ''ہاں! یہی
بات ہے کہ وہ تم سے مختلف ہے۔ وہ صبح صبح اللہ اللہ کرتی ہے۔ وہ خانہ کعبہ اور روضہ
رسول ﷺ کے گرد عقیدت سے طواف کرتی ہے اور تم ان چیزوں کے منکر ہو...... اور منکر کسی
بھی روپ میں ہو۔ عاشقِ رسول کا دشمن ہی ہوتا ہے۔'' شین کی آواز اس کے وجود اور قد سے
قدرے اونچی لگی تھی۔ آندھی حیرانگی سے بولی۔ ''اپنی اوقات مت بھولو منو...... ابھی تو تیز
بارش نے تجھے بچا لیا ہے۔ مگر یاد رکھنا۔ تم نے مجھے اپنا دشمن کہا ہے تو پھر ٹھیک ہے دشمنی ہی
سہی۔'' وہ آگ بگولا ہو گئی تھی۔ شین کو خوف پیدا ہو گیا کہ وہ اسے اندر کی جانب اندھیرے
میں دھکا نہ دے دے وہ مضبوطی سے اپنے پاؤں روشن دان کی چوکھاٹ پر جما کر اس کی بات
سننے لگا۔

''میرے اگلے وار کے لیے تیار رہنا منو! میں پھر آؤں گی۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک
شکل میں۔ خوفناک روپ میں۔ تم سے اپنی اس عارضی شکست کا بدلہ لینے...... مگر تب آؤں گی
جب تمہارے پاس کوئی اللہ والا نہ ہو گا اور نہ کوئی عمارت ہو گی۔'' وہ چنگھاڑتی ہوئی ایک طرف
کو نکل گئی۔ مگر شین کو حیران کر گئی۔ کیونکہ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے آس پاس
کوئی اللہ والا ہے...... مگر کہاں ہے؟ اور کون ہے؟ اس جنگل اور بیابان میں؟

شین اس سے آگے کچھ بھی سوچ نہ پایا تھا۔ کیونکہ سردی کافی بڑھ گئی تھی اور شام بھی
ہونے والی تھی۔ شین نے نیچے گہرائی میں عمارت کے اندر دیکھا تو ایک بزرگ کو زمین پر بچھی
ہوئی چٹائی پر لیٹے ہوئے پایا۔

وہ نیچے کی جانب اُڑ کر کمرے میں رکھی ہوئی اینٹوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ
بزرگ کے چہرے پر کافی نور ہے ان کے ہونٹ اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ متحرک
اور رب کریم کی ثنا میں مشغول ہیں اور بزرگ زندہ ہیں۔ اس نے سردی اور آندھی سے بچنے
کے لیے اس عمارت میں پناہ لی تھی۔ یہ وہ جنگل تھا جس میں چرند پرند اور درندے بکثرت
پائے جاتے تھے۔ انسانی زندگی کا تصور بھی محال تھا۔ مگر بزرگ کو پُرسکون انداز میں لیٹے
ہوئے دیکھ کر وہ حیران و پریشان تھا اور اسے آندھی کی بھی بات یاد تھی کہ اس کے پاس کوئی اللہ
والا ہے اور ان کے متحرک ہونٹ اس بات کا ثبوت تھے کہ حمد و ثنا بھی رب واحد کی ہی ہو رہی

ہے۔

شین نے یہ سوچ کر خاموشی اختیار کی اور عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ یہ عمارت کبھی انتہائی خوبصورت ہوگی۔ کیونکہ اس کی اینٹوں پر بنے ہوئے خوبصورت نقش و نگار مکینوں کی خوش ذوقی کا پتہ دیتے تھے۔ مگر اس جنگل میں انسانی زندگی کا تصور...... سمجھ سے بالاتر بات تھی۔ پھر اس کی نظریں دیواروں میں بنے ہوئے طاقوں پر گئیں تو ایک طاق میں پڑے ہوئے قرآن کریم کو دیکھ کر وہ متعجب ہوا۔ کیونکہ قرآن کریم کی جلد سے لگ رہا تھا وہ آج کل کے دور کی مشینوں پر پرنٹنگ ہوا ہے۔ جب کہ بزرگ کے حلیے اور لباس سے لگ رہا تھا کہ وہ کئی برسوں سے یہیں پر ہیں اور باہر نہیں گئے۔

''یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟'' وہ گردن اوپر کرتا ہوا رب تعالیٰ سے ملتمس ہوا۔

''یہ ہجر و وصال کا معاملہ ہے۔'' منو اس گونجدار آواز کو سن کر چونک گیا بلکہ دہل گیا۔ اس نے بزرگ کی جانب نگاہیں کیں تو دیکھا وہ اٹھ کر بیٹھ رہے تھے۔ اب ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد رو رو کر حلقے پڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان آنکھوں کے نیچے رو رو کر نالیاں بن گئیں ہوں جو زمین کو سیراب کرتی ہوں گی۔ وہ شین کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے اور شین ان سے نظریں چرا گیا۔

''کیا کھاؤ گے؟'' شین ان کے اس طرح پوچھنے پر حیران رہ گیا۔ کیا یہ کوئی ہوٹل ہے کہ میں چوری کی فرمائش کروں گا اور ابھی چوری حاضر ہو جائے گی۔ اسے بزرگ کی ذہنی تو بہکی ہوئی لگی۔ مگر وہ حیران بھی تھا کہ بزرگ اس کی اور وہ ان کی زبان سمجھ رہے ہیں۔

''مہمان بے زبان ہوتا ہے اور تم تو ہو ہی ایسے کہ تمہاری زبان ہر انسان نہیں سمجھ سکتا۔'' انہوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور پھر شین کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک چاندی کا کٹورا ہے جس میں تازہ روٹی کی گھی اور شکر سے بنی ہوئی چوری تھی۔ انہوں نے وہ کٹورا شین کے آگے رکھتے ہوئے کہا ''کھالو!'' منو شین نے کھانے کی بجائے سوال پوچھ لیا۔

''آپ کون ہیں؟'' وہ ہونٹوں پر مسکان سجاتے ہوئے بولے۔

''تم نے طوفان کا مقابلہ کیا ہے۔ تمہارے پر شل ہو رہے ہوں گے۔ اس لیے پہلے کھالو۔ پھر ساری رات باتیں ہی کریں گے۔''

وہ خاموش ہو گئے تو شین نے محسوس کیا کہ وہ اب کچھ نہیں بولیں گے۔ وہ مزے مزے



سے چوری کھانے لگا۔ حالانکہ کبوتر کو دانہ اور باجرہ کھانا چاہیے تھا مگر اس نے خواہش کی تھی کہ چوری مل جائے اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش اس ویران جنگل میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پوری کر دی تھی۔ ایک کٹورے میں پانی بھی نہ جانے کب آ گیا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا پیا اور بزرگ کی مہمان نوازی کا حقیقی لطف اٹھایا۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر اس نے ذہن میں سوالوں کا پنڈورا بکس کھول کر بزرگ کے نورانی چہرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کے متحرک ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ کچھ نہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ چند لمحات یونہی گزر گئے تو بزرگ نے آنکھیں کھول دیں اور شین کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''اب پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' ان کی آواز میں شیرینی نے شین کو کافی متاثر کیا تھا۔

''آپ کون ہیں؟'' شین کا سوال اپنی جگہ پر اڑا ہوا تھا مگر اس بار بزرگ کا مشفقانہ رویہ دیکھ کر اس نے پہلے ہی سوال میں ایک اور فقرے کا اضافہ کر لیا تھا۔ ''اور اس ویران اور سنسان جنگل میں کیا کر رہے ہیں؟'' وہ اس کا سوال سن کر ہنسنے لگے۔ ''یہ جنگل ویران اور سنسان تو نہیں ہے۔ یہاں تو خدا کی بہت ساری مخلوق آباد ہے۔'' شین ان کا اشارہ سمجھتا ہوا بولا۔ ''مگر وہ مخلوق تو انسانوں کی جان کی دشمن ہے۔''

''مگر وہ اب انسانوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ انسانوں سے بڑا درندہ اور خونخوار جانور کوئی نہیں ہے۔'' اس کی آنکھوں کے سامنے ہسپتال میں خودکش دھماکے کا منظر گھومنے لگا۔ ''انسان بھی اور جانور بھی؟'' اس کا ذہن الجھ گیا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''پیٹ کی بھوک انسان کو جانور بنا دیتی ہے۔ وہ چھینا جھپٹی میں اپنے پرائے کی پہچان بھول کر انسانیت کا خون بھی کر ڈالتا ہے اور جب اس کی اولاد بھوک سے بلکنے لگتی ہے تو وہ خونخوار درندے سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔'' وہ کچھ دیر رکے اور پھر بولے۔

''یہ جنگلی حیات مجھے کچھ نہیں کہتیں۔'' شین نے محسوس کیا کہ سردی بڑھ گئی ہے۔ وہ ہلکی سی ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا مگر اس بات کا وہ بزرگ سے ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ دیوار میں بنے ہوئے آتشدان میں آگ بھڑک اٹھی۔ حیرت کی بات تھی کہ لکڑیاں تازہ تھیں اور آتشدان اتنا ہی پرانا تھا۔ جتنی پرانی عمارت تھی۔ شین نے حیرانگی سے بزرگ کی طرف دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ

پھیل گئی۔

''ہر چیز اور ہر کام عبادت بن سکتا ہے۔'' وہ بزرگ پھر بولے۔ ''اگر اس کام کو کرنے کا سلیقہ ہو تو...... مگر انسان بے قرینہ ہے۔ اسے عبادت نہیں کرنا آتی۔ اسے ''یار'' نہیں منانا آتا۔''

''میں نادان اور ناسمجھ ہوں مگر میں نے دیکھا ہے کہ احمد سبحانی اور حیاء طوائف نے تو یار منا لیا ہے۔'' شین نے بات کو آگے بڑھایا تو وہ مسکان ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولے۔

''یار منانا اور اس کی فرمائش پوری کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ابھی تو آغاز ہے۔ انجام تک تو بہت کچھ دیکھو گے۔ ابھی ان راہوں پر نکلے ہو تو بہت سے دیوانے ملیں گے۔ وہ بھی ملیں گے جن کو عشق نے ٹھکرا کر زمانے کی ڈھول بنا دیا ہے۔'' آخری فقرہ ادا کرتے وقت ان کا لہجہ غمگین ہو گیا تھا۔

''میں نے پوچھنے کی جسارت کی تھی کہ آپ اس جنگل میں اور اس حالت میں کیسے؟''
شین بھی رات گزارنا چاہتا تھا اور رات گزارنے کے لیے یہ بہترین جگہ اور یہ بزرگ اچھے میزبان تھے۔ اس نے سوچا کہ باتیں کرتے ہی رات گزر جائے تاکہ اس کی آنکھیں بھی کھلی رہیں اور وہ اس اللہ والے کے حالات سے بھی آگاہی حاصل کر لے گا۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ بزرگ کی باتیں اس کے سفر میں زادِ راہ ثابت ہو سکتی ہیں اور پھر صبور احمد نے بھی کہا تھا کہ راہِ عشق میں تمہیں بہت سے مسافر ملیں گے۔ ان کی دو باتیں صحیح ثابت ہو گئی تھیں۔ پہلا تو شیطان نے آندھی کے ذریعے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی اور دوسرا یہ بزرگ تھے۔ جو راہِ عشق میں ملے تھے ان کا نمبر پہلے مسافر کی حیثیت سے شین نے دل پر لکھ لیا تھا۔

''میں نے کہا تھا کہ یہ ہجر و وصال کا معاملہ ہے۔'' بزرگ اس کا تجسسانہ سوال سن کر کھو گئے۔ ''ہجر کا روگ بہت برا ہے مگر......'' وہ ایک بار پھر خاموش ہوئے تو شین کو بے چینی لگنے لگی۔ وہ ان کی طرف ملتمس نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میرا نام عثمان غنی ہے۔ میرا تعلق اس ملک کے شہر ملتان سے ہے۔'' بزرگ جن کا نام عثمان غنی تھا۔ ان کی کہانی شروع ہوئی تو شین توجہ سے سننے لگا۔ ''ہمارا گھرانہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ ہماری کوئی بہن نہ تھی میں دو بھائیوں سے چھوٹا تھا۔ والدین کو معلوم تھا کہ مجھے قرآن اور صاحبِ قرآن کی ذاتِ مقدسہ سے والہانہ عشق ہے۔ انہوں نے مجھے سرزمین مقدس یعنی سعودی عرب بھیج دیا۔ میرے دل کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ میں نے



جی بھر بھر کر طواف کعبہ سے لطف اٹھایا۔ غلاف کعبہ کو بوسے دیئے۔ رب کریم کے گھر میں بے پناہ سجدے کیے اور پھر اپنے تشنگی سے بھرپور عشق کو سیراب کرنے کے لیے دیدارِ محبوب ﷺ الٰہی کے شہر کو روانہ ہو گیا۔''

عثمان غنی یہ کہہ کر خاموش ہوئے تو شین کی بے چینی مدینہ منورہ کے ذکر پر مزید بڑھ گئی۔ وہ بے چینی اور بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ''پھر کیا ہوا جناب؟'' اس سے رہا نہ گیا وہ بے صبری سے بولا لیکن عثمان غنی رو رہے تھے۔ ان کے لب تھرتھرا رہے تھے۔ انہوں نے سرخ آنکھوں سے شین کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکان ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولے۔ ''میں اپنے اس پہلے سلام کو نہیں بھول سکا جو میں نے تاجدارِ انبیاء کے حضور پیش کیا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں اس حالت میں موت کا طلبگار ہو گیا تھا۔ کیونکہ حقیقتاً مجھے ایسا لگا کہ میں جس ہستی کی بارگاہ میں سلام کا نذرانہ پیش کر رہا ہوں وہ کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی میرے سامنے کھڑی ہے...... بس...... میں اس کے بعد زیست کا کوئی بھی لمحہ زندگی کی گود میں گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اس کے بعد کچھ بھی نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر...... میری دعا عارضی طور پر دعاؤں کے خزانے میں جمع کر لی گئی۔ میں وہیں رہنے کی التجائیں کرنے لگا۔'' وہ اپنا سانس درست کرنے کے لیے خاموش ہوئے تو شین آنکھیں جھپکنا بھولا ہوا تھا۔ اس نے بھی آنکھوں کو پُرسکون کرنے کے لیے پلکیں جھپکیں تو محسوس ہوا کہ منوں بوجھ ذہن سے اتر گیا ہو۔ مگر اس کی ساری توجہ عثمان غنی کی جانب مبذول تھی۔ وہ پُرامن شہر کے باسی اور والئی کائنات کی باتیں پُرسکون ہو کر سن رہا تھا۔ عثمان غنی دوبارہ بولے۔

''مجھے باعثِ تخلیقِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی نظرِ کرم سے مدینہ شہر کی پولیس انتظامیہ میں ملازمت مل گئی۔ میں اپنی نوکری پُرخلوص اور ایماندارانہ طریقے سے کرنے لگا۔ نوکری ٹائم سے فارغ ہونے کے بعد میں رات کو روزانہ باوضو ہو کر دربار رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو کر باب جبرائیلؑ کی جانب دوزانو ہو کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں آنکھیں بند کر کے درود و سلام کے گجرے سرکار مدینہ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں عقیدت و محبت و احترام سے پیش کرتا۔ یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ اس دوران میں اپنے والدین اور بھائیوں کو یکسر بھول گیا تھا۔ والدہ میری جدائی میں اپنی بینائی کھو بیٹھی۔ والد صاحب، اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ایک دن خواب میں مجھے اپنی والدہ کی زیارت ہوئی جو مجھے کہہ رہی تھیں کہ تم اس دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہو۔ جو آقائے تاجدار مدینہ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے دن

رات موجود ہو۔مگر بیٹا! ایک بار آکر اپنی ہجر کی ماری ماں کو صورت دکھا جاؤ...... میری بدقسمتی کہ میں نے خواب میں بھی ماں کو انکار کر دیا تو انہوں نے مجھے ایک ہی بات کہی کہ ہجر کا روگ جان لیوا ہوتا ہے۔کبھی لگا تو جان جاؤ گے۔صریحاً میں نے والدہ کی نافرمانی کی تھی مگر نبی معظم ﷺ کی حدیث بھی اٹل حقیقت ہے کہ اس شخص کا ایمان مکمل نہیں ہوگا جسے میں اس کے والدین، بہن بھائی اور دیگر رشتہ داروں اور مال و دولت سے زیادہ محبوب نہیں ہو جاتا...... بس...... میرے ذہن اور دل و دماغ میں یہی فرمانِ نبی ﷺ بس گیا تھا۔میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ آقائے مدینہ نے فرمایا ہے کہ ماں کی خدمت کو ہر حال میں اول جانو...... بس...... بس...... یہیں سے میں عشق سے مار کھا گیا...... عشق نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا۔''

عثمان غنی خاموش ہوئے تو شین کی دلچسپی اور بڑھ گئی وہ اپنی بے قراری چھپا نہ سکا اور بولا۔

''پھر......'' عثمان غنی اس کبوتر کی جانب دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں یہیں ایک خطا کر گیا تھا۔میں نے ماں کے پیغام کو کوئی اہمیت نہ دی اور دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہا۔میرا اٹھنا بیٹھنا مدینہ کے اعلیٰ پائے کے علمائے کرام کے ساتھ ہو گیا تھا۔میں نے دن رات ایک کر کے اللہ کے محبوب ﷺ کے حضور درود و سلام کے گجرے پیش کیے تھے۔اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے محبوب ﷺ سے عشق کی بدولت بے پناہ درجہ بخشا......مگر مجھے میری نادانی کی سزا اب بھی مل رہی ہے۔'' عثمانِ غنی خاموش ہو گئے تھے۔وہ بھی کئی برسوں بعد کسی سے محوِ کلام ہوئے تھے۔کوئی ان کو بھی مل گیا تھا جو ان سے سوال کرتا تھا۔وہ دنیا کے لیے بے زبان کبوتر تھا مگر وہ اس لمحہ عثمان غنی کی باتیں سن اور سمجھ رہا تھا اور اپنی باتیں سنا بھی رہا تھا۔وہ اس لمحہ عثمان غنی کے لیے رحمتِ خداوندی سے کم نہ تھا۔

''مگر آپ یہاں کیسے؟ اور کب تک رہیں گے؟'' شین کی بات سن کر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''میں مدینہ شہر کی پولیس میں تھا۔میری ڈیوٹی تھی کہ کوئی بھی سرکار ﷺ کے روضہ مبارک کی جالیوں کو نہ چھوئے۔نہ ہی ہاتھ لگائے اور نہ ہی بوسہ دینے پائے۔میں اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے کرتا تھا۔مگر ایک رنج بھی ہوتا تھا کہ میں تو جی بھر بھر کر ان مبارک جالیوں کو بوسے دیتا ہوں۔ان کی اپنے ہاتھوں سے صفائی بھی کرتا ہوں مگر دنیا بھر سے آئے ہوئے عشاق مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ زیادتی بھی کرتا ہوں۔ہمارا آفیسر کافی سخت اور کرخت طبیعت کا بندہ تھا اس نے چند عشاق کو رعایت دینے پر میرے ساتھی کو نوکری سے نکال دیا تھا۔اس



کی تبدیلی مکہ معظمہ کر دی تھی اور میں اس جگہ سے اپنی ڈیوٹی تبدیل نہ کرنا چاہتا تھا بلکہ اسی ڈیوٹی کی حالت میں مرنا چاہتا تھا۔

اور پھر ایک دن وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔میں نے دیکھا کہ میرا آفیسر ایک جگہ کھڑا ہو کر ہماری نگرانی کر رہا ہے اور وہ کسی بھی قسم کی بھول چوک معاف کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔بس میں الرٹ ہو کر اپنی خدمات انجام دینے لگا۔نمازیوں اور عشاق کی اَن گنت تعداد قطاریں بنائے مواجہ شریف کے سامنے سے گزریں اور عشاق سلام کرتے ہوئے محبت اور عقیدت سے درود پڑھتے ہوئے سنہری جالیوں کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ہر کام ایک ضابطہ اور ڈھنگ سے ہو رہا تھا۔مگر میری طبیعت بے چین اور بے قرار ہو گئی تھی کچھ بھی نہ سمجھ میں آنے والی پریشانی نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔میں نے دیکھا کہ ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا جس نے سفید بے داغ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔وہ باب جبرائیلؑ کی جانب سے جھومتا جھامتا اندر داخل ہوا۔تو میری چھٹی حس پھڑکنے لگی۔مگر میں نے نظر انداز کر دیا۔کیونکہ وہاں پر عشاق کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔وہ بچہ بھی اسی سمندر کی ایک لہر تھی۔

وہ سیدھا جالی مبارک کی طرف بڑھنے لگا۔میرے دل کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔وہ میری طرف ہی آ رہا تھا۔جبکہ باقی لوگ دور سے سلام وعقیدت کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ میں چوکنا ہو گیا تھا اس نے یک دم ایک فرلانگ بھر چھلانگ لگائی اور جالیوں کو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا۔یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہوا کہ مجھے سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا کروں۔کیونکہ وہ بچہ تھا۔میں اس پر چھڑیاں نہیں برسانا چاہتا تھا۔میں نے اسے کمر سے پکڑ کر پیچھے کی جانب کھینچا مگر اس کی جالیوں پر گرفت مضبوط تھی۔میں اسے پیچھے کی جانب کھینچتا تھا مگر وہ کافی وزنی ہو گیا تھا۔میں نے یک دم اپنے آفیسر کی جانب دیکھا تو وہ ہماری اس دھینگا مشتی کو ہی دیکھ رہا تھا۔میرے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ اگر میں اس لڑکے پر چھڑیاں برساؤں تو میری نوکری بچ سکتی ہے...... میں نے آفیسر کے خوف اور تبدیلی کے ڈر سے اس بارہ تیرہ سالہ بچے پر زور زور سے چھڑیاں برسانا شروع کر دیں۔

اس کے وجود اور ہاتھوں میں کوئی بھی لچک نہ پا کر میرے ساتھی پہریداروں نے بھی میرا ساتھ دیتے ہوئے اس بچے پر چھڑیاں برسانا شروع کر دیں تو اس نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ اس کا وجود پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ہماری بھی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔میں جانتا تھا کہ جتنی شدت اور زور سے اس کے جسم اور ہاتھوں پر چھڑیاں برسائی گئی تھیں۔کرب اور دکھ اس

کے چہرے سے نمایاں ہوگا۔ مگر ہم سب کی حیرت دوگنی ہوگئی جب اس کے چہرے پر نور برسنے لگا اور وہ مسکراتا ہوا بولا ''عثمان غنی...... تم عشق کے امتحان میں فیل ہوگئے ہو...... تمہارا پرچہ انتہائی خراب ہوا ہے۔ تم نے بوٹی لگانے کی کوشش کی ہے۔'' وہ مسکرا بھی رہا تھا اور بول بھی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ملال وحزن کی بجائے اطمینان اور سکون تھا۔ ''جانتے ہو عثمان غنی! تم نے بوٹی کہاں لگائی ہے؟'' وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس لمحہ اس کو پکڑ کر ہم لوگ باب جبریلؑ سے باہر لے آئے تھے۔ میں حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا اس کی طرف متوجہ تھا۔ ''تم نے اپنے آفیسر کی طرف اس خوف سے دیکھا کہ کہیں تمہاری نوکری نہ ختم ہوجائے۔ مگر عثمان غنی! اس لمحہ تم کائنات کے اعلیٰ ترین آفیسر ﷺ کو بھول گئے تھے۔ بس وہی لمحہ تھا جب تمہارے دل میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ نہ تھا...... بس نوکری اور دو وقت کی روٹی کا ڈر تھا۔ تمہارا اعتبار رب تعالیٰ کی ذات سے ختم ہوکر آفیسر کی ذات پر ٹھہر گیا تھا...... بس...... بس...... عثمان غنی...... جو عشق کے امتحان میں فیل ہوجائیں۔ ان کے مقدر میں ہجروفراق کے موسم لکھ دیئے جاتے ہیں۔''

میرے ساتھ ساتھی بھی اس کی باتیں حیرانگی سے سن رہے تھے مگر وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب تھا۔ وہ پھر بولا ''تم نے میرے سینے...... ہاتھوں اور جالی مبارک کے درمیان جو جدائی ڈالی ہے۔ اس کو سہنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا۔ ہجر کی آگ میں جلنے کے لیے تیار ہو جاؤ عثمان غنی!'' وہ اٹھا اور ایک طرف بھاگ گیا۔ مگر اس کی باتیں اور براہِ راست مجھے مخاطب کر کے جو کچھ کہا گیا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔

اسی وقت میرے آفیسر نے مجھے طلب کرلیا اور مجھے نوکری سے عارضی طور پر فارغ کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ بچہ میری غفلت سے ہی جالیوں تک پہنچا تھا۔''

شین کی دلچسپی بڑھ گئی تھی وہ غور سے روتے ہوئے عثمان غنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جب خاموش ہوجاتے تو وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگتا۔ رات بھی کسی خراب اور پنکچر گاڑی کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ عثمان غنی ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولے۔

''میں نوکری سے فارغ ہونے کے بعد اداس اور غمگین ہوگیا تھا۔ جن سنہری جالیوں کی حفاظت پر میں مامور تھا۔ ان جالیوں کو مجھے بھی چومنے کی اجازت نہ تھی۔ میری بے چینی اور بے قراری بڑھتی تو میں جنت البقیع میں قبور پر فاتحہ خوانی کرنے چلا جاتا۔ اسی طرح ایک دن دوپہر کو تیز آندھی اور کالی گھٹاؤں نے رات میں تبدیل کیا تو میں جنت البقیع میں موجود تھا۔



میں اندھا کر دینے والی آندھی سے بچتا ہوا آگے کی جانب بڑھنے لگا تو ایک آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ میں نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا۔ جو میری نوکری برخاست ہونے کا سبب بنا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر وہی دل فریب مسکراہٹ تھی وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور منتظر رہا کہ وہ بات کا آغاز کرے۔ وہ چند لمحے منہ میں کچھ پڑھتا رہا اور پھر بولا۔

''کیسا محسوس کر رہے ہو...... عثمان غنی؟'' اس کا لہجہ مٹھاس سے بھرپور تھا مگر میں کوئی بھی جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا وہ دوبارہ بولا۔ ''عثمان غنی! عشق کی ابتدا بہت مشکل ہے۔ انتہا بہت آسان۔'' میں حیرانگی سے استفسار کر بیٹھا۔ ''میں سمجھا نہیں؟''

''تمہاری سزا تو آج سے شروع ہوگی۔ محض نوکری جانا ہی تمہاری سزا نہ تھی۔ اتنے دن تمہارے خلاف جو چارج شیٹ تیار ہوتی رہی ہے۔ وہ اب ''سپریم کورٹ'' میں چلی گئی ہے اور سپریم کورٹ نے فیصلہ سنایا ہے کہ تمہیں سزا کے طور پر ملک بدر کیا جائے...... اور ایسی جگہ پر تمہیں قید کر دیا جائے جہاں تم انسانوں کی شکل وصورت کو ترس جاؤ۔'' میں یہ سزا سن کر کانپنے لگا۔ میری سمجھ میں اس کی باتیں نہ آرہی تھیں۔ وہ کس سپریم کورٹ کی بات کر رہا تھا۔ یہ میری سمجھ سے اونچا معاملہ تھا۔ مگر وہ بچہ جو میری عمر سے تین گنا چھوٹا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے آپ سے تین گنا بڑا لگنے لگا۔ میں اس سے ہمت کر کے پوچھ بیٹھا کہ وہ کون ہے۔ تو اس کا جواب سن کر میری جان ہی نکل گئی۔ اس نے کہا کہ وہ سرکارِ مدینہ سرورِ قلب ﷺ وسینہ کا عاشق ہے۔ اس نے کئی بار آقائے دو جہاں کی زیارت سے فیض یابی حاصل کی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا چلتا پھرتا پرچارک ہوں۔ میں رب تعالیٰ سے براہِ راست دعا گو ہو جاتا ہوں...... وہ عظمت والا خدا میری دعا اور آہ کو رَد نہیں کرتا۔ کیونکہ میں یتیم و مسکین ہوں اور اس کے محبوب ﷺ کا عاشق ہوں اور اس کا محبوب ﷺ خود یتیم پیدا ہوا تھا اور یتیموں مسکینوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ اسی لیے میں نے تمہارے لیے دعا کی کہ تمہیں ہجروفراق سے نوازا جائے اور اللہ تعالیٰ نے میری فریاد سن لی ہے۔

مگر میں اس رحمتہ العلمین کا ادنیٰ غلام ہوں۔ میں بھی ان کے حضور اپنا مقدمہ پیش کروں گا۔ اپنی مجبوری اور التجائیں بیان کروں گا۔ میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"تمہارا امتحان آقائے دو جہاں نے ہی لیا ہے اور تم بوٹی لگاتے ہوئے پکڑے گئے ہو اور فیل شدہ عاشق کو سزا بھی عشق کے قوانین کے تحت دی جاتی ہے۔"

ٹھیک ہے میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں مگر میں دورانِ قید جو چاہوں مجھے ملنا چاہیے۔ وہ پھر ہنستا ہوا بولا۔ "تم مجرم ہو۔ شرطیں عائد نہیں کر سکتے۔"

"مگر میں رحمۃ للعلمین کا اُمتی ہوں۔"

"بس یہی تمہیں رعایت ملے گی۔ قید کے دوران جس چیز کی خواہش کرو گے تمہیں مل جایا کرے گی۔" مگر اس قید کی مدت کیا ہوگی؟ میں نے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"عشاقِ مصطفیٰ ﷺ کی عدالت میں یہ شق موجود ہے کہ دورانِ قید کوئی بھی عاشقِ رسول کسی بھی رنگ نسل چرند، پرند اور انسان سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ تم سے آ کر ملے اور تم اس سے اپنی غلطیوں کے ازالے کے لیے برملا غلطیاں تسلیم کرو گے تو اسی دن تمہاری قید ختم ہو جائے گی۔ آنکھیں بند کر کے مدینہ شریف کا تصور کرنا دوبارہ یہیں پہنچا دیے جاؤ گے...... بس اب تمہاری قسمت ہے کہ تمہیں عاشقِ رسول کب ملتا ہے؟" وہ خاموش ہوا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔ "چونکہ عاشقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو نام بھی انہی کی نسبت سے ہے۔ یعنی میرا نام محمد ہے۔"

"میں آخری بار آقائے دو جہاں کے حضور درود و سلام کے گجرے نچھاور کرنا چاہتا ہوں۔" میں عرض گزار ہوا تو وہ ہنستا ہوا بولا۔ "تم میں اور مجھ میں یہی تو ایک فرق ہے۔ تاجدارِ مدینہ ﷺ دنیا میں کہیں بھی آپ ﷺ پر پڑھا جانے والا درود و سلام سنتے ہیں۔ اللہ حافظ!"

اس کی بات سن کر میں ششدر و پریشان کھڑا تھا کہ زوردار بجلی کے کڑاکے نے پورا ماحول روشن کر دیا۔ میں حیرانگی سے چاروں طرف دیکھنے لگا تو میں اس جنگل میں موجود تھا۔ بجلی کی کڑک اور خوفناک طوفانی بارش سے بچنے کے لیے میں نے اس عمارت میں پناہ لے لی۔ مگر میرے اندر آنے کے بعد اس عمارت کے دروازے دوبارہ کبھی نہیں کھلے۔"

عثمان غنی خاموش ہوئے تو رات بیت چکی تھی۔ شین ان کی کہانی میں اس قدر محو ہوا تھا کہ رات گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ اپنی دلچسپی بڑھاتا ہوا بولا۔ "مگر اب یہ سزا کیسے ختم ہو گی؟" عثمان غنی مسکرانے لگے۔

"میری سزا ایک عاشقِ رسول کی آمد سے ختم ہونی تھی۔ آج ختم ہو گئی ہے۔ کیونکہ تم عشق کا ایک حصہ ہو اور عشق بھی وہ جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ تم نے اولیاء کرام کی عزت و



تکریم کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کا صلہ یہ دیا کہ تمہیں شہرِ امن کا مسافر بنا دیا اور عشق کا شین بنا کر میری رہائی کا پروانہ دے کر بھیجا ہے۔" شین اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

"اب آپ کہاں جائیں گے؟"

"میرا محمد احمد سے معاہدہ طے پایا تھا کہ میں جب اس عشق کی قید کاٹ کر آؤں گا تو وہ مجھے دوبارہ ان جالیوں کی حفاظت پر مامور کروائے گا۔ اس کی شرط یہ بھی تھی کہ عاشقِ مصطفیٰ ﷺ جو کہ خالصتاً شہرِ مدینہ کا مسافر ہو۔ وہ تمہاری مہمان نوازی سے خوش ہوا تو تمہاری سزا ختم ہو جائے گی۔ تو شین...... کیا تم میری مہمان نوازی سے خوش ہوئے ہو؟" عثمان غنی کا سوال سن کر شین کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

"آپ کی مہمان نوازی نے تو مجھے خرید لیا ہے جناب! میں قربان جاؤں سوہنے آقا ﷺ کے اپنے شہر کی جانب سفر کرنے والے مہمانوں کی مہمان نوازی کا اس طرح خیال کیا کہ اپنے روضہ کی حفاظت پر مامور پہریدار کو ایک بے زبان عاشق کا میزبان بنا دیا۔ سبحان اللہ!" شین کی آواز بھرا گئی تھی۔

"میں نے اک اک پل رو رو کر گزارا ہے۔ مجھے اپنی ماں کی بات ایک پل بھی نہیں بھولی کہ جب ہجر و فراق میں جلو گے تب پتہ چلے گا۔ بس میں پچیس سالوں سے محبوب ﷺ خدا کے ہجر کی تپش میں جل رہا ہوں۔ اس ہجر میں بہت لطف ہے مگر جدائی ہر روز دل و جگر کو جلاتی اور تڑپاتی ہے کیونکہ۔

"ہجر ایک کیفیت کا نام ہے۔ ہجر اک مستی ہے۔ ہجر اک جذبہ ہے۔ ہجر محبوب کی یاد کا نام ہے۔ ہجر تڑپنے کا نام ہے۔ ہجر سنبھلنے کا نام ہے۔ ہجر عطائے محبوب کا نام ہے۔ ہجر وفائے عاشق ہے۔ اسی لیے ہجر عشق میں جلنے کا نام ہے۔ ہجر محبوب قسمت والوں کو ہی ملتا ہے۔ اسی لیے جس کو بھی ہجر محبوب حاصل ہوتا ہے۔ تو اس شخص کو وہ روحانیت اور وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو سینکڑوں سال کی عبادت سے بھی نہیں مل سکتا۔ اسی لیے عشاق کرام صدمۂ ہجر کو برداشت اور پسند کرتے ہیں۔"

شین اس عاشق کو دیکھ رہا تھا جس نے پچیس سال ہجر کی آگ میں جل کر اپنا آپ کندن بنا لیا تھا۔

عثمان غنی پھر بولے۔ "اس ہجر کی آگ نے مجھے آقائے مصطفیٰ ﷺ کے اور قریب کر دیا ہے۔ صبح میری قید کے پچیس سال پورے ہو جائیں گے اور پھر تم بھی عاشقِ رسول ہو۔ تم

نے میرا غم سنا اور پوچھا بھی ہے۔ میری میزبانی سے مطمئن اور خوش بھی ہو۔ شہرِ مدینہ کے حقیقی مسافر بھی ہو۔ اسی لیے میرا ہجر آج سے وصال میں تبدیل ہونے والا ہے۔ اگر مجھ سے پہلے روضۂ رسول ﷺ پر پہنچ جاؤ تو تاجدارِ مدینہ کو میرا اسلام ضرور کہنا۔''

''مگر وہ بچہ کون تھا؟'' شین کی پٹاری میں نہ جانے اور کتنے سوال تھے۔ ''کیا وہ اتنا بڑا عاشق تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ علم بخش دیا کہ وہ آپ کو قید بھی کر دے اور دوبارہ رہا بھی کر دے اور پھر انہی جالیوں کی رکھوالی پر مامور بھی کروا دے؟'' شین نے ذہن میں اس کلبلانے والا سوال کو نکال لیا تھا۔

''وہ انسانی روپ میں عشق تھا اور عشق کے دعویدار عثمانِ غنی کا امتحان لینے آیا تھا...... مگر افسوس کہ ایک عاشق عشق کو نہ پہچان سکا...... میرا سب کچھ رائیگاں ہو گیا...... یہ بہت نازک اور حساس معاملات ہیں۔ سوچ سمجھ کر چلنا مسافر مدینہ منو سوچ سمجھ کر۔'' شین کو اس نے پرانے نام سے پکارا تو اسے حیرت نہ ہوئی تھی۔ ''عشق کو پہچاننے کے لیے آگ اور شعلوں کے سمندر عبور کرنے پڑتے ہیں۔ ہجر کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔ عین، شین، قاف یہ وہ درجات ہیں جو اللہ کی بندگی سے نہیں ملتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیارے محبوب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ معطر و مطہر سے عشق کرنے سے ملتے ہیں اور عشق کی ابتدا ان کی آل سے ہوتی ہے اور آپ ﷺ کی آل کربلا کی خون آشام مٹی کو سرخرو کرنے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتی ہے۔ پھر کہیں جا کر عشق سرخرو ہوتا ہے۔''

عثمان غنی رونے لگے تھے۔ سردی کی ایک لہر نے اپنا کام دکھایا۔ کیونکہ آتشدان میں جلنے والی آگ بجھ چکی تھی۔ فجر کی اذان بھی ہونے والی تھی۔ اس سینکڑوں میل پر پھیلے ہوئے جنگل میں اذان کی آواز تو دور سے بھی نہ آ سکتی تھی۔

''میں آپ کے کیا کام آ سکتا ہوں۔ حکم کیجیے؟'' شین انتہائی عاجزی اور احترام سے عثمانِ غنی سے ملتمس ہوا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا اور اس کی نارنجی چونچ پر اپنی شہادت کی انگلی پھیرنے لگے۔

''ایک عاشق دوسرے عاشق کی یہی مدد کر سکتا ہے کہ محبوب ﷺ خدا کی بارگاہ میں جا کر میری غلطیوں کی معافی دلانے میں سفارش کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی بات کو نہیں ٹالتا اور اپنے محبوب ﷺ کے عشاق کی بات کو بھی کیسے رد کرے گا۔'' عثمان غنی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ ''میں صبح ہی یہاں سے رہا ہو جاؤں گا۔''



''میں آپ کے کیا کام آ سکتا ہوں۔ حکم کیجیے؟'' شین انتہائی عاجزی اور احترام سے عثمانِ غنی سے ملتمس ہوا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا اور اس کی نارنجی چونچ پر اپنی شہادت کی انگلی پھیرنے لگے۔

''ایک عاشق دوسرے عاشق کی یہی مدد کر سکتا ہے کہ محبوب ﷺ خدا کی بارگاہ میں جا کر میری غلطیوں کی معافی دلانے میں سفارش کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی بات کو نہیں ٹالتا اور اپنے محبوب ﷺ کے عشاق کی بات کو بھی کیسے رد کرے گا۔'' عثمان غنی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ ''میں صبح ہی یہاں سے رہا ہو جاؤں گا اور عشق کا وعدہ ہے کہ وہ مجھے وہیں پر سرفراز کرے گا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو ان شاء اللہ مدینہ شریف میں ملاقات ہو گی۔ مجھے جمعۃ المبارک کو جنت البقیع میں ضرور ملنا...... اب تم آرام کر لو...... میں نماز پڑھ لوں۔''

عثمانِ غنی نے شین کو آہستگی سے زمین پر اتار دیا۔ ''وہ اللہ ھو...... اللہ ھو'' کا ورد کرتا ہوا ایک کونے میں چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ دیوار سے پانی ایک نل کی صورت میں نکل رہا ہے اور عثمانِ غنی وضو کر رہے تھے۔

پھر شین کی بھی آہستہ آہستہ آنکھ لگ گئی وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ''عشق'' کی آمد ہوئی اور اسے سہانے خوابوں کی دنیا میں لے گئی۔ وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کا عاشق ساتھی اسے پیار سے بوسہ دے کر اس عمارت سے شہرِ امن کی جانب چلا گیا ہے۔ آج وہ دروازہ پچیس سال بعد خود ہی کھل گیا تھا جسے عثمان غنی نے اپنی قید کے ابتدائی ایام میں سرتوڑ کوشش کر کے کھولنا چاہا تھا۔

☆=======☆=======☆

گھنگھروؤں کی جھنکار، طبلوں کی دھم دھم اور تماش بینوں کی بڑھکوں نے بازار میں عجیب سی ہلڑ بازی مچا رکھی تھی۔ پورے بازار کی رونق عروج پر تھی۔ ہر کوٹھے کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ شراب و شباب کی رنگین محفلیں رات گزرنے کے ساتھ ساتھ جوبن پکڑ رہی تھیں۔ نوخیز اور نوجوان بھنوروں کی بہتات ہی کاروبار کی اصل روح تھی۔ کوئی بک رہا تھا۔ کوئی خرید رہا تھا۔ کوئی بیچ رہا تھا اور کوئی بکنے کو تیار نہ تھا۔ کسی پر نوٹوں کی بارش اور نہ بکنے والی پر تشدد اور جبر کیا جا رہا تھا۔ ضمیر فروش اور بے غیرت مامے چاچے اپنی بھتیجیوں اور بھانجیوں کی عزتوں کی سرعام بولی لگوانے کے لیے انہیں بنا، سجا اور سنوار کر لائے تھے۔ کہ جیسے کوئی بیوپاری جانور کو

فروخت کرنے سے پہلے اس کی اون منڈوا کر مہندی لگا کر لاتا ہے۔ تاکہ اس کے جانور کا حسن دوبالا ہو جائے اور اچھا گاہک لگ جائے جو منہ مانگی قیمت ادا کر سکے۔

پان سگریٹ، بوتل بیچنے والوں کی چاندی ہو رہی تھی۔ وہ نقد والوں کو قدر کی نگاہ سے جبکہ ادھار والوں کو لبوں پر کاروباری مسکراہٹ سجا کر ڈیل کر رہے تھے اور ادھاریوں کو دل ہی دل میں سینکڑوں گالیوں سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ موتیے اور گلابوں کے ہار بھی دھڑا دھڑ بک رہے تھے۔ کوئی کم ظرف شراب زیادہ پی کر الٹیاں کر رہا تھا اور کوئی شراب کم ملنے پر گلہ شکوہ کر رہا تھا۔ کوئی آتا ہوا جیب میں نوٹوں کی گڈیاں تھپتھپا کر جیب گرم ہونے کے احساس سے خوش اور شاداں تھا جبکہ اسی جانب واپس جانے والا سب کچھ لٹا کر اداس اور غمگین ہو کر روتا ہوا اپنے مقدروں کو کوس رہا تھا۔

یہ ہر روز کا معمول تھا۔ سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح ہر روز ہوتا تھا لیکن آج کچھ غیر معمولی ہو گیا تھا کیونکہ اس بازار کی رونق ''حیاء'' کے کوٹھے کی روشنیاں بند تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی فوتیدگی ہو گئی ہو۔ مگر اس بازار کا اصول تھا کہ مرنے والا کوئی بھی ہو۔ ''دھندے'' کے وقت کوئی جنازہ نہیں ہوگا لیکن آج عجیب ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہر ایک کی زبان پر حیاء کا کوٹھا موضوع بنا ہوا تھا۔

کئی تماش بین اس کی سیڑھیوں پر کافی سارا روپیہ لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر کوٹھے کا دروازہ ہنوز بند تھا۔ یوں لگتا تھا کہ حیاء کہیں چلی گئی ہے۔ مگر اس کے چاہنے والوں کے دل اس بات کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ وہ بضد تھے کہ آج دروازہ کھلوا کر ہی دم لیں گے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں شرفاء کا کوئی کام نہ تھا بلکہ وہ اس جگہ سے کترا کر ہی گزرتے تھے لیکن اس وقت بہت سے شرفا کی اولادیں وہاں موجود تھیں۔ جو دن کی روشنی میں نیکی اور پرہیزگاری کی تلقین کرتے تھے اور رات کے اندھیرے میں اس طرح کی گندگی میں لتھڑنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی اپنی جیبوں میں اپنی نیک نامی کو دفن کر کے ضمیر نامی قبر کو روپوں کی گرمی سے ثواب پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یک دم ایک شور سا اٹھا تو بازار میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ جس کا جدھر بھی منہ اٹھا وہ گرتا پڑتا بھاگ گیا۔ اس وقت اپنی جان بچانے کی فکر تھی کیونکہ ''جبرو'' نامی بدمعاش کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ نام تو اس کا جبران تھا مگر یہ تب کی بات تھی جب وہ پرائمری میں پڑھتا تھا۔ ماسٹر کے مارنے پر وہ ماسٹر صاحب کا قتل کر کے جبرو بن گیا تھا۔



اس کی پورے شہر میں دھاک تھی۔ بدمعاشی ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا بھی بدمعاشی تھا۔ شہر کے نامی گرامی بدمعاش اس کے گھٹنوں کو چھو کر کام پر جاتے تھے۔ کسی کو بھی قتل کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بعض اوقات حکومتی لیڈر اور سیاسی لوگ بھی اس سے منہ مانگا معاوضہ دے کر اپنا اپنا کام نکلوایا کرتے تھے۔ بس ایک سرپھرے ڈی ایس پی سے متھا لگا بیٹھا تھا اور گزشتہ چھ ماہ سے جیل میں تھا۔ وہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر نکلا تھا اور آج ''کام'' پر آ گیا تھا۔ پورے بازار میں وہ دھان پان سی سرو قد بیس سالہ حیاء کا دیوانہ تھا اور حیاء ہی اس کی جان تھی۔ اس نے کئی بار نوٹوں کی مدد اور بدمعاشی کی کوشش سے حیاء کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی نے اسے مشتعل نہ کیا۔ بلکہ اس کی ضد کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ آج بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ حیاء کے کوٹھے پر آیا تھا۔

اس کے ساتھ غنڈوں کی فوج ظفر موج ہوتی تھی۔ جو دو جیپوں میں سوار ہو کر اسلحہ لہراتے جہاں سے بھی گزر جاتے وہاں سنسانی پھیل جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی طوفان آیا ہو اور جاتے ہوئے ہر چیز کو اجاڑ گیا ہو۔ گورا چٹا رنگ، چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد۔ ہلکی ہلکی داڑھی مونچھ نے اس کی شخصیت کو دلکش بنا رکھا تھا مگر جبرو میں یہی ایک خامی تھی کہ وہ بدمعاش تھا اور یہ خامی اس کی شخصیت کو گھن کی طرح کھا گئی تھی۔ وہ اپنی شاندار اور قیمتی گاڑی سے اترا تو زمین بھی دہل گئی۔ بازار کی رونق جو چند لمحے پہلے عروج پر تھی یک دم ماند پڑ گئی تھی۔ اس نے بالکنیوں میں کھڑی طوائفوں کو دیکھا اور نظریں گھومتی ہوئی حیاء کے کوٹھے پر ٹھہر گئیں۔ اس نے حیرت کا اظہار کرنا چاہا تو ایک چمچہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''مائی باپ! حیاء نے ناچنا چھوڑ دیا ہے......'' اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے بولنے سے محروم ہو گیا تھا۔ ایک زوردار تھپڑ نے اس کی زبان اسی کے دانتوں تلے دبا کر کاٹ دی تھی۔ وہ لہولہان منہ سے چیختا ہوا ایک جانب بھاگ نکلا۔

وہ حیاء کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر تک گیا اور دروازہ ٹھوکر سے کھولنے کی کوشش کی۔

''حیاء! دروازہ کھولو۔'' اس کی آواز میں جو گونج اور دبدبہ تھا اس نے بھی دوسروں پر رعب ڈالا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے بجایا۔ ''حیاء میں دروازہ توڑ دوں گا۔'' چند لمحے یونہی گزر گئے تو حیرت انگیز طور پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ خود حیاء نے ہی کھولا تھا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ جبرو اندر داخل ہوا تو اس کے لیے حیاء کا روپ بالکل انوکھا اور نیا

تھا۔ کیونکہ حیاء نے سیاہ رنگ کے سکارف سے اپنے سر کو ڈھانپ رکھا تھا اور اپنے جسم کے گرد میرون رنگ کی پھولدار چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ اس حلیے میں کسی حور سے کم نہ لگتی تھی۔ کوٹھے کے وسیع وعریض احاطہ میں ایک مرکری بلب روشن تھا جس کی روشنی جگہ کی وسعت کی وجہ سے اندھیرے کو نگلنے میں شکست خوردہ لگ رہی تھی۔

جبرو کی نظریں کوٹھے کا طواف کرتی ہوئی حیاء پر آ کر ٹھہر گئیں۔ وہ ایک گہری سانس بھرتا ہوا کہنے لگا۔

''وقت کی قدر نہ کرنے والا ذلت کا شکار ہو جاتا ہے۔'' حیاء نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا کہنے لگا۔ ''یہ وقت تمہارے حُسن کے عروج کا ہے۔ اس عروج کا مزہ لو حیاء بیگم!''

حیاء کو اس کا انداز برا لگتا تھا مگر اب تو اور بھی برا لگا۔ ''میں نے دھندہ چھوڑ دیا ہے۔'' حیاء دھیمے لہجے میں بولی تو جبرو حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔ ''آپ مہربانی کر کے جا سکتے ہیں۔'' اس نے سیخ پا ہونے کی بجائے حیاء کا ہاتھ پکڑ لیا اور سہلانے لگا۔

''مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہیں کوئی ایسا عاشق مل گیا ہے جو صرف تمہارا دیدار ہی کرتا ہے۔'' حیاء نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ بھرپور مرد تھا اور وہ نازک اندام تھی بس زور لگا کر ہٹ گئی۔ ''اس عاشق کی لاش ابھی تک نہیں گری کہ اس نے تمہیں کبھی چھوا نہیں ہے...... اگر چھو لیتا تو......'' حیاء نے زہریلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ ہنستا ہوا بولا۔ ''تم جانتی ہو کہ بندہ مارنا میرے لیے کوئی کام نہیں ہے۔''

''وہ میرا عاشق تھا۔ اس نے مجھے کبھی بھی چھوا نہیں۔'' حیاء ہمت کر کے بولی تو جبرو نے اس کا ہاتھ دھیرے سے چھوڑ دیا۔ ''تم تماش بین ہو...... اور تم مجھے چھونے کی حسرت اور میرا جسم پانے کی خواہش دل میں لے کر اس کوٹھے پر آتے ہو۔''

''جس جگہ تم کھڑی ہو۔ وہاں ایسے برائے نام عاشق روز ہی پیدا ہوتے ہیں۔'' اس کا لہجہ تلخ ہونے لگا تھا۔ ''اور مجھ جیسا تماش بین کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کبھی سوچا ہے ایسا کیوں ہے؟'' حیاء جھکی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کیونکہ ہر ماں عاشق بیٹے کو جنم دینا پسند کرتی ہے۔ تماش بین بیٹے کو نہیں۔''

''حیاء!'' وہ حلق کے بل دھاڑا تھا۔ ''جبرو نے کبھی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور تم مجھے



مجبور مت کرنا۔'' حیاء اس کے لب و لہجے اور تلخ انداز اور گرم مزاج کی آشنا تھی۔

''اس کوٹھے کا دروازہ صرف اسی لیے کھلا ہے کہ تمہیں بتا سکوں کہ اب آئندہ یہاں آنے کی کوشش اور جرأت نہ کرنا۔ کیونکہ اب یہ کوٹھا نہیں...... بلکہ......''

''بلکہ کوئی مدرسہ بنے گا۔'' جبرو نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اپنا خیال پیش کر دیا۔ ''جس میں بچے اور بچیاں سیپارے پڑھا کریں گے۔'' اس کا انداز طنزیہ تھا۔ حیاء اس کے مزاج کی بھیدی تھی اور گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ بھی تلخ اور طنزیہ لہجے میں بولی۔

''میں نے سنا تھا کہ مردہ جب بھی بولتا ہے۔ کفن پھاڑ کر ہی بولتا ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکان دیکھ کر وہ تلملا کر رہ گیا۔ ''مگر تم نے اس بار بول کر میری پریشانی حل کر دی ہے۔ سنو جبرو!'' وہ پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اب اس جگہ پر مدرسہ ہی بنے گا اور بچیاں قرآن کریم ہی پڑھیں گی۔'' وہ حیاء کے سر سے سکارف اتارتا ہوا بولا۔ ''اپنی اوقات مت بھول...... تم نے ابھی میرا پیار ہی دیکھا ہے۔ اگر غصہ دیکھ لو تو ابھی پاؤں میں گر جاؤ گی۔''

''اپنی اوقات دکھا کر تم میرے ارادوں کو اور مضبوط کر رہے ہو۔'' وہ اک ادا سے بولی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ تم سے وہی لہجہ اختیار کروں جو طوائفیں بدمعاشوں سے کرتی ہیں۔''

''میں تمہارا عاشق ہوں حیاء اور تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔ اسی لیے ابھی جا رہا ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑا اور پھر رک گیا۔ الٹے پاؤں گھومتا ہوا بولا۔ ''آٹھ دن بعد جب دوبارہ آؤں تو اس کوٹھے پر وہی رونق اور تمہارا وہی روپ دیکھوں...... اگر ہو سکے تو اپنے عاشق نامراد کو بھی بلوا لینا۔'' وہ اپنے غنڈوں کے ساتھ سیڑھیاں اتر گیا۔

''ایسا اب کبھی نہیں ہو گا...... حیاء کی زندگی میں تو کم از کم کبھی نہیں ہو گا۔'' وہ جبرو کے جانے کے بعد منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ رات ختم ہو گئی تھی طلوع سحر کی اطلاع مؤذن کی میٹھی آواز نے دی تو اس نے احترام میں آنکھیں بند کر کے محبت اور پُرسکون انداز میں اذان سنی۔ آس پاس سے ڈھولک۔ طبلوں اور گھنگھروؤں کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ حیاء نے اچھے طریقے سے وضو کیا اور جاء نماز بچھا کر نماز سنت ادا کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا اور گڈی بائی اپنے چند یاروں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ حیاء جائے نماز پر کھڑی اس کی آمد کا مقصد جاننا چاہتی تھی اور پھر خشوع کے ساتھ نماز

ادا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آتے ہی سگریٹ کا دھواں حیاء کے منہ پر پھینکا تو حیاء نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

''یہ سب ڈھکوسلہ یہاں نہیں چلے گا میڈم!'' گڈی بائی نے سکارف اس کے سر سے کھینچ لیا۔ حیاء کے اندر کی طوائف بھی جاگ گئی وہ بھی بدتمیزی کا جواب بالکل ویسے ہی لہجہ میں دینے لگی تھی کہ اسے یاد آ گیا۔ وہ عشق کی رکھوالن تھی۔ عشق نے اسے اگر درجہ دیا تھا تو صبر وتحمل اور پُرسکون رہنے کی ادا بھی سکھا دی تھی۔ ''گڈی بائی! میری اور تمہاری کوئی لڑائی نہیں ہے۔'' وہ پُرسکون انداز میں بولی۔ ''مجھے تنگ نہ کرو پلیز!''

''اس بازار میں تم ہی تو وہ واحد طوائف ہو جس کی میرے ساتھ دشمنی ہے اور تم بہتر جانتی ہو کہ میری اور تمہاری دشمنی کی وجہ کیا ہے؟'' وہ دو قدم اور آگے بڑھی تو اس کا پاؤں جا نماز پر آ گیا۔ اس کی اس حرکت پر حیاء نے پہلے بھی ایک زوردار تھپڑ سے خاطر کی تھی۔ مگر اب وہ سنبھل گئی اور خود ہی پاؤں پیچھے کر لیا۔

''تو پھر وہ وجہ بیان کرو اور دشمنی ختم کرو۔'' حیاء کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

''نہیں میری جان! اتنی جلدی نہیں۔'' وہ مغرور لہجے میں بول رہی تھی۔ ''تم میرا کہا مانو...... تو میں تمہارا کام کر دوں گی۔'' اس نے سگریٹ پھینک دیا تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' حیاء بھی سودے بازی پر اتر آئی تھی۔

''تم جبرو کو خوش کر دو اور میں......'' مگر اس بار پڑنے والے تھپڑ نے گڈی کے منہ سے خون نکال دیا تھا۔ وہ دہشت زدہ نظروں سے حیاء کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہاں سے دفع ہو جاؤ...... میں اب تک بغیر باپ کے ہی زندہ ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ آئندہ بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔'' حیاء کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر گڈی بائی کو بالوں سے پکڑا تو اس کے غنڈے حیاء پر ٹوٹنے کو تیار تھے مگر ایک دہشت ناک آواز نے ان کے پاؤں جکڑ لیے۔

''اگر کسی نے بھی قدم اٹھانے کی جرأت کی تو لاڈو اس کا ٹنڈھ پھاڑ دے گا۔'' یہ دہشت ناک آواز حیاء کے عاشق لاڈو کی تھی جو حیاء کو متاثر کرنے کے لیے اردو اور پنجابی بولتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف دیکھ کر گڈی اور اس کے نہتے غنڈے لرز گئے۔ وہ اپنی جگہ پر جم کر رہ گئے تھے۔

''ایک ایک کر کے کتے کی طرح پوچھل ہلاتے ہوئے نکل جاؤ۔ ورنہ تمہارے جسموں



روشندان بنا دوں گا۔'' لاڈو کے سر پر خون سوار دکھائی دیتا تھا۔ حیاء بھی اس کا آسرا پا کر شیر ہو گئی اور گڈی کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولی۔ ''میں اب عشق کی پہریدار ہوں۔ اگر کسی نے بھی اس میں نقب لگانے کی جرأت کی تو انگلیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی...... چاہے...... تم ہی کیوں نہ ہو...... ماں جی!'' اس نے گڈی کو سیڑھیوں کی جانب دھکیلا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کے پالتو کتے ایک ایک کر کے نکل گئے تھے۔

''میں تمہاری احسان مند ہوں لاڈو۔'' حیاء نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ اس پر قربان ہوتا ہوا بولا۔

''میں تو اپنے دشمن جبرو سے ملنے آیا تھا۔ پر...... مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ بے غیرت عورت آپ کو ڈسٹرب کرتی ہے۔''

''میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ تم جبرو سے بچ کر رہنا۔ وہ خطرناک بدمعاش ہے۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔''

حیاء نے اسے سمجھایا تو وہ ہنستا ہوا بولا۔ ''میرا وی اللہ میرے نال ہی ہے...... کدی زندگی میں لوڑ پڑی تو دیکھنا آپ پر لاڈو پہلے قربان ہوگا...... ان سے ڈرنے کی کوئی لوڑ نہیں ہے۔'' وہ یہ کہہ کر سیڑھیاں اتر گیا حیاء نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے دروازہ بند کیا اور واپس آ کر رب کے حضور سجدہ میں گر گئی۔

☆=======☆=======☆

وہ حاکم علی شاہ کے پاؤں دبا رہا تھا۔ عجیب ہی وقت کی ڈور تھی کل کا مالک آج ملازم کے پاؤں دبا رہا تھا اور ملازم مالک بنا بیٹھا تھا۔ مگر یہ زندگی کی تقسیم نہ تھی بلکہ قدرت کی تقسیم تھی۔ درجات کی تقسیم تھی۔ وہ عشق کا عین تھا اور عشق کی خدمت کر رہا تھا۔ اس نے خواب میں جو سبق صبور احمد سے سیکھا تھا۔ اسے اچھی طرح پکا لیا تھا۔ حاکم علی شاہ نے اسے منع کیا تھا مگر وہ بضد تھا کہ وہ ان کے پاؤں دبائے گا۔

دوسرے کمرے سے صبور احمد آئے تو احمد سبحانی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

''ہاں! بھئی ہونہار شاگرد کی طرح سبق یاد کیا ہے یا مار کھا کھا کر یاد کرو گے۔''

''میں نے یاد کر لیا ہے شاہ جی! مگر میں پریشان ہوں کہ مجھے کل صبح یعنی دوست کی پارٹی سے آتے ہوئے راستے میں جو بزرگ ملے تھے۔ میں ان کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔'' احمد سبحانی نے اپنی بپتا سنائی تو حاکم علی شاہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"وہ شاہ سوار حسین ہوں گے۔"

"شاہ سوار حسین!" احمد سبحانی کا انداز سوالیہ تھا۔

"ہاں! ہمارے مرشد! سیّد شاہ سوار حسین۔ ہمارے باپ کے بھی وہی مرشد تھے اور پھر ہمارے دادا کے مرشد ان کے والد گرامی تھے۔" حاکم علی شاہ نے احمد سبحانی کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا تو وہ پھر بولا۔

"مگر ان کو کیسے پتہ کہ میں آپ کا مرید ہوں؟" احمد سبحانی کا سوال وزنی تھا۔

"پنجابی میں کہاوت ہے کہ "پیر اوہی ہوندا اے جیہڑا پیڑ ھ جانے" یعنی کہ مرشد وہی سچا ہے جو مرید کا دکھ درد بنا کہے ہی سمجھ لے۔ اب دیکھو کہ میں تمہیں فیضان پور صبور احمد کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔" ابھی ان کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ احمد سبحانی گستاخی کا مرتکب ہو گیا۔ "وہاں کیا ہے جی! ایک بے آباد گاؤں ہو گا۔" حاکم علی شاہ نے صبور احمد کی طرف دیکھا تو ان کا اشارہ تھا کہ ابھی طفل مکتب ہے۔ عشق کے سکول میں پہلا دن ہے اور یہ نالائق شاگرد یہ بھی نہیں جانتا کہ عشق سکھانے والے اور پڑھانے والے استادوں سے کیسے اور کب بات کی جاتی ہے۔

"وہاں ہمارا ایک مرید کافی دنوں سے پریشان ہے۔ اس کی پریشانی اللہ کی رحمت اور اللہ کے فضل و کرم سے تم دونوں دور کرو گے۔" حاکم علی شاہ نے احمد سبحانی سے کہا تو اس بار اس کا لہجہ باادب اور ہوش مندانہ تھا۔ "میں سرکار کے حکم پر کہیں بھی جا سکتا ہوں اور پھر اپنے استاد صبور احمد شاہ جی کے ساتھ تو دنیا بھر میں گھوم سکتا ہوں...... آپ مجھ پر نظرِ کرم رکھنا شاہ جی!" صبور احمد اور حاکم علی شاہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ "میں نے بہت پاپ کیے ہیں۔ گناہگار ہوں۔ شیطان ملعون اب بھی مجھے بہکاتا ہے۔ آپ اپنی نگاہ خاص کیجیے گا۔ میں اکیلا بے بس اور لاچار ہوں۔ آپ تو اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کی آل اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعائیں خصوصی طور پر سنتا اور قبول کرتا ہے۔" وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔ حاکم علی شاہ اس کی پیٹھ تھپتھپا رہے تھے۔

"میں نے عشق کا لبادہ تو اوڑھ لیا ہے۔ میں اب اسی لباس میں مرنا چاہتا ہوں...... بس شاہ جی! ایک بار مجھے یہ بتا دیں کہ میری پیدائش پر آپ نے میرے پاپا سے یہ کہا تھا کہ میں آپ کا ہوں۔ جب بھی میری ضرورت پڑی آپ مجھے لے لیں گے۔ مگر شاہ جی! میں نکما، نکھٹو، آوارہ اور گناہوں سے لتھڑا ہوا آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟" اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔



وہ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔

"وقت کی چادر اس پر مہربان ماں کی طرح سایہ کرتی ہے جو وقت کی قدر کرے۔"

حاکم علی شاہ بولے تو صبور احمد اثبات میں سر ہلانے لگا۔ "احمد سبحانی! تمہارا نام بھی ہم نے تجویز کیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے تمہارے باپ نے تمہیں مانگا تھا۔ اگر رب کریم اپنے محبوب ﷺ سے افضل کائنات میں کسی کو نہیں جانتا اور وہ اپنے محبوب ﷺ کی شان کے خلاف کوئی عذر داری، بہانہ یا پھر بے حرمتی برداشت نہیں کرتا...... اس نے تمہیں خاص کام کے لیے چنا ہے۔ یہ مجھے علم نہیں۔ صبور احمد بہتر جانتے ہیں۔" انہوں نے احمد سبحانی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا تو خوشبوؤں کے لپٹے احمد سبحانی کے چودہ طبق مہکا گئے۔ وہ سرور و مستی کی کیفیت میں مخمور ہو گیا تھا۔

صبور احمد نے اپنی جیب سے ایک سیاہ رنگ کا دھاگہ نکال کر اس کی دائیں کلائی پر باندھا۔ یہ ویسا ہی دھاگہ تھا جیسا شین کی ٹانگ پر باندھا تھا۔ "اب تم لوگ جا سکتے ہو...... اور ہاں صبور احمد! اللہ کے کاموں میں دخل اندازی مت کرنا۔" انہوں نے صبور احمد کو خاص طور پر سمجھایا۔ یہ بات صبور احمد کی تو سمجھ میں آ گئی تھی مگر احمد سبحانی کے سر سے گزر گئی تھی۔

احمد سبحانی کا یہ پہلا سفر تھا جو وہ اپنے استاد اور سادات گھرانے کے چشم و چراغ صبور احمد کے ساتھ کر رہا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے قدم زندگی میں پہلی بار راہِ خدا میں اٹھے تھے۔ وہ صبور احمد کے ساتھ کسی گاؤں میں جا رہا تھا۔ اس گاؤں کو کوئی پکی سڑک نہ جاتی تھی صرف ٹرین کا ذریعہ ہی اس گاؤں کو باقی شہروں سے ملاتا تھا۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے منزل کی جانب بھاگی جا رہی تھی اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پٹڑی بھی جدھر گھومتی انجن بھی اپنا منہ ایک فرمانبردار کی طرح ادھر ہی کر لیتا تھا۔ ڈرائیور بڑی مہارت سے اپنا کام کرنے میں مگن تھا۔ درخت ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی دور سے کھیتوں میں کام کرنے والے کسان نظر آ جاتے اور کبھی ٹیوب ویل چلنے کی خوب صورت آواز دل کو بھلی لگنے لگتی۔

صبور احمد ٹرین کے سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ باہر کے نظاروں میں کھوئے ہوئے تھے اور احمد سبحانی ان کا مطیع بن کر باادب ہوا بیٹھا تھا۔ ان کے سامنے والی سیٹوں پر ایک بزرگ اور ایک جوان لڑکی سوار تھے۔ احمد سبحانی نے محسوس کیا کہ لڑکی کی نظروں میں اس کے لیے پسندیدگی کے تاثرات ابھر رہے تھے۔ مگر احمد سبحانی اس کے جذبات اور تاثرات سے بے

نیاز ہو کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ شیطان سے بہت ڈرنے لگتا تھا۔ اسے یہ بھی کوئی اس مردود کی چال ہی لگتی تھی۔

اسے عین کی جو سند ملی تھی اس پر پورا اترنے کے لیے اس نے دنیا کو مکمل طور پر تیاگنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ فیضان پور سے واپسی پر فاطمہ سے قرآن کریم پڑھنا سیکھے گا۔ وہ ایک ایک لفظ کا معنی اور مقصد سمجھے گا۔ اتنی زندگی اس نے قرآن اور اسلام سے دوری میں ہی گزار دی تھی۔ اسے خود پر افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بھی ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی طرح برائے نام ہی مسلمان تھا۔

ایک وہ وقت تھا جب وہ پہلی بار صبور احمد کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ وہ خوامخواہ ہی اس درویش سے ڈر گیا تھا۔ اب اسے صبور احمد سے انس اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ گاؤں کس کام سے جا رہے ہیں۔ دراصل اس نے حاکم علی شاہ سے پوچھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ گاؤں کا نام فیضان پور تھا۔ اس نے بھی دوسرے مسافروں کی طرح محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ مسافروں میں بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ کیونکہ جو اترنے والے تھے وہ اپنا اپنا سامان باندھ رہے تھے اور جنہوں نے ابھی اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ ان کو اپنے سامان کی فکر تھی کہ مبادا کوئی ان ہی کا سامان لے کر نہ اتر جائے۔

سامنے والی نوجوان لڑکی بھی اپنا اٹیچی کیس سنبھال کر بیٹھ گئی مگر اس کی تیوری کے بل بتا رہے تھے کہ وہ احمد سبحانی سے اچھا رسپانس نہ ملنے پر سخت ناراض ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ ایک سٹیشن پر رک گئی۔ جس کا نام کسی ہندو رہنما کے نام پر تھا۔ احمد سبحانی ہنسنے لگا اسے وہ لکیر یاد آنے لگی جو پاکستان اور ہندوستان کے بڑوں نے درمیان میں ڈال دی تھی۔ پاک ہی نام رکھنا تھا تو پھر سٹیشن، گلیاں، چوراہے، شاہراہیں اور باغات انگریزوں کافروں، ہندوؤں اور سکھوں کے ناموں پر کیوں موجود ہیں۔ اسے ہنسی اس بات پر آ رہی تھی کہ جتنی قربانیوں اور جدوجہد کے بعد اس عظیم ملک کو حاصل کیا گیا ہے نئی نسل اس سے ناواقف تھی اور بے قدر بھی تھی انڈیا کا ایک مخصوص ٹی وی چینل پاکستان کی نئی نسل کو اس کی ثقافت اور ادب و آداب سے دور کر رہا تھا۔ نوجوان بچوں اور بچیوں کو ہندوستان کی ثقافت اژدھے کی طرح اس چینل کے ذریعے نگل رہی تھی۔ بس نام ہی بدلا تھا۔ ملک وہی تھا۔

کچھ مسافر اترے اور کچھ اگلی منزل پر جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ صبور احمد



کے کہنے پر احمد سبحانی نے ایک کپ چائے اور بسکٹ لے لیے تھے۔ صبور احمد نے بتایا کہ اگلا سٹیشن فیضان پور ہے۔

سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا مگر جنوری کا مہینہ ہونے کی وجہ سے اس کی دھوپ میں وہ تمازت نہ تھی جو جون جولائی میں ہوتی ہے۔ گاڑی نے وسل دیا تو باہر کنٹینوں پر کھڑے مسافر اپنے اپنے ڈبوں کی طرف بھاگنے لگے۔ دوسرا اور تیسرا وسل بجانے کے بعد گاڑی نے آہستہ آہستہ رینگ کر پہلے پلیٹ فارم اور پھر سٹیشن اور پھر وہ شہر چھوڑ دیا۔ ان کے سامنے والی نشست پر بیٹھنے والے مسافروں میں ایک ماڈرن جوڑا اور ان کی ساتھی نوجوان خوبصورت لڑکی تھی۔ آدمی کی عمر کوئی چالیس سال، عورت کی پینتیس اور لڑکی تو سٹوڈنٹ معلوم ہوتی تھی۔ اگر وہ فرسٹ ایئر یا سیکنڈ ایئر میں ہو گی تو اس کی عمر اٹھارہ سال تک ہو گی۔ یہ احمد سبحانی کا خیال تھا۔ لڑکی کے ماتھے پر سفید رنگ کی پٹی باندھی گئی تھی جیسے کہ کوئی سر درد والا مریض اپنے ماتھے پر رومال باندھتا ہے۔

احمد سبحانی نے محسوس کیا کہ صبور احمد نے اس لڑکی کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا ہے اور پھر پریشانی کے عالم میں باہر دیکھنے لگے تھے۔ مگر لڑکی کی ٹکٹکی احمد سبحانی پر بندھ گئی تھی۔ وہ لڑکی کی اس حرکت سے خفت محسوس کرتا ہوا کبھی ٹرین کی چھت اور کبھی باہر دیکھنے لگتا۔ اس نے محسوس کیا کہ صبور احمد نے ایک جھرجھری لی اور یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ صبور احمد سے کسی بھی بات اور واقعہ کی توقع کرتا ہوا ہر قسم کے حالات کو سنبھالنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔

''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟'' صبور احمد کی بات سن کر مرد نے چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا جیسے کہ وہ اب تک ان کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ ماڈرن عورت کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ساتھ نخوت اور تکبر کی لکیریں بھی نمایاں تھیں۔ ''فیضان پور'' مرد کے منہ سے یہ سن کر احمد سبحانی چونک پڑا۔ ان کی منزل بھی فیضان پور ہی تھا۔ ''کسی کے گھر مہمان بن کر جا رہے ہو۔'' یہ دوسرا سوال احمد سبحانی کے لیے حیران کن تھا۔ بھلا صبور احمد کو کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑائے۔ مگر وہ خاموش ہی رہا۔ کیونکہ بطور طالب علم یہ اس کا اپنے استاد کے ساتھ پہلا سفر تھا۔ پھر بھی اس مرد نے تحمل سے جواب دیا۔

''جی نہیں؟ ہمارا وہاں گھر ہے۔'' صبور احمد شاید وقت اور سفر کاٹنے کے موڈ میں بات کو بڑھا رہے تھے۔

"اس بچی کے سر پر کوئی چوٹ لگی ہے؟" اس بار صبور احمد کا اشارہ بچی کی طرف تھا جو کہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ صبور احمد کو شرارت سوجھی انہوں نے دونوں ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے۔ "میاؤں...... میاؤں" کی آواز نکالی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ حالانکہ صبور احمد نے اسے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔

"یہ ڈرتی نہیں...... بلکہ ہم سب کو ڈراتی ہے۔" اس کا باپ بولا۔ "اس کا نام ثمیلہ ہے۔" اس کی آواز میں چھپی ہوئی بے بسی اور اداسی نے احمد سبحانی کو بہت متاثر کیا۔ وہ اس مجسمہ حسن کو دیکھنے لگا۔ اس کی خوبصورتی کے بارے میں احمد سبحانی کے جذبات اس طرح تھے کہ اگر وہ اسے چھونے کی کوشش کرتا تو اس کے گورے اور سفید رنگ پر احمد سبحانی کی انگلیوں کے نشانات واضح ہو جاتے۔ آنکھیں کسی جھیل کی گہرائی کو مات دینے کے لیے کافی تھیں۔ ہونٹ گلاب سے بھی گلابی اور خوبصورت تھے۔ اس کے باپ کی بات سن کر احمد سبحانی کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ مگر یوں لگتا تھا کہ اس کے والدین نے صبور احمد کی میاؤں میاؤں والی حرکت کا برا منایا ہو۔

"آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں اور کچھ ہمارے بارے میں پوچھیں۔ اس طرح سفر بھی کٹ جائے گا اور بوریت بھی نہیں ہو گی۔" صبور احمد کی بات خوبصورت تھی مگر اس بات سے صرف احمد سبحانی ہی اتفاق کر سکتا تھا۔

"میں اپنے بارے میں بتانے کا آپ کو پابند نہیں ہوں۔" وہ آدمی غالباً ناراض ہو گیا تھا۔ اخلاقیات کا تقاضہ تو یہی تھا کہ صبور احمد خاموش ہو جاتے مگر وہ گھڑی ابھی دور تھی۔

"چلیں میں آپ کو اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔" صبور احمد نے کہنا شروع کیا تو عورت نے پہلی بار زبان کھولی۔

"ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم غیر اور اجنبی لوگوں سے شناسائی پیدا کریں۔" اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی تیوریاں اور بگڑ گئی تھیں۔ "پلیز سفر خاموشی سے ہی کریں تو بہتر ہے۔"

"آپ کی مرضی ہے۔" صبور احمد آہ بھرتے ہوئے بولے۔ "پچھتاؤ گے۔" ان کی بات سن کر مرد کو غصہ آنے لگا۔

"یہ شیدائی سا کون ہے۔ کیا یہ آپ کے ساتھ ہے؟" اس نے احمد سبحانی سے پوچھا تو اس کا چہرہ غصے کی تمازت سے سرخ ہو گیا۔ مگر وہ اس موقع پر یہ نہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ آلِ رسول کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ وہ انتہائی تحمل سے بولا۔ "یہ آپ کی سوچ اور سمجھ سے بالاتر



ہیں۔" احمد سبحانی کا منہ اس اشارے نے بند کر دیا جو صبور احمد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا تھا۔

اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو اب گہری نیند سو گئی تھی اور معصومیت اس کے چہرے پر قربان ہو رہی تھی۔

مسافروں نے اپنا اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔ فیضان پور چند منٹ بعد آنے ہی والا تھا۔ احمد سبحانی نے بھی اپنا تھیلا سنبھال لیا۔ جس میں دو کمبل تھے جو صبور احمد نے اس کو دیا تھا جو بارش میں بھی گیلا نہ ہوتا تھا اور دو دو جوڑے کپڑوں کے تھے۔

سورج اپنا سفر کرتا ہوا اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی بجا آوری میں مصروف تھا کہ تمہیں سجدہ کرنا ہو گا اور وہ اپنے مقام کی طرف رواں دواں تھا۔ گاڑی فیضان پور رک گئی تو وہ تمام مسافر اترنے لگے جن کی منزل فیضان پور تھا۔ ثمیلہ اور اس کے والدین بھی وہیں اتر گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو ملازم طرز کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر ثمیلہ اور اس کے والدین کا سامان اٹھا لیا تھا۔ ان کا انداز مؤدبانہ تھا۔ اس مرد اور عورت نے گردن اکڑا کر صبور احمد کی طرف دیکھا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ تم ہمارے بارے میں پوچھتے تھے؟

مگر صبور احمد ان تمام باتوں سے بے نیاز ننگے پاؤں ہی آگے بڑھ گئے تو احمد سبحانی کو بھی ان کی تقلید کرنا پڑی۔ وہ دونوں سٹیشن سے باہر نکلے تو تانگے والے فیضان پور گاؤں کی آوازیں لگا رہے تھے۔ مگر اس کی حیرانی نہ رہی جب ایک کوچوان بھاگنے والے انداز میں آگے بڑھا۔ وہ اتنی تیزی سے ان کی طرف آیا تھا کہ احمد سبحانی کو گمان ہوا وہ ان دونوں سے ٹکرا جائے گا۔ وہ سنبھل کر رک گیا اور کوچوان کو دیکھنے لگا اس نے آ کر صبور احمد کے پاؤں پکڑ لیے اور بولا۔

"شاہ جی! آپ؟ اور یہاں؟...... میری خوش بختی ہے شاہ جی! میرا تو حج ہو گیا۔ میرا حج ہو گیا شاہ جی!" صبور احمد نے اسے قدموں سے اٹھایا اور سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔

"یہ سر اللہ کی بارگاہ میں ہی جھکے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔" وہ کوچوان عاجزی سے بولا۔

"یہ سر اللہ کی بارگاہ میں جھکتا ہے اور اسی کو ہی سجدہ کرتا ہے۔ مگر شاہ جی! اس سر کو آلِ رسول کی تعظیم اور عقیدت کا درس اللہ کی طرف سے ملا ہے۔" صبور احمد اس کی عقیدت سے بھری بات سن کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"کچھ لوگ غلط غلط کہانیاں بنا لیتے ہیں۔ طرح طرح کے مطلب نکال لاتے ہیں۔"

وہ آگے بڑھ کر احمد سبحانی سے تھیلا پکڑ کر اس سے مصافحہ کرنا نہ بھولا تھا۔ ''وہ سامنے میرا تانگہ کھڑا ہے جی!''

اس کوچوان کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا کہ اسے من چاہی خوشی مل گئی ہو۔ ''بلبل تو آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔'' وہ تانگے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''بلبل!'' احمد سبحانی حیرانگی سے بولا تو کوچوان ہنسنے لگا۔

''میری گھوڑی ہے جی! میں بڑا پیار کرتا ہوں اس سے۔'' احمد سبحانی نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ احمد سبحانی نے دیکھا کہ دور دور تک کماد اور گندم کی فصلیں تھیں۔ وہ پہلی بار کسی گاؤں میں آیا تھا۔ اسے واقعی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ واقعی بلبل نے سر جھکا کر صبور احمد کو سلام کیا تھا۔ صبور احمد نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کے کان میں کچھ کہا تو بلبل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کوچوان نے صبور احمد کو اگلی سیٹ پر بٹھایا اور احمد سبحانی کو پیچھے بیٹھنے کو کہا۔ کیونکہ اس کی منطق تھی کہ اس طرح تانگہ ''دابو'' نہیں ہوتا۔ یعنی مِس بیلنس نہیں ہوتا اور گھوڑی کو زیادہ زور نہیں لگانا پڑتا۔ وہ خود پائیدان پر کھڑا ہو کر بلبل کی لگامیں کھینچتا ہوا منہ سے ''تت......تت'' کی آواز نکالنے لگا تو بلبل نے کچی سڑک پر آگے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

بلبل کی چال واقعی اس وقت ہرنی کی چال کو مات دے رہی تھی۔ کیونکہ اس پر ایک سیّد زادہ سوار تھا۔ احمد سبحانی کے لیے تانگے کی سواری پہلا اور خوبصورت تجربہ تھا۔ وہ ہر قسم کی موسمی گرمی اور سردی سے محفوظ رہنے کے لیے قیمتی سے قیمتی گاڑیوں میں سفر کرتا تھا بلکہ نئی نئی گاڑیوں کا شیدا تھا۔ مگر بلبل کی چال کے آگے آج وہ سب کچھ ہیچ لگ رہا تھا۔

''بڑی دیر بعد ہی اس پنڈ کے بھاگ جاگے ہیں شاہ جی!'' کوچوان کا اشارہ صبور احمد کی آمد سے متعلق تھا۔ وہ بلبل کو لگامیں ڈھیلی چھوڑ کر جانے دے رہا تھا جیسا کہ بلبل جانتی ہو اب کس طرف کو جانا ہے۔

''گاؤں میں سب خیریت ہے نا بابو!'' صبور احمد نے کوچوان سے پہلا سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پر......شاہ جی!'' وہ خاموش ہو گیا تو احمد سبحانی کا تجسس بڑھنے لگا۔ صبور احمد کی آواز ابھری۔ ''پھر کیا بابو؟ بات پوری کیا کرو۔''

''کسی نے کنگن کو مار دیا ہے جی؟'' بلبل زور سے ہنہنائی تو صبور احمد بھی یک دم سناٹے میں آ گئے۔ اس وقت تانگہ ایک سیم نہر کے ساتھ ساتھ کچی سڑک پر دھول اُڑاتا ہوا جا رہا تھا۔



سیم نہر خشک تھی اور اس کے کناروں پر خودرَو جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ چند لمحے اسی طرح خاموشی کی نذر ہوئے تو احمد سبحانی خاموش نہ رہ سکا۔ ''یہ کنگن کون تھا؟ اور اسے کن لوگوں نے مار دیا۔'' مگر اس کی بات سن کر صبور احمد اور بابو کچھ نہ بولے تو اس نے بھی احتراماً اپنا سوال دوبارہ نہ دہرایا۔ اس پر صبور احمد کا یہ نیا روپ منکشف ہوا تھا۔ وہ تو اسے ننگے پاؤں گھومنے والا کوئی ایویں ای مست سمجھا تھا۔ کوئی جھلا اور دیوانہ ہونے کی اداکاری کر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے والا فقیر سمجھ کر وہ پہلے دن اس سے ڈر گیا تھا۔ مگر صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔

''تو پھر گاؤں میں امن اور خیریت کیسے ہے؟'' کئی جان لیوا لمحات گزرنے کے بعد صبور احمد کی بھرائی ہوئی آواز آئی تو یوں محسوس ہوا وہ کسی گہرے کنویں سے بول رہے تھے۔ احمد سبحانی سمجھ گیا کہ کنگن نامی ہستی سے صبور احمد کو بہت لگاؤ ہو گا جبھی تو وہ اداس ہو گئے ہیں۔

''امن کہاں ہے جی!'' بابو کی دہشت زدہ آواز نے ماحول کو اور غم زدہ کر دیا تھا۔ ''کنگنی ہر روز رات کو اپنے کنگن کے قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے روزانہ گاؤں کے کسی نہ کسی گھر میں چکر لگاتی ہے جی!''

بابو نے بلبل کی پونچھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لوگ تو ڈر کے مارے سوتے بھی نہیں ہیں جی! ہر رات پورے گاؤں میں شور شرابہ ہوتا ہے۔ لوگ سانپ سانپ کی آوازیں لگاتے ہوئے گھروں سے باہر بھاگ آتے ہیں۔'' احمد سبحانی نے بابو کی بات پوری ہونے پر خود ہی حیرانگی کا اظہار کیا کہ بات تو کنگن اور کنگنی کی ہو رہی ہے۔ درمیان یہ سانپ کا تذکرہ کہاں سے آ گیا؟ مگر وہ اپنی حیرانی کو دبا گیا اور خاموش ہی رہا۔ عشق اس پر آہستہ آہستہ آشکار ہو رہا تھا۔ یک دم بلبل رک گئی تو صبور احمد تانگے سے اترے اور احمد سبحانی کو بھی ان کی تقلید کرنا پڑی۔ بابو تو پہلے ہی اتر چکا تھا وہ پائیدان پر جو تھا۔ اس کی نظریں صبور احمد کے مرتبے کی وجہ سے احتراماً جھکی ہوئی تھیں۔ احمد سبحانی کو اس کی عقیدت کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔

صبور احمد ننگے پاؤں خشک سیم نہر میں اتر گئے۔ انہیں اپنے پاؤں گرد آلود ہونے کی کوئی فکر نہ تھی۔ احمد سبحانی بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ مگر بابو کنارے پر ہی کھڑا تھا اور اس کے خشک ہونٹوں پر پھرنے والی زبان بھی خشک ہو گئی تھی۔ صبور احمد کا اشارہ پا کر احمد سبحانی ان کے دائیں طرف ہو کر احترام سے کھڑا ہو گیا۔ صبور احمد سیم کے اندرونی کنارے کے پاس بیٹھ گئے تو احمد سبحانی کو ایک بل نظر آیا۔ اس کی حیرانی عروج پر تھی۔ ایسے بل تو خطرناک اور موذی

جانوروں کے ہوتے ہیں۔ چند لمحوں بعد ہی ایک سیاہ رنگ کا موٹا سانپ پھنکارتا ہوا جھومتا ہوا بل سے باہر آیا تو احمد سبحانی لرز کر رہ گیا۔اس کے پاؤں من من کے ہو گئے تھے۔سانپ کو دیکھ کر اس کا گلا خشک ہونے لگا تھا۔

صبور احمد چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تو سانپ جو کہ اندازاً سات آٹھ فٹ کا ہو گا مکمل طور پر بل سے باہر آ چکا تھا۔''شاہ جی بچنا! یہ کہیں آپ کو ڈس نہ لے۔''احمد سبحانی کی آواز میں بے اختیاری تھی۔مگر صبور احمد نے پیچھے منہ کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو اسے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ اب سانپ نے اپنا پھن صبور احمد کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔انہوں نے نیچے بیٹھ کر اس کے پھن پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی کھال پر ہاتھ پھیرنے لگے۔انہوں نے دیکھا کہ سانپ ان سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔اس کی آنکھوں میں اداسی اور نمی احمد سبحانی نے واضح محسوس کی تھی۔

''مجھے کنگن کی موت کا بہت دکھ ہے۔''صبور احمد نے کہا تو احمد سبحانی کو جھٹکا لگا کہ یہ سانپ انسان کی زبان کیسے سن اور سمجھ سکتا ہے جبکہ سانپ کے تو کان ہی نہیں ہوتے۔''مجھے بابو نے سب کچھ بتا دیا ہے۔''احمد سبحانی پر کنگن کی موت کا عقدہ اب کھلا تھا کہ وہ ایک سانپ تھا اور اسے کسی نے مار دیا تھا۔اس جوڑے کا نام کنگن اور کنگنی تھا اور اب صبور احمد کنگنی سے باتیں کر رہے تھے۔کنگنی گھر گھر جا کر کنگن کے قاتلوں کو تلاش کرتی تھی جس کے نتیجہ میں پورا گاؤں ہی بے سکونی میں ڈوبا ہوا تھا۔

صبور احمد کی بات نے بھی اس پر کوئی اثر نہ کیا تھا کیونکہ ابھی تک کنگن کے قاتل اسے کہیں بھی نظر نہ آئے تھے۔اب وہ صبور احمد کے پاؤں میں لوٹنیاں کھا رہی تھی۔گویا کہ اپنی بات اور بے قراری کو شاہ جی تک پہنچا رہی ہو۔

''وہ اس گاؤں میں نہیں ہے۔''صبور احمد کی آواز پر وہ پیٹ کے بل سیدھی ہو گئی۔

''میری بات کا یقین ہے تمہیں؟''اس نے تڑپ کر اپنا پھن اٹھایا اور صبور احمد کی آنکھوں میں دیکھ کر دوبارہ اپنا پھن ان کے پاؤں میں رکھ دیا۔''اب تم کسی گھر میں نہیں جاؤ گی۔کیونکہ وہ اس گاؤں میں نہیں ہے۔''وہ پھر لوٹنے لگی تو صبور احمد نے دوبارہ اس کی کھال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔''میرا وعدہ ہے تم سے......اسے تم ہی اپنے طریقے سے ختم کرو گی۔''صبور احمد کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کنگنی نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کی اور ساتھ ہی کوئی سوال بھی کر دیا۔کیونکہ صبور احمد دوبارہ بولے۔



''یہ عین ہے۔مستقبل اسی کا ہے۔''صبور احمد نے احمد سبحانی کا نام لینے کی بجائے اسے عشق کی سند سے پکارا تھا۔''میں شاید دوبارہ نہ آ سکوں۔مگر تم اسے میرا وعدہ یاد دلانا...... یہ عین ہے۔''صبور احمد کنگنی سے احمد سبحانی کا تعارف کروا رہے تھے اور احمد سبحانی ہمت کر کے آگے بڑھتا ہوا صبور احمد کے برابر چلا گیا تو کنگنی نے اپنا پھن اس کے پاؤں پر رکھا تو احمد سبحانی کی تو جان ہی نکل گئی۔مگر وہ اوپر والا سانس اوپر کیے ہوئے ہی اوپر اوپر سے مسکراتا ہوا بولا۔''م...... میں، میں...... یاد رکھوں گا۔''اس نے وعدہ کیا تو کنگنی صبور احمد سے ایک بار پھر ایفائے عہد کی تصدیق چاہنے لگی۔''یہ ایک سیّد کا وعدہ ہے۔صبر سے کام لینا۔ساتھی کی جدائی بہت بڑا المیہ ہوتا ہے...... خلقِ خدا کو تنگ نہ کرنا۔''کنگنی نے صبور احمد سے وعدہ لیا اور ان کو سلام کر کے واپس اپنے بل میں چلی گئی۔صبور احمد واپس مڑے تو ان کی آنکھیں نم تھیں پھر وہ آسمان کی جانب منہ کر کے رونے لگے۔احمد سبحانی اپنے مرشد کی دلی کیفیت سے آشنا تھا۔

☆=======☆=======☆

بابو کوچوان ان دونوں کو اپنے گھر لے آیا تھا۔اس کا گھر گاؤں کے دوسرے گھروں کی طرح مٹی سے بنا ہوا تھا۔ویسے رقبہ بہت تھا مگر اس نے تین کمروں کو تعمیر کرنے کے بعد کھلا میدان چھوڑ دیا تھا۔اس کا اچھا بھلا گزارا ہو رہا تھا۔صحن میں ایک سکھ چین کا درخت تھا جسے کبھی چھوٹے سے پودے کی صورت میں صبور احمد نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔بابو کی گزر بسر تانگے کے روزگار سے اچھی بھلی ہو جاتی تھی بابو کی بیوی بھی صبور احمد کو عقیدت بھرا سلام کر کے واپس چلی گئی تو بابو نے روٹی پانی کا بندوبست کرنے کے لیے اجازت چاہی۔

صبور احمد اور احمد سبحانی وسیع و عریض صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔سورج مغرب کی جانب اپنا سفر طے کرتا ہوا اپنی دھن میں مگن تھا۔صبور احمد اور احمد سبحانی نے صحن میں لگے ہوئے نلکے سے اچھی طرح منہ ہاتھ دھو لیا تھا۔چند لمحے یونہی گزر گئے تو صبور احمد کی آواز نے احمد سبحانی کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔''احمد سبحانی!''

''جی شاہ جی!''وہ مؤدب لہجہ اختیار کرتا ہوا مختصراً بولا۔

''دل کے اگر کسی کونے میں راہِ عشق پر چلنے کا پچھتاوا ہے تو ابھی لوٹ جاؤ۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں شاہ جی!''وہ تڑپ کر بولا تھا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ الجھے ہوئے ہو۔یہ الجھن کہیں پچھتاوا نہ بن جائے؟''

''میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے دیکھ کر میرا ذہن بہت الجھ گیا ہے شاہ جی!''وہ اپنی

صفائی بیان کرنے لگا۔ ''گاڑی میں وہ لڑکی جو خوب صورتی میں بے مثال تھی۔ اس کے والدین کی پریشانی اور پھر یہ کنگنی کا واقعہ! میرا ذہن الجھ گیا ہے شاہ جی! یہ عشق کی کون سی قسم ہے؟ اور خدا رسول ﷺ کی قسم میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔''

صبور احمد نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''اس گاڑی والی لڑکی پر ایک جن قابض ہے۔ جو اس کا عاشق ہے۔'' احمد سبحانی غور سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ کنگنی اور کنگن گزشتہ تیس برسوں سے مجھے یہیں پر سلام کرتے ہیں۔ میں جب پہلی بار بڑے شاہ جی کے ساتھ آیا تو میری عمر پانچ برس تھی۔ میں پہلی بار ان سانپوں کو دیکھ کر ڈر گیا اور بالکل تمہارے ہی انداز میں شاہ صاحب کو بچنے کی آواز دی۔ مگر شاہ جی نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا یہ صبور احمد ہے۔ اس کی خوشبو سے مانوس ہو جاؤ۔ آئندہ صبور احمد ہی تم سے ملنے کے لیے فیضان پور آیا کرے گا۔ بابو کا والد اور دادا شاہ جی کے مرید تھے اور پھر دیکھا دیکھی گاؤں کے بہت سے گھرانے ہمارے مریدین میں شامل ہو گئے۔ بڑے شاہ جی اب کبھی بھی گاؤں نہیں آتے۔ بس میں جب بھی آتا تھا...... یہ سانپ اور سپنی مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ کھیلتا تھا۔ یہ مجھے اپنی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ مگر اب کسی نے کنگن کو مار دیا ہے تو کنگنی اکیلی رہ گئی ہے۔ میرا ان کے ساتھ بچپن گزرا ہے۔ یوں سمجھو کہ میرا ایک ساتھی میرا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔'' صبور احمد کی آواز ایک بار پھر کنگن کے ذکر پر بھرا گئی تھی۔ ''کنگنی نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں اس کے قاتلوں کو ڈھونڈوں یا پھر اسے یہاں بھیجوں۔ مگر کیا کروں۔ اس کنگن کے قاتل انسان ہیں۔ اگر کنگنی ان کو ڈس کر اپنا انتقام لیتی ہے تو پھر انسانیت بدنام ہو جاتی ہے۔''

''مگر آپ نے تو اس سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کنگن کے قاتل کو یہاں بھجوائیں گے۔''

احمد سبحانی نے صبور احمد کے سانس لینے کے موقع کو غنیمت جانا۔ ''ہاں۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ ''وہ دوبارہ یہاں آئے گا...... ظاہر ہے وہ کوئی اچھا آدمی تو نہ ہو گا جس نے کنگن کو مارا ہے...... اس سارے معاملے کا پتہ بابو ہی بتا سکتا ہے۔'' صبور احمد گویا بات کو چھپا گئے یا پھر ابھی تک تمام معاملہ ہی اندھیرے میں تھا۔ صبور احمد اپنی چارپائی پر لیٹ گئے تو احمد سبحانی ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔

''نہ کرو باؤ جی! تھک جاؤ گے۔'' ان کا انداز احمد سبحانی کو چھیڑنے والا تھا۔

''مجھے راحت ملتی ہے شاہ جی!'' احمد سبحانی نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''مگر عشق تو سکھ چین اور راحت چھین لیتا ہے۔''



''آپ تو ماشاءاللہ پُرسکون ہیں شاہ جی!''

''جب میری جگہ پر آؤ گے تو سمجھو گے کہ عاشق کی ڈیوٹی کتنی سخت ہوتی ہے۔ ابھی تو طفلِ مکتب ہو۔'' احمد سبحانی ان سے عشق کے چیدہ چیدہ نکات پر گفتگو کر کے اپنے علم میں اضافہ کر رہا تھا۔ ''میں کنگنی سے یا شین سے گفتگو کر سکتا ہوں؟''

''پہلے اللہ سے تو ہمکلام ہونے کا سلیقہ سیکھو۔'' وہ سادگی اور محبت سے بولے۔

''مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ اس مہربان رب نے میری بات سن لی ہے۔''

''احمد میاں! ابھی تمہارا ان معاملات میں ذہن اور اعتقاد پختہ نہیں ہے۔ اعتماد اور اعتقاد کو جب جمع تفریق کرو گے تو یکسوئی حاصل ہو گی۔ یکسوئی کو تقسیم کرتے ہوئے اسی کی طرف رجوع کرو گے تو خلوص ملے گا۔ ان سب چیزوں کو محبت اور عقیدت سے ضرب دو گے تو عشق حاصل ہو گا اور جب عشق تمہارا مطیع ہو جائے گا تو تمہیں کائنات کی ہر چیز سے گفتگو کرنے کا سلیقہ خالق کائنات سکھا دے گا۔''

''جیھڑا! تیرے نال جاوے لگ سوہنیا
ساڑ اوہنوں سکدی نئیں اگ سوہنیا
نیڑے توں ایں مومناں دی جان نالوں وی
دوری دی اے گل شاہ رگ سوہنیا!''

صبور احمد، احمد سبحانی پر ایک کتاب کی طرح کھل رہے تھے یا پھر یہ بھی تربیت کا ایک حصہ تھا۔ احمد سبحانی ابھی راہِ عشق کا ادنیٰ سا مسافر تھا۔ جسے سفر کے ادب و آداب کے لیے صبور احمد جیسے ہی استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماضی پر نظر دوڑانے لگا۔

شراب کے نشہ میں دھت ہو کر وہ حیاء نامی طوائف کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا۔ مگر اس نے کبھی بھی حیاء کو چھوا نہ تھا اور نہ ہی کبھی غلط ارادے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ بس دولت کی فراوانی نے اس کے قدم غلط راہوں پر ڈال دیئے تھے۔ پھر اس کی دنیا تب بدلی جب اس کے گھر میں گزشتہ پچیس سالوں سے ملازمت کرنے والے حاکم علی شاہ سیّد گھرانے کے چشم و چراغ نکلے اور پھر وہ اس لمحہ اور وقت کو سنبھال گیا جب حیاء نے اس عظیم اور بابرکت گھرانے کے خلاف بات کی تو اس کی حمیت نے گوارہ نہ کرتے ہوئے اسے تھپڑ مارنے کے ساتھ ساتھ حیاء سے ہر قسم کا رشتہ توڑ لیا۔ اسے عظیم گھرانے کی بدولت ہی عشق کے عین کی سند ملی تھی اور یہ سکول ایسا تھا جس نے امتحان لینے سے پہلے ہی طالب علم کو ڈگری جاری کر دی تھی۔ مگر اس

سکول کے سخت گیر اور اصول پسند ماسٹرز جب طالب علم کا امتحان لیتے تو اس کی ہڈیوں کا گودا بھی نکال لیتے تھے اور کسی بھی کیٹیگری میں فیل ہونے پر طالب علم کو کمپارٹ جاری کرنے کی بجائے اس سے سند ہی چھین لیتے تھے اور پھر اس طالب علم کو دنیا کا سنگ بن کر گلیوں کی خاک چھان کر باقی زندگی گزارنا پڑتی تھی۔

بابو کی بیوی نے کھانا بہت اچھا بنایا تھا۔صبور احمد نے کم جب کہ احمد سبحانی نے سیر ہو کر کھایا تھا۔رات کو بابو نے ان دونوں کے بستر ایک کمرے میں لگا دیئے تھے۔اس کی خوشی دیدنی تھی کہ اس کے مرشد اس کے غریب خانہ پر ٹھہرے تھے۔

وہ صبور احمد کی ٹانگیں دبانے کے لیے آگے بڑھا تو انہوں نے منع کر دیا اور اس سے گاؤں کے چوہدری کے متعلق پوچھنے لگے۔''خدا بخش کا کیا حال ہے بابو!''

''وہ تو جی! چوہدری لوگ ہوتے ہیں۔ان کے حال تو ٹھیک ہی ہوتے ہیں جی!''صبور احمد نے بات آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔''اس کے گھر میں خیریت ہے نا۔کوئی پریشانی تو نہیں؟''

''رزق اور روپے کی فراوانی تو ہے۔پریشانی کیسے ہوگی شاہ جی!''وہ چند لمحے سوچتا ہوا خود ہی بول پڑا۔''ہاں البتہ اس کی پوتی آج کل بیمار ہے۔کالج میں پڑھنے جاتی تھی بے چاری۔پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔اس کا تو پہلے جیسا رنگ روپ ہی نہیں رہا۔''احمد سبحانی کا ماتھا ٹھنکا وہ بابو کی باتیں غور سے سننے کے لیے پوری توجہ سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔اس کا خیال تھا کہ بابو ٹرین والی لڑکی کی بات کر رہا ہے اور بات آگے بڑھے گی تو پتہ چل جائے گا کہ اس پر جن کیسے قابض ہوا تھا۔مگر صبور احمد نے دوسرا سوال کر دیا۔

''اچھا مجھے ذرا یہ بتاؤ کہ کنگن کو کیا ہوا تھا؟''احمد سبحانی یہ داستان بھی سننا چاہتا تھا کیونکہ صبور احمد نے بتایا تھا کہ کنگن اور کنگنی کے ساتھ انہوں نے بچپن بتایا ہے۔

''وہ ماسٹر دین محمد ہے نا جی!''بابو کا انداز خالصتاً دیہاتیوں جیسا تھا۔وہ گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا بڑا خیال رکھتا تھا کہ کہیں مرشد کی شان میں اس سے کوئی گستاخی الفاظ کی صورت میں نہ ہو جائے۔''اس کی بیٹی خیراں کی شادی تھی۔''صبور احمد چونک پڑے۔

''اچھا.....خیراں کی شادی ہو گئی؟''

''ہائے ہائے۔اس بے چاری کے ساتھ تو تقدیر نے بہت ظلم کیا ہے جی۔''بابو عورتوں کی طرح ہاتھ ملتا ہوا بولا۔''کیا ظلم ہو گیا اس خیراں کے ساتھ؟''صبور احمد کا تجسس بڑھنے



تھا۔

''وہ جی سپاہی نذیر احمد کا بیٹا تھا نا جو اشرف سپاہی؟''اس نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے صبور احمد کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''بات کو مکمل کیا کرو بابو۔میں گاؤں کے سبھی لوگوں کو ان کے ناموں سے جانتا ہوں۔میرا بچپن یہیں گزرا ہے۔''

''ہاں جی..... ہاں جی!''بابو ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔''وہ جی! اشرف سپاہی کے ساتھ اس کی شادی تھی پورے پنڈ میں جشن کا سماں تھا۔آخر سپاہی نذیر احمد کے بیٹے کی شادی تھی۔شہر سے بھی بہت سی پولیس سادہ کپڑوں میں آئی ہوئی تھی۔شادی میں شرکت کے لیے۔وہ جی.....نکاح کے موقع پر پنڈ پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔''وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تو صبور احمد کھوئے ہوئے لہجہ میں بولے۔

''خیراں کا کیا ہوا بابو؟''احمد سبحانی اچنبھے سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''ڈاکوؤں کا سردار جو تھا۔اس نے خیراں کو اٹھا لیا اور اپنے پندرہ بیس ساتھیوں کے ہمراہ مہمانوں پر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔اللہ کا شکر ہے جی بس پانچ دس مہمان ہی پھٹڑ ہوئے تھے۔جانیں سب کی بچ گئیں۔اشرف سپاہی نے اپنی ڈب سے پستول نکال کر ان پر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔بس پھر کیا تھا۔پنڈ میں نسو بچی پے گئی۔پولیس والے اور ڈاکو ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے تھے۔ڈاکو آہستہ آہستہ بھاگنے لگے۔مگر وہ خیراں کو اٹھا کر سیم نہر کی جانب بھاگ گئے.....اشرف بھی ان کے پیچھے ہی بھاگا ڈاکوؤں کے پاس گھوڑے تھے۔جبکہ اشرف بے چارہ پیدل ہی ان کا پیچھا کرتا ہوا خیراں خیراں پکارتا ہوا سیم نہر تک پہنچا تو.....خیراں مر چکی تھی۔''

''کیا.....خیراں مر گئی؟''صبور احمد کا انداز بے اختیارانہ تھا۔''آگے بولو بابو۔''

''ہاں جی اس وقت تو یہی لگا کہ خیراں مر گئی ہے۔سیم نہر میں وہ بے لباس ہی پڑی تھی اور اس کے پاس دو ڈاکوؤں کی لاشیں اور ایک طرف کنگن پڑا تڑپ رہا تھا۔اشرف جب پہنچا تو ڈاکوؤں نے خیراں کی آنکھوں کے سامنے اشرف کو گولیاں مار دیں اور بھاگ گئے۔ہوا یوں تھا کہ ڈاکو خیراں کو سیم نہر میں لا کر بے عزت کر رہے تھے کہ کنگن اور کنگنی نے ان پر حملہ کر دیا۔ڈاکوؤں نے ان پر گولیاں چلا دیں۔مگر کنگن دو ڈاکوؤں کو جہنم رسید کر چکا تھا۔ایک گولی کنگن کا کام تمام کر گئی۔ڈاکو خیراں کو بے آبرو کر کے بھاگنے لگے تھے کہ اشرف ان کے سر پر

پہنچ گیا۔ پھر گولیوں کا تبادلہ ہوا تو ایک گولی اشرف کے دل میں لگ گئی۔ وہ وہیں نیم مردہ خیراں کے پاس ہی ڈھیری ہو گیا تھا جی۔'' بابو اپنی عادت کے مطابق خاموش ہو گیا تو صبور احمد کو پھر بولنا پڑا۔

''اور خیراں؟''

''وہ جی اپنے لاڑے کی لاش دیکھ کر پاگلوں کی طرح پیٹنے لگی۔ جب پنڈ کے لوگ پہنچے تو خیراں بے چاری بغیر لباس کے ہی لاڑے کی لاش پر ماتم کر رہی تھی۔ اس نے خاک اپنے سر میں ڈالی ہوئی تھی۔ بس جی...... نذیر سپاہی تو بیٹے کی لاش دیکھ کر گم صم ہو گیا تھا...... اور خیراں پاگل ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد ایک ماہ بعد سپاہی نذیر بھی اللہ کو پیارا ہو گیا...... اور اب خیراں گاؤں کی گلیوں میں ننگے سر اور ننگے پاؤں گھومتی رہتی ہے۔ وہ پاگل ہو گئی ہے جی!'' صبور احمد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ احمد سبحانی کے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ وہ اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو کسی کے بھی غم میں شریک ہو کر انہیں حوصلہ اور دلاسہ دیا کرتا ہے۔ خیراں اور کنگن تو پھر بھی صبور احمد کے ساتھی تھے۔ ان کا بچپن اس گاؤں میں اکٹھے گزرا تھا۔

چند لمحات یونہی گزرے تو صبور احمد ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔

''اور خدا بخش کیا کر رہا ہے؟'' بابو اپنی معلومات کے خزانے کا صندوق کھول کر بیٹھ گیا۔ آخر وہ اس گاؤں میں تانگہ چلاتا تھا۔ اسے ہر گھر کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔

''وہ جی! جب سے اس کی پوتی بیمار ہوئی ہے۔ وہ تو بے چارہ کسے جوگا ہی نہیں رہا۔ اس کی پوتی کبھی ماں کو اور کبھی باپ کو مارنے لگتی ہے۔ وہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی ہے۔ کبھی دیواروں سے سر ٹکرانے لگتی ہے۔ کبھی اونچی آواز میں رونے لگتی ہے۔ کبھی ہنسنے لگتی ہے۔ خدا بخش تو بے چارہ لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتا ہوا تھک گیا ہے۔ اب وہ زیادہ تر حویلی میں ہی رہتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ خدا بخش بھی صبور احمد کو جانتا ہے۔ یا پھر مرید ہے۔'' احمد سبحانی خود ہی بڑبڑایا تو صبور احمد کی بات نے اس کی سوچ پر مہر ثبت کر دی۔ ''خدا بخش بھی ہمارے ابا کا مرید ہے اور ہمیں ابا جی یعنی مرشد سرکار نے اسی لیے بھیجا ہے کہ خدا بخش کے گھر کو پریشانی ہے۔ اللہ اللہ کرو آؤ۔'' یہ بھی صبور احمد کے علم کا ایک ننھا سا تجربہ تھا اس نے احمد سبحانی کی بڑبڑاہٹ دل کی سماعت سے سن لی تھی۔

''ٹھیک ہے بابو! پھر ہم صبح سویرے ہی چوہدری خدا بخش کی حویلی چلیں گے۔'' صبور



احمد نے کہا تو بابو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اب تم جا کر آرام کرو۔'' وہ الٹے قدموں اٹھا اور منہ صبور احمد کی جانب کیے ہی آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ احمد سبحانی سوچنے لگا کہ ... کی قدر تو گاؤں کے لوگ کرتے ہیں۔

''احمد سبحانی!'' وہ صبور احمد کی آواز پر دل و جان سے متوجہ ہو گیا۔

''جی شاہ جی۔''

''گونگے اور بہرے بن کر رات گزارنے سے بہتر ہے کہ اس عظمت والے اور بزرگی والے رب کی شان بیان کرتے ہوئے رات گزاری جائے۔''

''جی شاہ جی! یہ تو میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہو گی اور میری خوش قسمتی ہے کہ اس رات میں آپ کا ساتھ بھی مجھے میسر ہے۔'' وہ باادب لہجہ اختیار کرتا ہوا بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے صحن میں لگے ہوئے نلکے سے وضو کرتے ہیں۔'' صبور احمد کی پیروی میں احمد سبحانی کو بھی باہر آنا پڑا۔ دروازہ کھولتے ہی سرد ہوا کے جھونکے نے ان کا استقبال کیا اور مزید یہ کہ صحن میں ہر طرف دھند ہی دھند چھائی ہوئی تھی۔ سردیوں کی روانگی کا مہینہ چل رہا تھا۔ سردی اور دھند اپنے عروج پر تھی۔ وہ اندازے سے نلکے تک پہنچے تو حیران رہ گئے۔ سکھ چین کے درخت پر ایک چالیس واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ جو دور سے دھند میں نظر نہ آتا تھا۔ یہ بابو نے رات کو پانی کی ضرورت پڑنے پر اس لیے لگایا تھا کہ کہیں اسے یا اس کی بیوی کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔

پہلے صبور احمد نے احمد سبحانی کو نلکا چلا کر وضو کرایا تو اس کی عقیدت سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ محبت اور عقیدت کے آنسو بھی نلکے کے ٹھنڈے پانی میں شامل ہو کر وضو کی فرض شناسی کا کام دینے لگے۔ صبور احمد احمد سبحانی کو وضو کروانے کے لیے نلکا چلا رہے تھے یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ پھر احمد سبحانی نے نلکا چلا کر صبور احمد کو وضو کرایا۔ ٹھنڈے پانی کی تاثیر سے ان کی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔

جاگ کر تو احمد سبحانی نے بہت سی راتیں گزاری تھیں مگر ان میں کوئی بھی رات ایسی نہ تھی جو اس نے عبادت الٰہی میں جاگ کر گزاری ہو۔ شراب کے نشہ میں دھت ہو کر حیاء کا مجرہ سننا یا پھر دوستوں کی محفل میں گپ شپ کرتے ہوئے رات گزار دینا اس کا مشغلہ تھا۔ آج عبادت میں اس کی پہلی رات تھی اور وہ اپنی سند حاصل کرنے کے بعد اس کا حقدار بھی بن کر دکھانا چاہتا تھا۔

صبور احمد بھی لحاف یا رضائی کے بغیر اپنی چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔

''تمہیں جو سبق دیا گیا ہے اسے اچھی طرح یاد کرو۔ آج سنا جائے گا۔'' صبور احمد کی بات سن کر احمد سبحانی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی چار پائی پر صبور احمد کا دیا ہوا کمبل اپنے وجود کے گرد لپیٹے ہوئے بیٹھا تھا۔ پہلے تو اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ کتنی مقدار میں پڑھے اور کس طرح پڑھے اس نے رہنمائی کے لیے صبور احمد کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے ہوئے متحرک ہونٹوں سے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ احمد سبحانی نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

صبور احمد کی بات ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کو سامنے رکھتے ہوئے ذہنی یکسوئی سے لفظ ''اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔'' کا ورد شروع کر دیا۔ اسے چند سو مرتبہ پڑھنے کے بعد ہی محسوس ہونے لگا کہ اس کا دل الف سے اللہ ھو کی ضربوں سے دہلنے لگا ہے۔ اس کے اندر چھپا ہوا شیطان ڈر کر بھاگ رہا تھا۔ خوف دنیا دل سے نکل کر خوفِ خدا جگہ بنا رہا تھا۔ اس کا اندر تبدیل ہو رہا تھا۔ دل کی دنیا میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں ہونے لگی تھیں۔ نئی حکومت آنے والی تھی۔ تبدیلیاں بھی اس کی مرضی کی ہی ہو رہی تھیں۔

اتھل پتھل اور اکھاڑ پچھاڑ نے اس کے منتشر ذہن کو پُرسکون کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہا تھا جو اب بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ دنیاوی رنج وفکر سے آزاد اور ہر قسم کی فکر سے بےفکری ہو گئی تھی۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی نہایت ہی حسین جمیل عورت جو کہ پریوں سے بھی زیادہ حسین اور خوبصورت تھی اسے اپنی بانہوں میں اڑا کر آسمانوں کی جانب لے گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہو گئی۔ وہ ایک حسین محل کے سامنے کھڑا تھا۔ حسین وجمیل عورت کہنے لگی۔

''یہ جنت ہے اور جنت میں بنا ہوا یہ خوبصورت محل تمہاری ملکیت ہے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ تم نے خوامخواہ ہی اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال رکھا ہے۔ بس..... اب کچھ بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تمہاری عبادت کا یہ رت جگا بہت پسند آیا ہے.....'' وہ ہونقوں کی طرح عورت کا منہ دیکھنے لگا۔ ''جاؤ اور محل کے اندر داخل ہو جاؤ'' احمد سبحانی اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑا کر محل کی جانب چند قدم ہی بڑھا تھا کہ سامنے سے صبور احمد کو آتا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ان کی آنکھیں غصے اور نفرت سے سرخ انگارہ بنی ہوئی



تھیں۔ وہ لال لال آنکھوں سے احمد سبحانی کو گھور رہے تھے۔

''یہ شیطان ہے عقل کے اندھے۔ اس کے کاری وار سے بچ! عبادت اور ذکر الٰہی تو انبیاء پر بھی فرض تھا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک شاگل جس میں پانی تھا وہ کھول کر احمد سبحانی پر پھینک دی۔ پانی شاگل کے کھلے ہوئے منہ سے نکل نکل کر احمد سبحانی کے بدن کو بھگونے لگا۔ اس نے بری طرح ٹھٹھرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حسین وجمیل عورت کی شکل بدل کر ایک کریہہ مرد کی صورت بن گئی تھی۔

وہ قہقہے لگاتا ہوا کہیں بادلوں میں گم ہو گیا تو اس نے وہاں صبور احمد کو بھی نہ پا کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ بابو کوچوان کے گھر اپنی چار پائی پر موجود تھا۔ کمبل اس کے وجود کے گرد ویسے ہی لپٹا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔

اسے یک دم اپنے جسم میں سردی کا احساس ہوا تو وہ چونک گیا۔ اس کی حسیات جاگ اٹھی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کے کپڑے بھی گیلے تھے اور بدن بھی۔ جبکہ صبور احمد اپنی چار پائی پر موجود تھے اور رب تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گڑگڑا رہے تھے۔

''میرے پروردگار! اُمت محمدی ﷺ پر رحم فرما اپنے کرم کی بارش سے اس اُمت کے گناہوں کو دھو دے۔'' احمد سبحانی نے دیکھا کہ صبور احمد کی گریہ زاری بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کا بدن ہولے ہولے ہچکولے کھا رہا تھا۔

''میرے اللہ! ان پر رحم فرما دے جو تیری راہ سے بھٹک کر جھوٹے بزرگوں کے ہاتھوں بے وقوف بن گئے ہیں۔ اپنی عزتیں، جان و مال گنوا رہے ہیں۔ میرے اللہ! اس نادان اور کم عقل صبور احمد کو کسی آزمائش میں نہ ڈالنا۔ یہ کسی بھی آزمائش کے قابل نہیں ہے۔''

احمد سبحانی ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنی عاجزی سے تو رحمت خداوندی ضرور جوش میں آ گئی ہو گی۔ یہ کوئی عام آدمی نہ تھے بلکہ کائنات کے خالق کے محبوب ﷺ کی اولاد میں سے تھے۔

''یا میرے مالک! احمد سبحانی پر اپنا فضل وکرم فرما۔ اس گناہگار بندے پر اپنی رحمتیں نازل کر دے۔ اس کے لیے ہر منزل آسان راہوں کی بنا دے۔ اس کی غلطیوں، کوتاہیوں کو بخش دے۔ اس نے تیرے محبوب ﷺ کی آل کی خاطر دنیاوی عشق کو تیاگ دیا ہے۔ اسے عشقِ حقیقی کی حقیقت عطا فرما۔''

احمد سبحانی کی ہچکی بندھ گئی۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اس کا نام لیا جا رہا تھا۔ اس

کے گناہوں کی مغفرت کے لیے ایک سیّدزادہ شہزادہ رو رو کر اللہ سے التجائیں کر رہے تھے۔

''اوئے احمد سبحانی......اوئے تُو کتنا خوش قسمت ہے اوئے گندے۔'' یہ اس کے اندر کی آواز تھی۔ جس نے احمد سبحانی کی آنکھوں کو ساون بھادوں میں بدل دیا تھا۔ وہ آنسوؤں کے معطر پانی سے باوضو ہونے لگا۔ زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی کی دعا۔ ایک آلِ رسول کے منہ سے نکلی ہو تو پروردگار کیسے رد کر سکتا ہے؟ مگر یک دم اسے صبور احمد کی آواز نے خوفزدہ کر دیا تو وہ توجہ سے سننے لگا۔

''میرے اللہ! اس نے عشق کے عین کی توہین برداشت نہیں کی۔ یہ تارک دنیا ہو گیا۔ اسے اپنا قرب میرے بعد بالکل اسی طرح عطا فرمانا جس طرح مجھ پر کرم کیا گیا ہے۔ میرے عظیم رب! مجھے اپنے پاس بلا لے۔ میں اب تھک گیا ہوں۔ اس گناہ آلودہ زندگی سے میرا جی اکتا گیا ہے۔ گندگی سے لتھڑی دنیا میں میرا دم گھٹتا ہے۔ میرے اللہ مجھے معاف فرما دے۔ مجھے معاف فرما دے۔ پروردگار! شین اور قاف کو بھی کامیابیاں عطا فرما۔ ان کو بھی مشکلات میں اپنے سہارے کی صورت میں غیب سے مدد فراہم فرما۔ کرم کر۔ اللہ۔ کرم کر۔''

صبور احمد کی التجائیں ختم ہوئیں تو احمد سبحانی پتھرا گیا۔ کیونکہ وہ جب سے صبور احمد کو جانتا تھا۔ اسے اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پورا فرما دیتا ہے۔ صبور احمد اللہ سے ضد کر کے اپنی بات منوانے کے قائل تھے۔ مگر یہ کیسی ضد کر لی انہوں نے کہ زندگی کو موت پر ترجیح دے دی۔ وہ ان باتوں اور درجات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

مگر پڑھا لکھا ہونے کی بنا پر یہ بات تسلیم کرتا تھا کہ اللہ کا دوست جب اس سے کوئی چیز مانگتا ہے تو وہ اپنے دوست کو خالی نہیں لوٹاتا۔

☆=======☆=======☆

بازارِ حُسن کی پوری برادری اس وقت ایک کوٹھے پر جمع تھی۔ حیاء کو ملزم بنا کر اس میں پیش کیا گیا تھا۔ گڈی بائی نے یہ کیس کنجر برادری میں پیش کیا تھا کہ حیاء اب یہ کام نہیں کرنا چاہتی۔ وہ خاندان اور کاروبار کو بٹہ لگا رہی ہے۔ اس سے کام کا لائسنس چھین لیا جائے اور یہ کوٹھا خالی کروایا جائے تاکہ کام کا تسلسل نہ رک سکے۔

اس وقت پنچایت میں تماش بین اور بدمعاش بھی مدعو تھے۔ مگر حیاء ابھی تک نہ آئی تھی پنچایت کا سرپنچ جو کہ اس بازار کا پرانا کاروباری شخص ''حمیدا'' تھا۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر خود بھی حیاء کی دیر پر تاؤ کھا رہا تھا۔



''گڈی بائی! ہم کوئی اس کے زرخرید غلام نہیں ہیں۔'' حمیدا گڈی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا تو سبھی اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ''میں جانتی ہوں حمیدا جی کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ مگر اس ناس ہونی کو ابھی آ جانا چاہیے تھا۔'' وہ حمیدا کو مکھن لگاتی ہوئی بولی۔ ''اور ابھی تک وہ اپنا شہزادہ جبرو بھی تو نہیں آیا۔'' گڈی نے گویا حمیدے کو یاد دلایا کہ اس کا ایک مہرہ پنچایت میں کم ہے۔

ابھی باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ حیاء کی آمد ہوئی اور پرانی طوائفوں نے اس کی آمد پر ناک منہ چڑھایا۔ کیونکہ حیاء نے سر پر سکارف لپیٹا ہوا تھا اور اپنے بدن کو ایک چادر میں لپیٹ کر حُسن کو دوبالا کیا تھا مگر وہ پردہ کرنا چاہتی تھی۔ چونکہ پنچایت اس کے خلاف تھی اسی لیے وہ اپنی تیاری کے ساتھ آئی تھی اور اس کے ساتھ اس کا عاشق لاڈو بھی تھا۔ جس نے کلاشنکوف پکڑی ہوئی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ وہاں پر موجود تماش بین بھی اسلحہ لے کر آئے ہوئے تھے۔

وہ حیاء کے ساتھ زبردستی آ گیا تھا جبکہ حیاء نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ آئے۔ چونکہ اس پنچایت کی اطلاع تمام بدمعاشوں اور چیدہ چیدہ تماش بینوں کو تھی ان میں لاڈو بھی شامل تھا۔ وہ ضد کر کے حیاء کے ساتھ آ گیا تھا۔ ''بڑی حاجن بن کر آئی ہو؟'' یہ گڈی بائی کے الفاظ تھے جو اس نے حیاء سے کہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔

''حیاء!'' حمیدا اس سے مخاطب ہوا تو وہ متوجہ ہو گئی۔ ''تم پر الزام ہے کہ تم یہ کام نہیں کرنا چاہتی۔''

''یہ الزام نہیں سچ ہے۔'' حیاء کا مختصراً جواب سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ''میں اب یہ کام نہیں کروں گی۔''

''مگر کیوں؟'' حمیدا ہی بول رہا تھا۔

''گڈی بائی جو کہ میری ماں ہے۔ وہ جب تک میرے باپ کا نام پتہ نہیں بتائے گی۔ میں اس کیوں کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' حیاء کی زبان درازی پورے بازار میں مشہور تھی۔

''میں تم پر ایک انکشاف کر دوں حیاء!'' حمیدا بولا تو حیاء اور لاڈو تجسس سے اس کی سمت دیکھنے لگے کہ وہ کون سا انکشاف کرنے والا ہے۔ ''گڈی بائی! تمہاری ماں نہیں ہے۔'' حیاء خود کو زمین میں گڑی محسوس کرنے لگی تھی۔ لاڈو کبھی حیرت سے گڈی بائی اور کبھی حیاء کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ حیاء کو کن الفاظ میں تسلی دے۔ حیاء اس انکشاف کو سن کر لرز گئی تھی۔ وہ باری باری سب بدمعاشوں اور تماش بینوں سے نظر چرا رہی تھی۔ طوائفیں قہقہے لگا کر ہنسنے لگیں۔

''اب بھی اس بات کا جواب نہیں دو گی کہ تم اس کاروبار کو کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟''

حمیدا اس انکشاف کے بعد محسوس کر رہا تھا حیاء اندر سے ٹوٹ گئی۔ مگر اس کے جواب نے سب کی بولتی بند کر دی تھی۔

''اب تو بالکل بھی نہیں بتاؤں گی۔'' وہ پُرعزم انداز سے بولی تو حمیدا بول پڑا۔

''تمہیں یہ بازار چھوڑنا پڑے گا۔''

''کیوں؟ یہ بازار کس کی اجارہ داری ہے؟'' وہ تنک کر بولی۔

''یہ پنچایت کا فیصلہ ہے۔'' گڈی بائی نے لقمہ دیا تو حمیدے نے اس کو ہاتھ کھڑا کر کے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ مگر اس کے اس فقرے نے حیاء کی توپوں کا رخ گڈی کی طرف کر دیا تھا۔

''مجھے جان کر بہت خوشی ہوئی کہ میں نے اس جیسی کمینی اور بے غیرت طوائف کے وجود سے جنم نہیں لیا۔'' اس کی زبان انگارے برسانے لگی تھی۔ گڈی بائی کے نتھنے پھولنے لگے۔ مگر حیاء کی آواز میں دم خم تھا۔ اسے خاموش ہی رہ کر حیاء کی بات سننے کی مجبوری تھی۔

''میری ماں ایک طوائف ضرور ہوگی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری طرح کم ظرف اور گھٹیا کردار کی مالک نہیں ہوگی۔''

''حیاء! تم پنچایت کی توہین کر رہی ہو۔'' حمیدا اونچی آواز میں بولا تو حیاء کی آنکھوں میں جوش اور انتقام کی سرخی دیکھ کر اندر سے وہ بھی دہل گیا تھا۔

''کون سی پنچایت؟'' حیاء اٹھ کر کھڑی ہوگئی تو لاڈو نے اپنا اسلحہ الرٹ کر لیا۔ ''یہ پنچایت! میں تھوکتی ہوں اس پنچایت پر اور پنچایت بلوانے والیوں پر۔''

''اپنی زبان کو لگام دو نادان لڑکی!'' ایک بوڑھی طوائف نے حیاء کو ڈانٹنے والے انداز میں جھڑکا تو وہ اور بھڑک گئی۔ ''تم بھی اس بے غیرت کا ساتھ دے رہی ہو؟ کیا طوائفوں کے منشور میں یہ بات درج نہیں ہے کہ کوئی بھی طوائف دوسری کو دھوکا نہیں دے گی؟''

''دھوکا تو تم دے رہی ہو ہمیں اس کاروبار سے غداری کر رہی ہو۔'' ایک اور طوائف بولی۔



''پہل اس بے غیرت نے کی ہے۔'' حیاء کا اشارہ گڈی بائی کی طرف تھا۔ ''پوچھو اس سے کہ تہجد کے وقت مجھے اپنے چند غنڈوں کے ساتھ تشدد کر کے کوڑا اسٹینڈ پر کیوں پھینک آئی تھی؟ پوچھو اس بے غیرت سے۔'' حیاء کی بات نے تمام حاضرین پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

''اور تم حمیدے!'' وہ حمیدے کی جانب مڑی تو وہ نظریں چراتا ہوا سہم گیا۔ ''اس کے کہنے پر یکطرفہ فیصلہ کرنے لگے تھے۔ اس پنچایت میں کوئی ہے جو مجھے بتائے کہ میرا باپ کون ہے؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میری ماں کون ہے؟ میں کہاں سے آئی ہوں؟'' اس کی نم آواز میں بھی گونج تھی۔ گھن گرج تھی۔ تمام طوائفیں سہم کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی اس کی بات کا جواب نہ دے پا رہا تھا۔

''کوئی نہیں ہے جس کے منہ میں حلال کا نوالہ گیا ہو...... یاد رکھو! تم نے مجھ پر ایک انکشاف کیا ہے۔ ایک میں بھی انکشاف کروں گی۔ جو تمہاری روحیں تڑپا دے گا۔ ذرا دل سنبھال کر بیٹھو۔'' حیاء جان بوجھ کر خاموش ہوگئی تھی وہ اپنی کہی ہوئی بات کا ردعمل دوسروں کے چہروں پر دیکھنا چاہتی تھی۔ سب کے چہرے ہونقوں کی طرح اسی کی جانب متوجہ تھے۔ وہ اکیلی ہی جان محفل بنی ہوئی تھی۔

''وہ کوٹھا سرکاری کاغذات میں میری ملکیت ہے۔ میں اس جائیداد کی بلا شرکت غیرے مالک ہوں۔'' اس نے اپنا انکشاف بتانا شروع کیا تو سب کے دل آنے والے لمحات کی سنگینی کا اندازہ کر کے دھڑکنا بھول گئے تھے۔ ''میں اس جائیداد کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکتی ہوں...... تم سب کان کھول کر سن لو...... اب اس جگہ پر حیاء کبھی نہیں ناچے گی...... اور نہ ہی کسی کو ناچنے دے گی۔'' اس کی شہادت کی انگلی اس انداز میں کھڑی تھی گویا سب کو متنبہ کر رہی ہو کہ اس کی راہ میں ٹانگ اُڑانے کی جرأت مت کرنا۔ ''اس جگہ پر مدرسہ بنے گا اور بچے اور بچیاں قرآن کریم پڑھیں گے۔'' اس بات نے طوائفوں کی روح فنا کر دی تھی۔

وہ دیوانیوں اور پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ تماش بین اور بدمعاش بھی حیاء کے اس فیصلے پر کوئی تبصرہ کرنے سے گریزاں تھے۔ وہ خاموش ہو کر حمیدے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جس کے دماغ میں نہ جانے کیا چل رہا تھا۔ ''اگر کسی نے میرے کام میں مداخلت کی جرأت کی تو یاد رکھنا میں بھی تم لوگوں میں ہی پلی بڑھی ہوں۔ رکاوٹ ڈالنے اور ڈلوانے والے کو زندہ جلا دوں گی...... تم نے صرف طوائف کی زبان دیکھی اور سنی ہے۔ مگر عشق کی تباہ کاریاں نہیں دیکھیں۔'' آخری فقرہ تمام حاضرین میں کسی کو بھی سمجھ نہ آیا

تھا۔ وہ سمجھے کہ حیاء پاگل ہوگئی ہے۔ مگر لاڈو نے ہوائی فائرنگ کر کے تمام کو حواس باختہ کر دیا۔
''میں اپنی ماں اور باپ کو خود ہی ڈھونڈوں گی...... وہ مجھے ضرور ملیں گے...... بس......
اب پنچایت ختم، اور ہمیشہ کے لیے حیاء کو بھول جاؤ۔'' وہ گھن گرج کے ساتھ طوائفوں، بدمعاشوں اور تماش بینوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی باہر آئی اور لاڈو کے ساتھ اپنے ''گھر'' کی جانب چل پڑی۔

''تمہارا بہت شکریہ لاڈو!'' حیاء نے اپنے گھر پہنچتے ہی لاڈو کا شکریہ ادا کیا تو وہ نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا...... اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ دل کی بات زبان پر نہ لا پا رہا تھا۔

''حیاء!'' وہ اپنی گلوگیری پر قابو پاتا ہوا بولا۔ ''کیا تم واقعی آج کے بعد نہیں ناچو گی؟''
حیاء نے ایک کرب سے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں جوانی میں ہی اس گناہ کی زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ یہ گناہ آلودہ اور تعفن زدہ ماحول۔ مجھے قتل کرتا ہے۔ میرا دم ہر روز گھٹتا ہے۔ میں گھٹ گھٹ کر ہر روز نہیں مرنا چاہتی۔ میں مسلمان ہوں۔ خودکشی کو حرام سمجھتی ہوں...... میں اس ماحول میں بہت خوش تھی۔ روپیہ، پیسہ، دولت اور چاہنے والوں کی فراوانی۔ میرے ایک اشارے پر کئی بے وقوف اپنی جانیں دینے پر تیار تھے۔ یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر......'' وہ دور کہیں خلاؤں میں کھوئی ہوئی بولی۔

''ایک دن ایک عاشقِ رسول نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر مجھے میری اوقات یاد دلا دی۔ وہ سادات گھرانے کا عاشق تھا اور لاڈو! تم جانتے ہو...... اصل عشق اسی گھرانے سے شروع ہوا ہے۔ میں اسے اپنا عاشق سمجھتی رہی۔ مگر اس کے عشق کی بلندی اور عظمت کو سلام کرتی ہوں کہ میری مرضی شامل ہونے پر بھی اس نے کبھی مجھے چھوا نہیں۔ وہ عظیم عاشق تھا۔ میں اس کے حُسنِ سلوک سے متاثر ہوگئی۔'' وہ سانس درست کرنے کے لیے رکی تو لاڈو کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

''وہ عاشق میری زندگی سے تو چلا گیا مگر مجھے سادات گھرانے کی عزت وعظمت کا درس ایک تھپڑ میں ہی بتا گیا۔ میں نے جب سے سیّد صبور احمد کے بدن سے گندگی صاف کی ہے۔ اس دن سے میرے دل سے دنیاوی عشق نکل گیا ہے۔ روپیہ پیسہ، عاشقوں کی ادائیں اور یہ گندگی اس طرح دھل گئی ہے کہ مجھے ان چیزوں سے تو نفرت ہونا ہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے بھی گھن آنے لگتی ہے...... مجھے عشق کے گھرانے سے عشق کے قاف کا درجہ ملا ہے اور میں



اس درجہ کی نگران ہوں۔ میں اس کے ساتھ بے ایمانی نہ کر کے آخرت سنوارنا چاہتی ہوں...... میں نے بہت گناہ اور جرم کیے ہیں۔ شریعت کے خلاف کام کر کے دوزخ کا ایندھن بننے میں مَیں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ میں عشق کی رکھوالی ہوں اور اس کی چوکیداری کرتے ہوئے موت کی طلبگار ہوں۔ میں اپنی جان کا نذرانہ دے کر بھی عشق کے آخری حرف قاف (ق) کو سرخرو کروں گی......'' اس کی آنکھیں رم جھم برسنے لگی تھیں۔ لاڈو کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔ حیاء کے سر سے سکارف کھسک گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔
''حیا! لاڈو! جس حیاء کا عاشق تھا۔ وہ کل کی طوائف تھی...... مگر آج جو حیاء اس بدمعاش کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ عشق کی رکھوالی ہے اور سادات کے در کی فقیرنی بھی۔ مجھے آج کی حیاء پر فخر ہے اور میں آج کی حیاء کا بھائی بننے پر خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔'' اس نے حیران و پریشان حیاء کے سر پر سکارف درست کر دیا۔
حیاء اس آوارہ نکھٹو عاشق کو نکما سمجھتی رہی تھی۔ وہ تو اس کے خیالوں سے بھی بلند نکلا تھا۔
حیاء نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ تو وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔
''میں تمہارے ماں باپ کا کھوج لگاؤں گا۔ آج سے کوئی بھی تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھے گا تو تم دیکھنا لاڈو تم پر قربان ہو جائے گا مگر دشمن کی آنکھیں کڈھ لے گا۔''
حیاء کے ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ''تو پھر مدرسے کا کام شروع کریں؟'' اس نے اپنے بھائی لاڈو سے کہا تو وہ بولا۔ ''میری ایک شرط ہے۔'' حیاء حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
''مدرسہ کا جو بھی کام ہوگا۔ اس میں پیسہ میرا خرچ ہوگا...... شاید خداوند کریم کو میری یہی ادا پسند آ جائے اور میں روزِ محشر کملی والے کے مہربان سائے سے فیض یابی پا سکوں۔''
حیاء نے مسکرا کر اس کے دلی جذبے کی قدر کی اور اس کی بات مان لی۔ ''مگر بچوں کو قرآن پڑھائے گا کون؟'' اس بات نے حیاء کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی پریشانی لبوں سے بیان کی تو لاڈو مسکراتا ہوا بولا۔
''تمہارا بھائی کس مرض کی دوا ہے...... ماں باپ نے یہی تو مجھ پر مہربانی کی ہے کہ مجھے دنیاوی تعلیم کی بجائے دینی تعلیم سے نوازا ہے...... بس میں ہی بدبخت تھا۔ راستہ بھول گیا تھا۔'' حیاء کو لاڈو کی باتوں سے اپنائیت کا احساس ہوا تو وہ رونے لگی۔
''اب تم کبھی بھی نہیں روؤ گی۔ اب تم دیکھنا کہ لاڈو تمہاری زندگی میں کانٹے بونے

والوں کو کس اذیت سے دوچار کرتا ہے.....'' اس نے اپنی کلاشنکوف وہیں رکھی اور نیچے بازار میں آ گیا۔ اس کا سامنا جبرو سے اس طرح ہوا کہ لاڈو سیڑھیاں اتر رہا تھا اور جبرو حیاء کے گھر کی سیڑھیاں چڑھنے والا تھا۔ لاڈو اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ جبرو کا زندگی میں پہلی بار کسی نے راستہ روکا تھا۔ اس کے پالتو غنڈے اور ساتھی لاڈو کو حیرانگی سے دیکھنے لگے کہ آج اس کی موت آ گئی ہے۔

''حیاء! اب ناچتی نہیں ہے اور تم اوپر نہیں جاسکتے۔'' لاڈو نے اپنا بازو آگے کر دیا تو جبرو نے بہت ضبط سے کہا۔ ''مگر تم کیوں مجھے روک رہے ہو؟''

''وہ میری بہن ہے۔'' یہ سننا تھا کہ جبرو کا قہقہہ پورے بازار میں گونجا۔ اس کے قہقہے کی وجہ سے حیاء فوراً بالکنی کی طرف بڑھی تو کئی اور طوائفیں بھی دونوں بدمعاشوں کا جھگڑا دیکھنے کے لیے بالکنیوں میں آ گئیں۔ جبرو قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

''بدمعاش ہو..... بدمعاش ہی رہو..... بہن کے دلال نہ بنو۔'' یہ سننا تھا کہ لاڈو نے ایک زوردار گھونسا جبرو کی ناک پر مارا اور بولا۔ ''تم جیسے کتوں کو بھونکنے سے روکنے کے لیے ہی میں اس دروازے کا چوکیدار بنا ہوں۔'' پہلی بار کسی نے جبرو کو اس طرح گھونسا مارا تھا۔ پہلے تو اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مگر ہوش آنے پر توہین کا احساس شدت سے ہوا تو وہ لاڈو کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔ جبرو کے غنڈے اکیلے لاڈو پر پل پڑے۔ وہ جواں مردی سے ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ بازار میں یوں لگتا تھا کہ دو بیلوں کی لڑائی ہو گئی ہے۔ بازار کے ماحول کے مطابق بوتلوں کے کریٹ اور دیگر متعلقہ سامان کی تباہی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ حیاء تڑپتی ہوئی سیڑھیاں نیچے اتر کر آئی تو ایک اُڑتی ہوئی بوتل نے اس کے ماتھے کا استقبال کیا۔ وہ شدید زخمی ہو گئی۔

اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ مگر اس نے پرواہ نہ کرتے ہوئے لاڈو کو بچانے کے لیے غنڈوں سے الجھنا شروع کر دیا۔ جبرو نے کلاشنکوف کے ہوائی فائر کرتے ہوئے حیاء کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بولا۔

''میں نے کہا تھا نا حیاء! کہ آٹھ دن بعد جب آؤں تو سب کچھ بدلا ہوا ہو..... مگر تم نے میری بات کو ہوا میں اُڑا دیا..... یہ کل کا عاشق آج بھائی بن گیا ہے..... یہ سب کچھ ختم ہو گا تو کوئی بھی آئندہ کے لیے کسی طوائف کو سیدھی راہ پر نہیں لے آئے گا۔'' اس نے یہ کہہ کر پورا برسٹ لاڈو کے سینے میں مار دیا۔ وہ تڑپتا ہوا خون میں لت پت وہیں ڈھیر ہو گیا۔



چند لمحے تو حیاء سکتے کی کیفیت میں رہی پھر وہ بھاگتی ہوئی لاڈو کی لاش سے لپٹ گئی اور بَین کرنے لگی۔ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی بھی اس کی دادرسی کے لیے نہ آگے بڑھا تھا۔ جبرو اور اس کے ساتھی بڑھکیں مارتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ یہ بالکل فلمی منظر تھا۔ کوئی بھی حیاء کی مدد کے لیے نہ آیا تھا۔ وہ لاڈو کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی اور روتی روتی بے ہوش ہو گئی۔

وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ ایک قیمتی گاڑی سے کوئی سفید پوش اترا اور اس نے خون میں لت پت حیاء کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا اور گاڑی ہسپتال کی جانب دوڑا دی۔ حیاء تو اس شخصیت کو نہ دیکھ سکی۔ مگر وہاں بازار میں موجود طوائفوں اور تماش بینوں نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ مگر حیرت اور غم سے گڈی بائی کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آدمی جو حیاء کو لے گیا ہے۔ وہ اس کا باپ ہے۔

☆=======☆=======☆

وہ رات احمد سبحانی کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔شیطان نے اسے چنگل میں پھانسنے کے لیے بہترین جال بنا تھا اور وہ اس میں بری طرح پھنس بھی گیا تھا۔مگر عین وقت پر صبور احمد کی مداخلت سے شیطان مردود بھاگ نکلا تھا۔مگر جیسے ہی احمد سبحانی کی آنکھ کھلی وہ بابو کوچوان کے گھر میں اپنی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔اس کے کپڑے پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔اس کا مطلب تھا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔کیونکہ صبور احمد سجدے میں گرے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی روحانیت کی بلندی اور عشق کی راہوں میں کامیابی سے چلنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔احمد سبحانی کو یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔اس نے صبور احمد کے بارے میں حاکم علی شاہ سے سن رکھا تھا کہ وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔مگر اب وہ ان کے ساتھ پہلا سفر کر رہا تھا اس پر صبور احمد کا کردار کھلنے لگا تھا کہ حالات و واقعات ہی مجبور کرتے ہیں کہ صبور احمد ان کا مقابلہ کریں اور ان کی یہی خوبی تھی کہ وہ ان حالات و واقعات کے قالب میں ڈھل جاتے تھے۔

انہوں نے صبح کا ناشتہ مختصر کیا ہوا تھا۔اپنا سامان سمیٹ کر وہ بابو کوچوان کے تانگے میں بیٹھ کر خدا بخش کی حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔بلبل کے ٹاپوں کی آواز مدھم تھی کیونکہ کچی سڑک ہونے کی وجہ سے آواز کم آ رہی تھی اور مٹی اُڑ رہی تھی۔دور تک پھیلا ہوا سبزہ آنکھوں کو فرحت اور سکون بخش رہا تھا۔

احمد سبحانی کو دکھ ہونے لگا کہ وہ یونہی دوسرے ملکوں کی سیر کر کے روپیہ اور وقت برباد کرتا رہا۔اس کے ملک کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔جو جرمنی، یورپ اور امریکہ، کینیڈا سے کہیں خوبصورت تھا۔اسے کھیتوں سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو ان ملکوں میں کہیں نہ ملی تھی۔اس کی آنکھوں میں اس منظر کو دیکھ کر پسندیدگی کے تاثرات تھے اور پہلے وقت ضائع ہونے کا دکھ



بھی نمایاں تھا۔

''بابو!'' صبور احمد بابو سے مخاطب ہوئے تو پیچھے منہ کرتا ہوا بولا۔''جی شاہ جی!''

''بابو! کوئی بات ہی سنا دو یار!...... ماحول اداس اداس لگتا ہے۔'' احمد سبحانی نے صبور احمد کے لہجے سے محسوس کیا کہ وہ ابھی تک خیراں اور کنگنی کے واقعات پر غمگین اور دکھی ہیں۔

''شاہ جی! جب سے خدا بخش کی پوتی کو سایا ہوا ہے۔سچ پوچھیں تو ہر بندہ ای پریشان ہے جی!'' وہ بلبل کو ایک جانب موڑتا ہوا بولا تو ٹیوب ویل کی آواز نے ماحول میں خوشگواریت پھیلانے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔''اور پھر کنگنی نے جو دہشت پھیلائی ہوئی ہے......بس توبہ ای بھلی اے جی!'' بلبل کے سموں کی آوازیں اب کانوں کو لبھانے لگی تھیں کیونکہ تانگہ اب پختہ اور تارکول سے بنی ہوئی سڑک پر چڑھ گیا تھا۔

''میں نے کنگنی سے کہہ دیا ہے وہ اب کسی کو تنگ نہیں کرے گی۔تم بتاؤ رات کو کسی گھر سے رونے اور چیخنے کی آوازیں تو نہیں آئیں نا؟'' صبور احمد اپنی بات کی تصدیق چاہتے تھے یا پھر بابو کو مطمئن کرنا چاہتے تھے۔یہ بات احمد سبحانی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔وہ تو تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ان دونوں کی باتیں سن سن کر حیران ہو رہا تھا۔وہ پڑھے لکھے معاشرے میں زندگی گزارنے والا باشعور شہری تھا اور اس کے لیے ان باتوں کی کوئی بھی حقیقت نہیں ہونی چاہیے تھی۔مگر جب سے اس نے عشق کے عین کا چولا پہنا تھا۔اس پر خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی دنیا کے اسرار کھلنے لگے تھے۔اب وہ ان باتوں کو سچ بھی مانتا تھا اور بھوت پریت پر اعتبار بھی کرنے لگ گیا تھا۔

''نہیں جی! رات تو اس طرح گزر گئی کہ پتہ ای نہیں چلا۔'' بابو کا تسلی بخش جواب سن کر صبور احمد نے بھی پُرسکون سانس خارج کی۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتے۔سڑک کے بیچوں بیچ ایک پاگل عورت جو اپنے سر کو کھجا رہی تھی۔کبھی ادھر ہو جاتی اور کبھی اُدھر ہو جاتی۔صبور احمد نے سمجھ لیا کہ یہی خیراں ہے۔

''بچ جا! خیراں بی بی!'' بابو کی بات نے تصدیق کر دی کہ یہی خیراں ہے۔

''اس کے پاس جا کر تانگہ روکنا بابو!'' صبور احمد کی آواز رندھ گئی تھی۔بچپن اکٹھے گزارا تھا اور پھر خیراں ان سے دلی لگاؤ بھی رکھتی تھی۔وہ اس گاؤں میں صبور احمد کو تنگ کرنے والی واحد لڑکی تھی۔ورنہ باقی تو سبھی اس کی عزت کرتے تھے۔عزت خیراں بھی کرتی تھی مگر اس بات پر اتراتی تھی کہ صبور احمد اس کی باتوں اور چلبلی شرارتوں کا برا نہ مناتے تھے۔

بلبل بھی صبور احمد کی بات سمجھ کر خیراں کے پاس جا کر رک گئی تو صبور احمد تانگے سے اتر کر حیران اور پریشان خیراں کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ بابو کوچوان اور احمد سبحانی بھی ایک طرف تھے۔ خیراں سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو کر صبور احمد کو دیکھنے لگی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

خیراں کے شعور میں کھلبلی مچنے لگی تھی۔ وہ اپنے سر پہ زور زور سے ہاتھ مار کر یاد کرنے لگی کہ اس نے صبور احمد کو کہیں دیکھا ہے۔ یک دم اس کا شعور یادداشت کی پٹڑی پر چڑھا تو اس کی آنکھوں نے جھلمل کر کے پیہم برسات کی صورت اختیار کر لی۔

وہ صبور احمد کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھو کر غور سے دیکھنے لگی۔ صبور احمد جھلمل آنکھوں سے اس کے سامنے تصویر بنے کھڑے رہے اور چند ساعتوں کے بعد بولے۔ ''مجھے پہچانا ہے خیراں؟'' وہ روکھی روکھی اور اجاڑ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی اور صبور احمد کا ہاتھ پکڑتی ہوئی دور کہیں اندر کے کنویں سے بولی۔

''متا!'' صبور احمد کی آنکھیں رم جھم برسنے لگیں۔ دراصل وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ خیراں شعور کی دنیا میں لوٹ آئے اور اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ تقدیر کے فیصلے بدلے نہیں جا سکتے۔ اس کی زبانی اپنا بچپن کا نام سن کر صبور احمد کو قلبی سکون پہنچا۔ وہ بھی خیراں کی ہوش کی دنیا میں واپسی چاہتے تھے۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟'' صبور احمد نے اس کے سر کو اس کی چنی سے ڈھانپتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

''یہ تُو مجھ سے نہ پوچھ...... اپنے مالک سے پوچھ۔'' اس کا اشارہ رب کریم کی طرف تھا۔

''وہ تو مہربان ہے...... مالک ہے...... ہمیں بتانے کا پابند تو نہیں ہے۔'' صبور احمد کی معرفت کی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے اسی کے مطابق چولا پہن لیا تھا۔

''پر میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟'' ایک بار پھر آنسوؤں کی لڑی خیراں کی آنکھوں سے جاری ہو گئی۔

''اس کا کوئی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا...... اور نہ ہی وہ اپنے بندوں کا کچھ بگاڑتا ہے۔''

''اپنے بندے؟''



''ہاں خیراں! جو اس کے بندے ہوتے ہیں اور جو اس کو بہت محبوب ہوتے ہیں...... وہ ان سے آزمائشیں لیتا ہے...... پھر اپنی آزمائش پر صابر و شاکر رہنے والے کو انعام دیتا ہے۔''

''کیا میں اس کی محبوب بندی بن سکتی ہوں؟''

''تم ہو۔'' صبور احمد نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ خیراں اب ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی تھی۔ ''تم اس کے محبوب بندوں کی فہرست میں شامل ہو۔ اسی لیے تو تم کو اس نے آزمایا ہے...... اس کی آزمائش پر واویلا کر کے ناشکری نہ ہو خیراں...... بلکہ اس کے انعام کی حقدار بننے کی کوشش کرو۔''

وہ صبور احمد کے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ جن کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔

''اپنے مالک سے کہہ دینا کہ خیراں اب اور کسی بھی آزمائش کے قابل نہیں ہے......'' وہ واپس کھیتوں کی جانب مڑنے لگی اور پھر واپس صبور احمد کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''میں اس کی صابر و شاکر بندی بننے جا رہی ہوں متا! دوبارہ کبھی بھی میرے سامنے نہ آنا...... کیونکہ...... میں جانتی ہوں...... تم بھی عاشق ہو۔'' وہ سرتاپاؤں صبور احمد کو لرزا گئی۔ ان کی نظریں یک دم اٹھیں مگر خیراں اپنا رخ موڑ چکی تھی۔ وہ کیا کہہ گئی تھی۔ کتنی بڑی بات اس نے صبور احمد کو کہہ دی تھی۔ اس بات میں کتنی سچائی تھی۔ اس کا اندازہ تو صبور احمد کو ہی تھا یا پھر اس کے مالک کو۔

بلبل ایک بار پھر اپنی راہوں کی جانب چل پڑی۔ تانگے میں مکمل خاموشی تھی۔ مگر احمد سبحانی اب کچھ کچھ صبور احمد کی عادت سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چند لحات یونہی گزریں گے اور صبور احمد اگلی بات کریں گے۔ وہی ہوا۔

''خدا بخش کے بیٹے کا کیا نام ہے؟'' اب صبور احمد کا لہجہ اور انداز بالکل عامیانہ تھا۔ ان کو اپنے اوپر بہت اختیار تھا۔ اس فقرے میں وہ سب کچھ چھپ گیا تھا جو پہلے ایک کلومیٹر پیچھے ہوا تھا۔

''اس کا نام عبدالجبار ہے جی! اس کی بیوی شہر سے بیاہ کر آئی ہے۔ بہت ماڈل ہے۔'' بابو نے گویا انگلش کا لفظ ماڈرن بولنے کی کوشش کی تھی۔ صبور احمد اس کے انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ''اور اس کا چھوٹا بیٹا تو بس شہر کا ہی ہو کر رہ گیا ہے جی!''

''اچھا...... وہ کیا کرتا ہے؟'' صبور احمد بولے۔

''کرنا کیا ہے جی! کھلا روپیہ پیسہ ہے۔ عیش کرتا ہوگا جی اور کیا کرے گا۔''

''اس کا نام کیا ہے؟''

''سیدھا نام تو جبران ہے جی...... پر...... الٹا نام......اس کا بھلا سا ہے۔'' بابو ذہن پر زور دینے لگا۔

''چلو چھوڑو بابو......! لگتا ہے کہ ہم خدا بخش کی حویلی پہنچ گئے ہیں۔'' صبور احمد نے سامنے ہی خوبصورت حویلی دیکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ حویلی اپنی پوری شان وشوکت سے کھیتوں کے بیچوں بیچ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا سفید رنگ جبکہ کھڑکیاں دروازے براؤن رنگ کے پینٹ کیے ہوئے تھے۔ جو حویلی کی شان کو مزید بڑھا رہے تھے۔

صبور احمد اس لمحہ ایک انتہائی سلجھے اور منجھے ہوئے عالم دین کو اپنے الفاظ اور مناظرے سے شکست دینے والے مناظرِ اسلام کے روپ میں آئے ہوئے لگتے تھے۔ اوپر سے طرہ یہ کہ ان کا تعلق ایک عظیم گھرانے اور مذہبی نسل سے تھا۔ صبور احمد اور احمد سبحانی اس حویلی کو پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ جبکہ صبور احمد کا بچپن اسی گاؤں میں گزرا تھا۔ مگر اب یہ حویلی اس طرح لگتی تھی کہ کسی نے اچانک اس کو کھیتوں کے بیچوں بیچ دریافت کرلیا ہو۔

بابو چونکہ اسی گاؤں کا تھا وہ کئی بار یہاں آ چکا تھا۔ بلبل خود ہی جا کر چوہدری خدا بخش کی حویلی کے سامنے رک گئی۔ تو صبور احمد بھی تانگے میں ہی تھے کہ ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے ایک ملازم ان کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ''اوئے بابو! یہ کس کو لے آئے ہو؟ چوہدری صاحب کو پتہ چل گیا تو تیری ٹانگیں تڑوا دیں گے۔''

بابو نے کوئی بھی جواب دینے کی بجائے اس کے کان میں کچھ کہا تو اس کی دوڑیں لگ گئیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ حویلی کا جہازی گیٹ کھلا ہوا تھا۔ صبور احمد نے بابو کو رخصت کرنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔

''نہ جی! میں تو نہیں جاؤں گا۔ مقدروں سے تو آپ کی خدمت کرنے کا موقع ہاتھ لگا ہے...... میں اسے گوا نہیں سکدا۔'' صبور احمد نے اسے سینے سے لگایا اور ہنستے ہوئے بولا۔

''اللہ تعالیٰ نے جو روزی آج تمہارے حصے میں لکھی ہے۔ کیوں اس کو ٹھکرا رہے ہو؟ وہ روزی اور رزق تمہارا منتظر ہے۔ اس کو ٹھکرا کر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری نہ کرو۔'' صبور احمد نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر سامنے کیا۔ ''زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔'' یہ بابو کے مرشد کا حکم تھا۔ اس نے صبور احمد کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور احمد سبحانی سے ہاتھ ملا کر بغلگیر ہوا اور ''اللہ



حافظ!'' کہتا ہوا ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

چوہدری خدا بخش گو کہ اس کا پیر بھائی تھا مگر اس نے گاؤں میں اپنا شملہ اونچا رکھا ہوا تھا۔ اس نے کبھی بابو کی خیر خیریت بھی دریافت نہ کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بابو کو جوان اپنی اوقات میں رہتا ہوا صبور احمد اور احمد سبحانی کو اندر جاتا ہوا دیکھ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ملازم سفید گھوڑا لے کر حویلی کے اندر جانے لگا ہے۔ وہ گھوڑے کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے ملازم کو روک لیا۔ ''رحیمو! او رحیمو!'' وہ اس کی آواز پر رک گیا اور گھوڑے کی باگ چھوڑ دی وہ خود ہی حویلی کے اندر چلا گیا یا پھر اپنی مقرر کردہ جگہ پر پہنچ گیا ہوگا۔

''کہو بابو! کیا بات ہے؟ آج صبح صبح یہاں کھڑے ہو؟'' رحیمو اس کے پاس آتا ہوا بولا۔ تو بابو نے اندر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ گھوڑا...... آج سے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ چوہدری صاحب نے کب اور کہاں سے خریدا ہے؟'' رحیمو اس کی بات سن کر ہنسنے لگا۔

''تو بھی جھلا ای ہے۔ بھلا کبھی چوہدری صاحب کو تم نے دیکھا ہے کہ وہ گھڑ سواری کرتے ہیں۔'' بابو نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ''یہ گھوڑا تو صرف چھوٹے چوہدری صاحب کی ملکیت ہے۔ وہ جب بھی گاؤں آتے ہیں۔ اس پر گاؤں کی سیری کرتے ہیں۔'' بابو حیرانگی سے بولا۔

''چھوٹا چوہدری؟ مطلب...... چوہدری جبران؟''

''ہاں! اب بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ چل جا...... روزی روٹی کے متھے لگ اور مجھے بھی جھڑکی نہ پوا دیں۔'' رحیمو یہ کہہ کر اندر کی جانب چل دیا مگر بابو کا ذہن یہ گتھی نہ سلجھا سکا کہ جس دن خیراں کی بارات تھی۔ اس کا لاڑا قتل ہوا تھا۔ اس دن تمام وقوعہ میں یہ گھوڑا اور گھڑ سوار سرِ فہرست تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس دن واردات چوہدری جبران نے کی تھی۔

یہاں آ کر بابو کا ذہن غوطے کھانے لگا۔ اس نے فوراً اپنے اردگرد دیکھا کہیں کسی نے اس کا خیال تو نہیں پڑھ لیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر بابو کی اذیت ناک موت یقینی تھی۔

وہ اس بات کو شاہ جی تک ضرور پہنچائے گا۔ وہ حویلی کے گیٹ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج رات گئے تک شاہ جی کا انتظار کرے گا۔ ان کو سٹیشن تک چھوڑ کر آئے گا اور راستے میں اپنے خدشے کا اظہار بھی کرے گا۔

احمد سبحانی حیرانگی سے حویلی کو دیکھ رہا تھا۔ جتنے رقبے میں اس کی محل نما کوٹھی تھی۔ اتنا

رقبہ تو چوہدری نے ویسے ہی خالی صحن کے طور پر چھوڑا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اندر سے ایک ساٹھ سالہ شخص ننگے پاؤں ہی بھاگتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی اور وہ جس انداز میں بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ احمد سجانی کو ڈر تھا کہ کہیں وہ آنے والا ان سے نہ ٹکرا جائے۔ صبور احمد اور احمد سجانی ٹھٹک کر رک گئے۔ چوہدری خدا بخش صبور احمد کو اپنی حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ اس کا مرشد زادہ تھا اور آلِ رسول بھی۔ یہ خدا بخش کے لیے بڑا اعزاز تھا۔ کیونکہ آج سے پہلے اس کے گھر میں حاکم علی شاہ تو آتے رہتے تھے مگر جب سے اس نے یہ حویلی بنوائی تھی۔ پہلی بار اس کے گھر اس کے مرشد زادے کی آمد ہوئی تھی۔

چوہدری خدا بخش نے کئی بار حاکم علی شاہ سے اس بات کا گلہ کیا تھا کہ وہ اس کے غریب خانہ پر تشریف نہیں لائے اور نہ ہی کبھی چھوٹے شاہ جی تشریف لائے ہیں۔ آج اس کے دل کی تمام حسرتیں خوشیوں میں بدل گئی تھیں۔ کیونکہ حاکم علی شاہ نے ایک بار کہا تھا کہ جب بھی صبور احمد کا دل چاہے گا تمہارے گھر چکر لگا آئے گا۔

اس کا مطلب تھا کہ صبور احمد دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کی حویلی تشریف لائے تھے۔ خدا بخش کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے وہ پھولے نہ سما رہا تھا۔

''میرا گھر پیا کے قابل نہ تھا۔ پھر بھی میرا پیا گھر آیا......''

اس نے صبور احمد کے ہاتھوں کو بوسے دینے شروع کر دیئے۔ صبور احمد نے اس کی دلی کیفیت کی قدر کی اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ اس نے احمد سجانی سے ہاتھ ملایا تو صبور احمد نے بتایا کہ یہ بھی تمہارا پیر بھائی ہے۔ وہ احمد سجانی کو گلے لگاتا ہوا خوشی سے بولا۔ ''بسم اللہ جی! میرے مقدر جاگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔ میرے مرشد میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔'' وہ ان کو لیتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ ''ادھر تشریف رکھیں شاہ جی!'' ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک بہترین پلنگ کی طرف اشارہ کیا جس کے پایوں کو رنگین نقش ونگار سے سجایا گیا تھا۔

خدا بخش نے صبور احمد کو ادب واحترام سے اس پلنگ پر بٹھایا اور احمد سجانی کو سامنے ایک کرسی پر بٹھا کر خود حویلی کے اندر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔

احمد سجانی سادات گھرانے کی فضیلت وعظمت سے باخبر تھا۔ مگر کتنی عظمت وفضیلت تھی یہ راز اس پر آشکار ہو رہا تھا۔ وہ صبور احمد کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا کہ وہ پہلے دن ان کی شکل اور انداز دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ مگر وہ آج اس کا رہبر ورہنما بنا بیٹھا تھا اور خود احمد سجانی اس کا مرید



اور شاگردِ خاص بن کر پہلی بار ان کے ساتھ ہی سفر پر نکلا تھا۔

اس پر ابھی تک کوئی ایسی آزمائش نہ آئی تھی کہ وہ تن تنہا اس کا مقابلہ کرتا اور عشق کی سند کو سرخرو کرتا۔ وہ خود کو اس سند کے اہل ثابت کرنا چاہتا تھا مگر تقدیر اس سے کیا آزمائش لینا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بے خبر تھا۔ ابھی تک تو وہ صبور احمد کی کرامات ہی دیکھتا جا رہا تھا۔ اب پتہ نہیں خدا بخش کے گھر میں کیا ہونے والا ہے

دروازہ کھلا تو خدا بخش اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں شیشے کا جگ اور دو گلاس تھے۔ اس نے اپنے مرشد کی خدمت کے لیے کسی ملازم کو آواز نہ دی تھی۔ بلکہ خود ہی صبور احمد کی خدمت کر کے راحت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پانی گلاسوں میں ڈال کر پہلے احترام سے صبور احمد کو پیش کیا اور پھر احمد سجانی کو دیا اور خود ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز مؤدبانہ تھا۔

چوہدری خدا بخش کی عمر تقریباً ساٹھ پینسٹھ برس ہو گی مگر دولت اور گاؤں کے پُرسکون پُر فضا ماحول نے اس کو ابھی تک تندرست وتوانا رکھا ہوا تھا۔ اس کے دو بیٹے ہی ابھی ناموس کے لحاظ سے سامنے آئے تھے۔ صبور احمد کبھی بھی اس کی گھر والی سے نہ ملا تھا۔ بلکہ وہ خدا بخش سے بھی اپنے گھر پر ہی ملتا تھا۔ آج پہلی بار وہ اس کی حویلی آئے تھے۔ اب اس کے گھر میں کون کون تھا یہ کچھ دیر بعد پتہ چلنے والا تھا۔

''سرکار!'' خدا بخش نے عاجزی سے صبور احمد کو پکارا تو وہ اس کی سمت متوجہ ہوئے۔

''میں کافی دنوں سے پریشان ہوں۔'' صبور احمد نے پانی ختم کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا پریشانی ہے؟''

''سرکار! ایک مسئلہ ہے جو الجھتا ہی جا رہا ہے۔ میں نے رب کے حضور التجائیں کی ہیں کہ وہ اس پریشانی کو دفع فرمائے اور مجھے نجات عطا فرمائے اور پھر مجھے کل ہی بڑے شاہ جی کی خواب میں زیارت ہوئی کہ وہ آپ کو بھیجیں گے اور اللہ سے استغفار کرتے رہو...... کیا شان ہے سوہنے اللہ کی۔ آپ آج تشریف لے آئے۔'' صبور احمد نے اس کی بات سنی اور چارپائی پر دونوں پاؤں رکھ کر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔

''میرے پاس وقت کم ہے اور سفر زیادہ ہے۔ مجھے مزید مت الجھاؤ۔ اپنی پریشانی بیان کرو۔ میں اللہ تعالیٰ سے التجا کروں گا وہ کرم فرمائے گا۔'' صبور احمد چاہتے تھے کہ خدا بخش اپنی زبان سے تمام مدعا بیان کرے۔ مگر وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ ''جھٹکے کے لیے تیار رہنا!''

احمد سبحانی کے اندر سے کوئی بولا تو وہ حیرانگی سے اردگرد دیکھنے لگا۔ صبور احمد کے خاموش لب دیکھ کر وہ اس بات پر خوش بھی ہوا کہ یہ اس کی اپنی آواز تھی۔ کیا وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ آنے والی چند معلومات کو پہلے سے ہی جان سکے۔ اس نے صبور احمد کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔

''جھٹکے کے لیے تیار رہنا۔'' اس بار ان کی زبان سے وہی الفاظ سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ صبور احمد اور اس کا اندر اسے کس قسم کی وارننگ دے رہے ہیں۔ مگر وہی ہوا جس کی بار بار وارننگ اسے دی جا رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہونے والی نوجوان لڑکی شمیلہ کو دیکھ کر یک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کے ماڈرن والدین اور پھر خدا بخش بھی اندر داخل ہوا۔

احمد سبحانی اپنی بے وقوفی پر خود ہی نادم ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وہ ان سے کل ٹرین میں مل چکا تھا۔ مگر کل کی نسبت لڑکی کا چہرہ آج ہشاش بشاش اور تروتازہ تھا۔ جبکہ احمد سبحانی کو دیکھ کر اس کے والدین کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو احمد سبحانی کی ان کو دیکھ کر ہوئی تھی ان دونوں میاں بیوی نے پیچھے مڑ کر خدا بخش سے کچھ کہنا چاہا تو وہ پہلے ہی بول پڑا۔

''عبدالجبار! کیا سوچ رہے ہو؟ سرکار کو سلام کرو۔'' عبدالجبار ششدر کھڑا تھا وہ کبھی صبور احمد اور کبھی بیوی کو دیکھ رہا تھا جبکہ اس کی بیوی بھی ناک منہ چڑھا رہی تھی۔ اس کی نظر میں صبور احمد اور احمد سبحانی اعلیٰ پائے کے فراڈیے تھے۔

شمیلہ کی خوبصورتی کا بھی کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ ابھی جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھنے کی گناہگار ہی ہوئی تھی۔ گول چہرہ سفید رنگت، ہونٹوں میں گلاب کی آمیزش، لانبہ قد اور گہری سیاہ آنکھیں۔ اس کی مثال ڈھونڈنا تو دور کی بات سوچنا بھی پریشان کر دینے والی بات تھی۔ اس نے صبور احمد کو سلام کیا اور اشارے سے احمد سبحانی کو سلام کیا مگر وہ اس سے نظریں چرا گئی۔ کیونکہ شرم و حیا ہی مشرقیت کا زیور ہے۔

''بیٹی!'' صبور احمد نے شمیلہ کو مخاطب کیا تو اس کی ماں بول پڑی۔

''ابا جی! یہ دونوں تو ٹرین سے ہی ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' بہو کی بات سن کر خدا بخش کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ وہ حلق کے بل دھاڑا۔ ''زارا! تم جانتی ہو کہ کیا کہہ رہی ہو اور کن کے بارے میں؟''

خدا بخش نے غصے سے عبدالجبار کی طرف دیکھا تو اس نے بھی سر ہلا کر بیوی کی بات کی



تصدیق کر دی۔ ''یہ ہمارے مرشد ہیں اور آلِ رسول ہیں۔ اگر تمہاری زبان بند نہیں رہ سکتی تو قابو میں رکھو۔'' چوہدری خدا بخش غصے سے لال پیلا ہو گیا تھا۔ ''میں اپنے مرشد کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔'' بے شک وہ فیشن ایبل اور امیر گھرانے کی تھی مگر چوہدری خدا بخش سے دبتی تھی۔ کیونکہ وہ اس گھر میں اسی کے مرہونِ منت فیصلے کی بدولت موجود تھی۔ صبور احمد نے معاملہ بگڑتا دیکھ کر اپنا کام شروع کیا۔

''عبدالجبار! اور زارا بی بی...... آپ لوگ سامنے جا کر بیٹھ جائیں۔'' صبور احمد کا تحکمانہ رویہ ان دونوں کو بہت کھٹکا۔ مگر بات چوہدری خدا بخش کے مرشد کی تھی۔ وہ چاروناچار سامنے جا کر بیٹھ گئے۔

''بیٹی! تم میرے سامنے آ کر زمین پر بیٹھ جاؤ۔'' شمیلہ نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور صبور احمد کے سامنے نیچے بیٹھ گئی۔ مگر احمد سبحانی نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت بے چین ہونے لگی ہے۔

''چوہدری عبدالجبار!'' صبور احمد کی آواز سن کر وہ توجہ سے متوجہ ہوا۔ ''جی جناب!''

''کتنے پیسے دے کر آئے ہو رام نگر کے بزرگ کو؟'' صبور احمد کا یہ سوال براہِ راست سن کر وہ ٹپٹا کر بیگم کی طرف دیکھتا ہوا دھیمے لہجے میں بولا۔ ''دس ہزار۔''

''کیا محسوس کیا تم نے؟'' یہ سوال بھی براہِ راست تھا۔

''میں سمجھا نہیں جناب!'' عبدالجبار زچ بھی تھا اور ناسمجھ بھی۔

''کیا اس دس ہزار کے ''دم'' سے تمہاری بیٹی ٹھیک ہو گئی ہے؟'' احمد سبحانی کی سمجھ میں استاد صبور احمد کی یہ منطق نہ آئی کہ وہ جبار اور اس کی بیوی کو زچ کر رہے ہیں یا محض وقت گزاری کر رہے ہیں۔''

''جی نہیں؟'' عبدالجبار اس وقت تابعداری میں بولا تھا۔ ''رات کو اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔''

''چوہدری خدا بخش!'' صبور احمد اس مرتبہ خدا بخش سے مخاطب ہوئے تو وہ عاجزی سے بولا۔

''جی شاہ جی!''

''آپ کی بیوی...... یعنی گھر والی کہاں ہے؟'' یہ غیر متوقع سوال تھا مگر جواب دینا ضروری تھا۔

"وہ اندر ہے جی...... چل کر نہیں آ سکتی...... اس کی ٹانگوں میں خرابی ہے۔" کرب کی لکیر نے خدا بخش کو معصوم ظاہر کیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب سے اس کرب میں مبتلا تھا۔

"تم تمام لوگ اور تمہاری بیوی وضو کر کے اس بچی ثمیلہ کو لے کر باہر کھلی فضا میں آ جاؤ...... یہ کام وہیں ہوگا۔" وہ پلنگ سے نیچے اترتے ہوئے بولے تو سبھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ وہ احمد سبحانی کو باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر چلے آئے۔

"احمد سبحانی! وضو کر لو...... اور مجھے بھی کراؤ۔" وہ دونوں صحن میں لگے ہوئے نلکے کی سمت بڑھ گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انہوں نے بابو کوچوان کے گھر میں رات کو باری باری وضو کیا تھا۔ وضو کرنے کے بعد کلمہ شہادت پڑھنے کے لیے صبور احمد نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ "اپنے اس عاجز مست کی لاج رکھنا رحمٰن و رحیم مولا۔ مجھے اپنی رحمت کی پناہ میں رکھنا۔" احمد سبحانی آنے والے لمحات سے بے خبر تھا۔ وہ چلتے ہوئے بڑے سے درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ ایک ملازم کو آواز دے کر اس جگہ پر صفیں اور چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ "احمد سبحانی!" وہ مرشد استاد کی بات پر دل و جان سے متوجہ ہوا۔ "جی شاہ جی!"

"اس کام میں بہت سی مشکلیں تمہارا پیچھا کریں گی۔ مگر سمجھ لو کہ یہ تمہاری پہلی آزمائش ہے۔ شیطان کے وار اور مکارانہ چالوں سے ہوشیار رہنا!" احمد سبحانی خاموشی سے سننے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ صبور احمد کا اشارہ کس آزمائش کی طرف ہے۔ "ثابت قدمی اور اعتماد تمہارے امتحان کی مضبوط بنیادیں ہوں۔"

حویلی کا رقبہ کافی تھا۔ بہت کشادہ صحن تھا۔ جس میں آدھے حصہ کو خوبصورت پارک کی شکل دی گئی تھی۔ باقی آدھا حصہ کچا ہی رکھ کر گاڑی اور راہداری کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ بیرونی دیوار کے ساتھ سفید خوبصورت گھوڑا بندھا ہوا تھا جو اپنی ہودی سے پانی پی کر چارہ کھانے میں مصروف تھا۔ صحن کے ایک طرف پیپل کا بڑا سا درخت تھا جو کہ برسوں پرانا لگتا تھا۔ اس کی جڑیں تقریباً حویلی کی عمارت کے نیچے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت اسی درخت کے نیچے چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

سردی کا موسم تھا۔ دھوپ کی ہلکی ہلکی تمازت جسموں کو گرما کر سکون اور راحت پہنچا رہی تھی۔ ابھی دن کے نو ہی بجے تھے حویلی میں لگتا تھا کہ آدھا دن گزر گیا ہے۔ کیونکہ گاؤں کے لوگ شہر والوں کی نسبت جلدی اور صبح سے سویرے ہی اٹھنے کے عادی تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد خدا بخش اپنی بیوی کی وہیل چیئر چلاتا ہوا صحن میں پہنچ گیا۔ صبور احمد کو دیکھ کر اس کی بیوی نے



سلام کیا۔

صبور احمد اور احمد سبحانی نے غور کیا کہ وہ نیک اور پرہیز گار عورت ہے۔ کیونکہ اس نے ان دونوں کو سلام کرنے کے بعد اپنا منہ دوپٹہ سے ڈھانپ لیا اور نظریں جھکا لیں۔ باقی افراد بھی آ گئے تو صبور احمد نے ان سب کو چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر ان سب کے ارد گرد گول دائرے کی صورت میں چکر لگانے لگے اور اونچی آواز میں قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی۔

مگر گھر والے حیران رہ گئے کہ ثمیلہ کی طبیعت بگڑنے لگی ہے۔ وہ منہ سے اونچی آواز میں عجیب سے الفاظ ادا کرنے لگی۔ مگر صبور احمد رکنے کی بجائے اور تیزی سے گھومنے لگے اور ان کی آواز اور تیز ہو گئی۔

"رک جاؤ...... رک جاؤ!" اچانک ثمیلہ کی آواز ابھری تو تمام گھر والوں پر دہشت چھا گئی۔ مگر صبور احمد چند منٹ یونہی پڑھتے رہے اور پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے لیکن سب نے دیکھا کہ ثمیلہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

"گھر کا کوئی فرد رہ تو نہیں گیا؟" صبور احمد نے خوفزدہ خدا بخش سے کہا تو وہ اپنے خوف پر قابو پاتا کہنے لگا۔

"گھر میں تو کوئی فرد نہیں ہے جی۔ میرا ایک بیٹا شہر میں ہوتا ہے یا پھر ملازم ہیں جو حویلی کے اندر اور باہر کام میں مصروف ہیں۔" صبور احمد نے ایک سفید کاغذ جیب سے نکال کر اس پر اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے کچھ لکھا تو زارا بی بی کا منہ بن گیا۔ وہ صبور احمد کو جانچ گئی تھی کہ یہ اس کے سسر سے کوئی بہت بڑی رقم اینٹھنے والا ہے۔ مگر وہ بول نہ سکتی تھی۔ خاموش رہنا اس کی مجبوری تھی۔

صبور احمد نے کاغذ تہہ کر کے اس کی نلکی بنائی اور بے ہوش ثمیلہ کے بالوں میں اڑا دی اور احمد سبحانی سے مخاطب ہوئے۔ "مجھ سے شروع کرو اور پورا چکر اس طرح لگاؤ کہ تم چکر کے اندر رہو۔" وہ باقی افراد پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولے۔ "کتنا ہی بڑا طوفان اور کوئی بھی شیطانی دھوکا آنکھوں سے برداشت نہ ہو سکے تو آنکھیں بند کر لینا، چیخنا چلانا بالکل نہیں اور یاد رکھو! کوئی بھی اس دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مارا جائے گا اور احمد سبحانی!" وہ دوبارہ احمد سبحانی سے مخاطب ہوئے تو وہ اپنی جگہ پر مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "اگر تم کسی بھی شیطانی چال کا شکار ہو گئے تو سمجھو کہ ہم سب مارے جائیں گے...... چلو شروع کرو۔"

"میں کوئی سبق بھی پڑھوں یا پھر خالی چکر ہی لگا تا رہوں شاہ جی!" احمد سبحانی کے سوال میں وزن تھا۔ "میں نے تمہیں جو سبق دیا ہے...... اس کے سننے کا وقت آ گیا ہے۔ پڑھتے رہو۔ یہاں تک کہ تمہارے بالوں کا پانی نچڑ کر تمہارے پاؤں کو نہیں بھگو دیتا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں شاہ جی!" اس کی آواز لرزی تو گھر کے باقی مکینوں پر بھی سکتہ طاری ہو گیا تھا جبکہ زارا بی بی اس تمام کام کو محض ایک ڈرامہ قرار دے رہی تھی۔ سبھی اپنی اپنی جگہ پر خوفزدہ ہو کر بیٹھ چکے تو احمد سبحانی نے "الف اللہ...... الف اللہ...... الف اللہ" کا وِرد شروع کر دیا۔ اس نے صبور احمد سے اپنا پہلا چکر شروع کیا اور انہی پر ختم کیا۔ وہ استاد کی ہدایت کے مطابق خود چکر کے اندر ہی تھا۔ پہلے چکر پر کچھ بھی نہ ہوا تو زارا بی بی اپنی زبان پر بمشکل قابو پاتی ہوئی اس ڈرامے کا انجام دیکھنے کے لیے بے زار ہو کر احمد سبحانی کی طرف دیکھنے لگی۔ جو اپنا سبق دہرا رہا تھا۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور سانس پھولنے لگا تھا۔

چوتھے چکر پر ثمیلہ کے بدن میں حرکت ہوئی تو اس نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی دیکھ کر صبور احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

"بڑی دیر کر دی مہربان آتے آتے۔" یک دم ثمیلہ کا قہقہہ بلند ہوا تو تمام افراد لرز گئے۔ زارا جو اس تمام کام کو ڈرامہ سمجھ رہی تھی لرزتی ہوئی عبدالجبار کے ساتھ چمٹ گئی۔

"یہ سوچا ہے کہ واپس کیسے جاؤ گے صبور احمد!" ثمیلہ کی آواز کسی غراتے ہوئے خونخوار مرد کی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے...... میں اس بچی کو یونہی چھوڑ کر چلا جاؤں؟" صبور احمد ثمیلہ سے مخاطب ہوئے تو وہ ان کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "تمہاری جان ابھی بخش دوں گا۔ چلے جاؤ...... ورنہ ان سب کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتاروں گا۔"

"تم اکیلے تو کچھ بھی نہیں کر سکتے...... اپنے خاندان کو بلا لو...... آج دو دو ہاتھ ہو ہی جائیں۔" صبور احمد اس کو تاؤ دلانے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ تڑپتی ہوئی بولی۔

"صبور احمد میرا خاندان ابھی آئے گا اور تم دیکھنا کہ کس طرح اذیت ناک موت تمہارا مقدر بنتی ہے۔" ثمیلہ کے اندر سے وہ قابض بول رہا تھا جس نے کئی ماہ سے ثمیلہ کے بدن پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اس نے اپنے خاندان کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا تھا۔ "احمد سبحانی سنبھل کر...... اب تمہاری باری ہے...... سبق نہیں رکنا چاہیے۔" صبور احمد نے احمد سبحانی کو پکار کر کہا تو سب نے دیکھا کہ یک دم تیز آندھی نے حویلی کو گھیر لیا ہے۔ آندھی گولی کی طرح حویلی کی عمارت



سے ٹکرائی تھی اور اس عمارت کے دروازے اور کھڑکیاں دیواروں سے اکھڑ کر ان کی سمت اُڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ خدا بخش کی بیوی یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جبکہ ان سب کا یہ حال تھا کہ وہ ٹیلی ویژن پر کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ احمد سبحانی بھی خوف سے لرزنے لگا تھا۔ مگر اسے استاد کے الفاظ یاد آنے لگے۔ کہ اگر وہ ہمت ہار بیٹھا تو ان سب کی موت کا ذمہ دار وہ ہو گا۔

اس نے مزید ہمت سے "الف اللہ...... الف اللہ...... الف اللہ......" کا ورد تیز کر دیا اور بھاگ بھاگ کر چکر لگانے لگا۔ اس کے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب اسے اس کام میں روحانی سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ یک دم پیپل کا درخت بھی لرزنے لگا۔ ایک درجن سے زیادہ گھوڑے ان کی طرف سرپٹ بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ عبدالجبار اٹھ کر بھاگنے لگا تو خدا بخش نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے بٹھا لیا۔ صبور احمد نے اس کے اس طرح نیچے بیٹھ جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے ہونٹوں کو متحرک کر لیا۔

آندھی نے اپنی تباہی پھیلا دی تو اس کا زور قدرے کم ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر صحیح سلامت تھی بس آنکھوں کا دھوکا تھا جو چند منٹ جاری رہا تھا۔ حویلی اپنی آن بان کے ساتھ درست حالت میں قائم تھی۔ جبکہ پیپل کے درخت کا ایک پتہ بھی نہ جھڑ سکا تھا۔

صبور احمد اب ثمیلہ سے مخاطب ہوا۔ "وہ تو چلے گئے۔ ہمت ہار کر...... تمہیں بے یارو مددگار چھوڑ کر...... اپنا زور لگا کر...... اب کسی اور کو بلا لو۔"

"تم نے جو دیوار اس دائرے کے گرد بنا دی ہے اس نے میرے خاندان کو اندر نہیں آنے دیا۔" ثمیلہ کی آواز میں اب وہ پہلے جیسی غراہٹ نہ تھی۔ "میں پھر بھی تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں صبور احمد...... کہ ابھی چلے جاؤ...... تم مجھے جانتے نہیں ہو۔"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو؟ اور اس بچی کو کیوں تنگ کرتے ہو؟"

"میں تمہارا مرید شاگرد نہیں ہوں کہ تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔" ثمیلہ خاموش ہو گئی تو صبور احمد قہقہے لگاتے ہوئے بولے۔ "تمہاری مرضی...... جل کر مرو...... میں تو چاہتا تھا کہ تم راہِ راست پر آنے کا وعدہ کرو گے تو تمہیں چھوڑ دوں گا۔" صبور احمد نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور ثمیلہ کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے ان کی پھونک ثمیلہ کے سر میں لگے کاغذ پر پڑی تو اس میں آگ لگ گئی۔ صبور احمد نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ بظاہر اس آگ کا لمس اتنا تھا

کہ جتنا موم بتی کا ہوتا ہے مگر ثمیلہ کا وجود اس طرح تڑپنے لگا کہ گویا کوئی اس کی شاہ رگ کاٹ رہا ہو۔

اس کے ہاتھ اپنے سر تک بلند نہ ہو پا رہے تھے۔ وہ اونچی اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہ چیخنے چلانے لگی۔ ''صبور احمد! اس آگ کو بجھاؤ...... میں جل جاؤں گا...... صبور احمد...... بند کرو اس آگ کو۔''

''تم تو کہتے تھے کہ میں تمہارا پابند نہیں ہوں...... تو جن صاحب! میں بھی تمہارے حکم کا پابند نہیں ہوں۔'' صبور احمد بھی خاموش ہو گئے تھے۔ انہوں نے احمد سبحانی پر نظر ڈالی تو مسکرا کر بولے۔ ''بس کرو ہونہار شاگرد! تم کامیاب ہو۔'' احمد سبحانی لڑکھڑا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کا سینہ پھول اور پچک رہا تھا۔ اس کو یوں لگتا تھا کہ وہ کئی میل دوڑتا ہوا آیا ہو۔

''میں بتاتا ہوں صبور احمد! تمہیں تمہارے اجداد کا واسطہ!'' ثمیلہ چیختے ہوئے بولی۔ تو صبور احمد خاموش رہے۔ ''اس آگ کو بند کرو صبور احمد! تمہیں تمہارے اللہ کا واسطہ!''

''جب اس کے وجود پر قبضہ جمایا تھا تب نہیں پتہ تھا کہ یہ مسلمان ہے اور اللہ کو مانتی ہے۔ اب اس اللہ کا واسطہ کیوں دے رہے ہو...... جسے تم مانتے ہی نہیں ہو؟'' صبور احمد کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

''اس نے میرے منہ پر تھوکا تھا اور تھپڑ بھی مارا تھا...... میں اپنا انتقام لینے کے لیے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون حرام کر رہا تھا۔'' وہ چیختی ہوئی بولی تھی۔ ''یہ آگ مجھے جھلسا رہی ہے۔ اسے بند کرلو!''

''اس نے تمہیں تھپڑ کیوں مارا تھا؟'' صبور احمد نے اس کی التجا رد کرتے ہوئے اپنا سوال دہرا دیا۔

''یہ کالج جا رہی تھی۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ یہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے انسانوں کے روپ میں ایک نوجوان کا روپ دھارتے ہوئے اس سے اپنی پسند کا اظہار کیا تو اس نے میرے منہ پر تھوکتے ہوئے ایک تھپڑ بھی دے مارا۔'' وہ جلدی جلدی میں چیختا ہوا کہہ رہا تھا۔ کوئی نادیدہ طاقت اس کے وجود کو بھسم کر رہی تھی۔ ''تو پھر غلطی تمہاری ہوئی نا؟'' صبور احمد نے کہا تو وہ رونے لگا۔

''ہاں! ہاں...... مجھے اس آگ سے بچا لو...... میرا وجود پگھل رہا ہے۔''

''مگر تم تو بنے ہی آگ سے ہو۔ تم کس طرح آگ میں جل سکتے ہو؟'' صبور احمد بھی



کچھ دیر مزید اسے جلانا چاہتے تھے۔ ''تم بھی تو مٹی سے بنے ہوئے انسان ہو...... پھر مٹی کی اینٹ سے تمہیں چوٹ کیوں لگتی ہے؟'' اس کی دلیل وزنی تھی۔ ''میرے ہاتھ جل گئے ہیں...... آگ اب میرے منہ کی طرف بڑھ رہی ہے...... میں اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دیتا ہوں...... مجھے جانے دو صبور احمد!'' وہ ثمیلہ کا وجود چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

''میں تمہارا کیسے اعتبار کرلوں...... میں تمہیں زندہ نہیں جانے دوں گا۔'' صبور احمد کی بات سن کر وہ آگ بگولہ ہوتا ہوا بولا۔ ''میں اس کو ختم کر دوں گا...... میں اپنے ساتھ اس کا وجود بھی جلا دوں گا...... میں اسے بھی مار دوں گا...... اور اس کے قاتل تم ہو گے صبور احمد!''

''تو پھر ٹھیک ہے...... تم مجھ پر مقدمہ قتل کا پرچہ درج کرواؤ...... میں اپنا کام کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر صبور احمد نے ایک اور پھونک اس کاغذ پر پھونکی تو آگ مزید تیز ہو گئی۔ ثمیلہ کی بے چینی اور بے قراری بڑھ گئی تھی۔ وہ زمین پر لوٹنیاں کھانے لگی...... وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی ہوئی گھٹن زدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔

''صبور احمد! بے شک تمہارا پروردگار...... اپنے محبوب ﷺ اور آپ ﷺ کی آل سے بہت محبت کرتا ہے...... میں تھک گیا ہوں۔ میں جھلس گیا ہوں...... مجھے راکھ بننے کے لیے آزاد کر دو۔'' اس کی التجائیں سن کر گھر کے باقی افراد بھی آزردہ ہو گئے تھے...... ''تم گیٹ پر اپنی راکھ پھینک سکتے ہو...... جاؤ!'' صبور احمد نے یہ کہہ کر کاغذ پر لگی ہوئی آگ کو پھونک ماری تو ثمیلہ کا وجود جھٹکے لینے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی روح قبض ہو رہی ہے۔ زارا بی بی اپنی بیٹی کی حالتِ زار پر کافی افسردہ تھی۔

''دیکھو! گیٹ کی طرف۔'' صبور احمد کی آواز پر ان سب کی نظریں گیٹ کی جانب اٹھ گئیں تو حیرت سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کیونکہ گیٹ پر یک دم اتنی راکھ جمع ہو گئی تھی جیسے کسی گدھے سے مٹی اتاری گئی ہو۔ وہ حیرانگی سے صبور احمد کی طرف دیکھنے لگے جواب سجدہ میں گرے ہوئے تھے۔ ان کا وجود ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عاجزی سے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر کے شکرانے کا سجدہ ادا کر رہے تھے۔

احمد سبحانی کی آنکھیں بھی متورم ہو گئی تھیں۔ گھر کے سبھی افراد ثمیلہ کے گرد جمع تھے۔ وہ اسے ہوش میں آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ صبور احمد نے سجدہ سے سر اٹھایا اور اٹھ کر نم آنکھوں سے احمد سبحانی کو گلے لگا لیا۔ وہ اس کا منہ چوم رہے تھے اور احمد سبحانی حیرانگی سے مرشد و استاد کی طرف سے پیار و محبت کی اسناد وصول کر رہا تھا۔

''تم لوگ اب دائرے سے باہر جاسکتے ہو...... ہم یہیں رہیں گے صرف چند منٹوں کے لیے۔'' صبور احمد نے خدا بخش سے کہا تو وہ بھی جیسے ہوش میں آ گئے وہ ثمیلہ کو اٹھا کر اندر کی جانب بڑھ گئے۔

''تم نے بہت بڑا معرکہ بخوبی سر کرلیا ہے احمد سجانی!'' استاد کے یہ حوصلہ افزا الفاظ اس کے لیے سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ''اگر تم ذرا سا بھی چوک جاتے تو جانتے ہو وہ جنات کا گروہ ہم سب کی گردنیں منٹوں میں توڑ دیتا۔''

''جنات کا گروہ؟'' احمد سجانی حیرانگی سے بولا تو صبور احمد مسکرانے لگے۔

''وہ آندھی اور طوفان جنات کے گروہ کا عارضی طور پر پیدا کردہ تھا وہ تم کو خوفزدہ کر کے کسی طرح دائرے سے باہر لانا چاہتے تھے۔ اگر تم بھول کر جاتے تو سب ختم ہو چکا ہوتا۔''

''ختم تو اب بھی ہو گیا ہے شاہ جی!'' احمد سجانی نے سوال کیا تو صبور احمد کی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ ''وہ کریم ہے کرم کرنے والا۔ وہ رحیم ہے رحم کرنے والا۔ میں تو اس کا عاجز بندہ ہوں...... کیا خیال ہے...... اب شہر کو واپسی ہونی چاہیے یا ابھی گاؤں کی سیر کرنا ہے۔'' ان کا انداز دوستانہ دیکھ کر احمد سجانی بھی شوخ انداز میں بولا۔

''آپ استاد ہیں۔ جیسا حکم دیں گے ویسا ہی ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں ایک بار پھر خیراں سے مل لیتے ہیں۔'' صبور احمد اس کی بات سن کر ہنسنے لگے۔ اسی اثناء میں انہوں نے خدا بخش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

''شاہ جی! کھانا تیار ہے۔ آیئے کھانا کھالیں۔'' وہ پاس آ کر عاجزی سے بولا۔

''خدا بخش! ہم نے بابو کوچوان کے گھر سے ناشتہ کرلیا تھا۔ ہمیں طلب نہیں ہے۔'' صبور احمد بولے۔

''اس نکمے کے گھر سے بھی دو نوالے لے لیں تو مہربانی ہوگی شاہ جی! ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کے صدقہ سے ہماری بلائیں دور کر دی ہیں...... میں آپ کو ایسے ہی نہیں جانے دوں گا۔'' صبور احمد اس کے خلوص سے متاثر ہو گئے اور چوہدری خدا بخش کے پیچھے چل پڑے۔

اس بار انہیں ایک دوسرے کمرہ میں بٹھایا گیا تھا۔ یہ کمرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے شہروں میں ڈرائنگ روم ہوتے ہیں۔ چوہدری خدا بخش ان کو اپنی شان دکھانا چاہتا تھا یا پھر ان کی سوچ ہوگی کہ پہلا کمرہ اس کے مرشد کے شایانِ شان نہیں ہے۔



احمد سجانی ایک ایک چیز کو بڑے تجسس سے دیکھ رہا تھا۔ چوہدری خدا بخش نے واقعی کافی اچھی اور قیمتی اشیاء بیٹھک میں سجا رکھی تھیں۔ ایک دیوار پر چوہدری خدا بخش کی بڑی سی فوٹو لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں طرف اس کا بڑا بیٹا جبار اور بائیں طرف ایک اور نوجوان کھڑا تھا۔ جس کے چہرے پر غصہ اور رعونت فوٹو میں بھی نظر آ رہا تھا۔

خدا بخش اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک سٹیل کی ٹرے تھی جس میں سالن اور روٹیاں تھیں۔ وہ میز پر رکھ کر باہر چلا گیا۔ تو احمد سجانی صبور احمد سے پوچھنے لگا۔

''میرا خیال ہے شاہ جی! کہ یہ چوہدری خدا بخش کا دوسرا بیٹا جبران ہوگا جو شہر میں ہے۔'' احمد سجانی نہ جانے کیوں اس کی تصویر میں کھویا ہوا تھا۔ ''خدا بخش سے پوچھ لیتے ہیں۔'' صبور احمد کا جواب سن کر وہ خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

خدا بخش پلیٹیں اور پانی وغیرہ لے کر اندر آیا تو کھانا شروع ہو گیا۔ وہ گلاس میں پانی ختم ہونے پر اور گلاس بھر دیتا تھا۔ دیسی مرغ کو بہت سلیقے سے پکایا گیا تھا۔ سالن کافی مزیدار تھا۔ وہ پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد اٹھے اور خدا بخش سے اجازت چاہی۔ وہ اس بات کی ضد کر رہا تھا کہ صبور احمد ایک رات تو کم از کم اس کے غریب خانے پر گزاریں مگر صبور احمد نے بتایا کہ اس کی ڈیوٹی سخت ہوتی ہے اور پھر آدھے گھنٹے تک گاڑی کا بھی وقت ہو جائے گا۔

''خدا بخش! یہ تو چوہدری عبدالجبار ہے اور یہ دوسرا کون نوجوان ہے؟'' صبور احمد نے احمد سجانی کے دل کا چور باہر نکالا تو وہ ہنستا ہوا بولا۔ ''شاہ جی! یہ میرا دوسرا بیٹا جبران ہے۔ شہر میں یہ ہی رہتا ہے۔ کبھی کبھی گاؤں آ جاتا ہے۔ اس نکمے کو آپ کے دولت خانے پر بھیجوں گا جی!''

وہ باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے تو عبدالجبار اور اس کی بیوی زارا ہاتھ باندھ کر احترام میں کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے ثمیلہ بھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ نما تھی۔

''میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں شاہ جی!'' زارا آگے بڑھتی ہوئی بولی تو عبدالجبار بھی آگے بڑھ گیا۔ ''ہمیں معاف کردیں شاہ جی! ہم سے غلطی ہو گئی۔'' صبور احمد نے ان دونوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے۔ ''آنکھ بہت بڑا دھوکا ہے۔ یہ پہلی نظر میں ہی دل کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اس کے کاری وار سے بچنا چاہیے۔'' وہ پھر ثمیلہ کی سمت بڑھے تو وہ سر پر سرخ دوپٹے کا آنچل درست کرتی ہوئی نظریں جھکا کر آگے بڑھ آئی۔ ''اب

جی لگا کر پڑھنا۔'' انہوں نے ثمیلہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ''اور کوئی بھی تنگ کرے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں...... تھپڑ...... مار دینا۔'' سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے تو احمد سبحانی نے گلاب جیسے ہونٹ کھلتے ہوئے دیکھے تو آہ بھر کر رہ گیا۔ مگر اس کی ڈکشنری میں اب دنیاوی عشق کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس نے فوراً ''**لا حول ولا قوۃ**'' پڑھ کر نظریں جھکا لیں۔

''شاہ جی! ملازم آپ کو چھوڑ آئے گا۔ آپ نے منع کیوں کر دیا۔'' صبور احمد نے گیٹ کی جانب اشارہ کیا۔ بابو کوچوان بلبل کے بدن پر ہاتھ پھیر کر اس کو مرشد کی سواری کے لیے تیار کر رہا تھا۔

انہوں نے اللہ حافظ کہا اور باہر نکل آئے۔ خدا بخش اور دوسرے افراد ان کو تانگے میں بیٹھ کر جاتا دیکھ رہے تھے اور منہ سے ''اللہ حافظ'' کی دعائیں بلند ہو رہی تھیں۔

☆=======☆=======☆

شین کی پرواز میں تیزی اور گرم جوشی تھی وہ عثمانِ غنی کے آزاد ہو جانے کے بعد وہاں سے نکلا اور مسلسل پرواز میں تھا۔ اس نے موسم کی سختیاں اپنے ننھے سے وجود پر سہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ عثمانِ غنی کے واقعات سے بہت متاثر ہوا تھا اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اسے آقائے دو جہاں کا عاشق تسلیم کر کے عثمان غنی کو رہائی دے دی گئی تھی۔

وہ پُر امن شہر کی جانب پرواز کرتا ہوا گھر والوں کو یاد کر رہا تھا۔ اس کی پیاری ماں کتنی خوش ہوگی جب میں اپنی منزل پر پہنچوں گا۔ میرے باپ کا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔ وہ جگو دادا کے سامنے سر اونچا کر کے برادری میں گھوما پھرے گا۔ ''میں تاجدارِ انبیاء سے اپنے وطن کی سلامتی کے لیے رب تعالیٰ کے حضور دعا کرواؤں گا۔'' یہ اس کی سوچ تھی۔

بہار کی آمد والا موسم اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ کبھی کہیں تھکن محسوس کرتا تو کچھ دیر ستا لیتا اور پھر اُڑنے لگتا۔ رات بسر کرنے کے لیے وہ پُر سکون جگہ دیکھ کر رات بسر کرتا اور کھیتوں کھلیانوں سے اپنی چونچ کو تر رکھنے کے لیے چند لمحے زمین پر اترتا اور پھر اپنی پرواز جاری رکھتا ہوا۔ ملکوں کی سرحدیں عبور کرتا ہوا شہرِ امن کی جانب رواں دواں تھا۔

اس نے شام کے وقت تھکن محسوس کرتے ہوئے خود کو ایک بڑے سے گھنے درخت پر روک لیا۔ وہ درخت کی بلند شاخوں سے ہوتا ہوا کچھ نیچے اتر آیا تھا وہ کوئی پھل دار درخت نہ تھا۔ مگر اس کی شاخیں اتنی گھنی تھیں کہ وہ ان میں ہر قسم کی آندھی اور طوفان سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس نے درخت پر اپنے پاؤں لگائے تو اسے محسوس ہوا کہ درخت نے ایک جھرجھری لی



ہے۔ مگر شین اسے اپنا وہم سمجھا اور سفر کی تھکان سمجھ کر نظر انداز کرتا ہوا اپنی آنکھیں بند کر کے دل و دماغ کو سکون پہنچانے لگا۔

چند لمحات پُر سکون انداز میں گزرے تو اسے یک دم ایک پھنکار سنائی دی۔ اس نے ڈر کر آنکھیں کھول دیں۔ مگر گول گول آنکھوں سے ارد گرد دیکھنے کے باوجود بھی کچھ نظر نہ آیا تو وہ خوف سے لرزتا ہوا خود پر ہی ہنسنے لگا۔ لگتا ہے کہ کافی تھکان ہوگئی ہے۔ اس نے دور مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی جانب دیکھا۔ ابھی تقریباً ایک گھنٹہ پڑا تھا۔ اس نے ستانے کے لیے ایک قدرے چوڑی ٹہنی کا انتخاب کیا اور آنکھیں بند کرتا ہوا بولا۔ ''میرے مالک و معبود! میں تیرے حوالے۔ مجھے شیطان کے شر سے محفوظ فرما کر اپنی پناہ میں رکھنا۔'' اس نے چند لمحات ہی رب واحد کی ثنا خوانی میں گزارے ہوں گے کہ اس بار زبردست پھنکار نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور چودہ طبق بھی روشن کر دیئے۔

کیونکہ وہ اپنے سامنے پھن پھیلائے ایک سنہری رنگ کے سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے وجود پر سیاہ رنگ کی ڈبیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ شین کو دیکھ کر پھنکار رہا تھا۔ شین نے اپنے ارد گرد دیکھا تو مزید دہل گیا۔ کیونکہ سانپ نے اسے اپنے لمبے وجود کی بنا پر گھیر لیا تھا۔ بس اس کے وجود کو اپنی کنڈلی میں کسنے کی کسر رہ گئی تھی۔ اس کی روح سانپ کو دیکھ کر فنا ہوگئی تھی۔ وہ ہونٹوں پر (چونچ) پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

''کک...... کیسے ہو...... سانپ بھائی!'' سانپ اس کی بات سن کر پھنکارا۔

''چار دنوں کے بھوکے سے پوچھتے ہو کہ کیسا ہوں؟ تمہیں کھا کر اپنی بھوک مٹاؤں گا تو پھر موٹا تازہ ہو جاؤں گا۔'' شین اس کی بات سن کر کانپتے ہوئے بولا۔

''بھلا میں تمہاری بھوک کیسے مٹا سکتا ہوں۔ میں تو ننھا سا پرندہ ہوں۔''

''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی بہت ہوتا ہے۔'' سانپ بولا تو شین کی ہمت بڑھی۔

''مگر میں تو پردیسی ہوں...... کیا تم مہمانوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہو؟''

''یہ جبلتیں اور خصلتیں انسانوں میں ہوتی ہیں۔ درندوں اور جانوروں میں اتنی تمیز ہوتی تو وہ انسانوں کو اپنی مہمان نوازی سے حیران کر دیتے۔'' سانپ بولا تو شین ادھر اُدھر مدد کے لیے کسی کو دیکھنے لگا۔ مگر دور دور تک پھیلا ہوا جنگل آج اس کی موت پر پیشگی ہی سوگوار ہو گیا تھا۔

''مجھے کھا کر کتنی دیر تک زندہ رہ سکتے ہو۔'' وہ حوصلہ کر کے بولا۔

"چند دن!" سانپ کا مختصر جواب سن کر وہ ہنسنے لگا۔ یہ ہنسی اس کے اندر سے نہیں بلکہ اوپری سی ہنسی تھی جو صرف چونچ سے ہی نکلی تھی۔ "صرف چند دنوں کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہو تو کیوں مہمان نوازی پر لات مار رہے ہو۔ اپنی نسل کو بھی بدنام کرواؤ گے کہ تم نے ایک مہمان کو ہڑپ کیا تھا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم انسان کی صحبت میں رہے ہو۔" سانپ پھنکارا۔

"ہاں! مجھے شرف حاصل رہا ہے کہ میں انسان کی صحبت میں رہا ہوں۔ بلکہ ان انسانوں کے ساتھ جو کائنات کے اعلیٰ انسان ہیں۔" شین نے اسے اپنی باتوں میں الجھا لیا تھا۔

"کائنات کے اعلیٰ انسان؟" وہ حیرت سے پھنکارا۔ "تمام انسان ہی اشرف المخلوقات ہیں۔ پھر ان میں اعلیٰ اور ادنیٰ کون ہوا؟" اس کی حیرانگی بجا تھی۔

"بے شک تمام انسان اشرف المخلوقات ہیں۔ مگر انسانوں کے بھی رب کریم نے درجات بنائے ہوئے ہیں۔"

"مثلاً" وہ اب شین کی باتوں میں دلچسپی لیتا ہوا اپنی پھنکار بھول گیا تھا۔ دور افق پر سورج غروب ہونے کو تھا۔ وہ اب سنہری تھال کی شکل میں چند منٹوں کا مہمان رہ گیا تھا۔

"مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات دوسرے انسانوں تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ جن انسانوں کو چنتا ہے وہ اس کے دوست ہوتے ہیں اور جو اللہ کے ولی یعنی دوست ہوتے ہیں وہ اعلیٰ انسان ہوتے ہیں۔"

"مگر یہ پیمانہ کس کے پاس ہوتا ہے کہ یہی اعلیٰ انسان ہے؟" سانپ کا سوال بڑا گہرا تھا۔ مگر شین نے بھی اپنا وقت صبور احمد کی صحبت میں گزارا تھا۔

"نبی آخر الزمان محمد عربی و عجمی ﷺ کی ذاتِ اقدس کے بعد کوئی نبی نہیں آیا اور نہ ہی آئے گا۔ آپ ﷺ کی آل اور پھر آپ ﷺ کی ذات سے محبت کرنے والے ہی اللہ کے محبوب ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی قوم، ذات اور رنگ و نسل کے ہی کیوں نہ ہوں...... اللہ تعالیٰ ان کی عبادت اور اپنے محبوب ﷺ کی محبت سے ان کے درجات کو پرکھتا ہے اور پھر ان کے ذمہ کام لگاتا ہے۔ وہ اعلیٰ انسان ہوتے ہیں جو اللہ کے احکامات کی بجا آوری میں دنیا کو تیاگ دیتے ہیں۔"

"تم کن اعلیٰ انسانوں کی صحبت میں رہے ہو؟" وہ بل کھاتا ہوا بولا۔ "اور تمہیں اتنی معلومات کیسے ہیں؟" سانپ کے سوالات نے شین کو حوصلہ بخشا تھا کہ وہ اب اس کو قائل کر



لے گا اور بحفاظت رات یہاں بسر کر سکے گا۔ "میں اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ کی اولاد کی صحبت میں رہا ہوں اور میں آپ ﷺ کا غلام ہوں۔" سانپ یہ سن کر تھر تھر کانپنے لگا۔

شین کے لیے اس کا یہ انداز قابلِ غور تھا وہ حیرانگی سے سانپ کو دیکھ رہا تھا جس کے بدن پر پسینے کے قطرے واضح نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ بھی نہ بولا تھا۔ اس نے اپنا پھن جھکا لیا اور دور سے بولا۔

"تم اللہ کے محبوب ﷺ کے غلام ہو۔" اس نے پھن اوپر اٹھایا اور پھر بولا۔ "یہی کہا نا تم نے؟" وہ شین کی بات کی تصدیق چاہتا تھا۔ "ہاں! مجھے فخر ہے کہ میں نے آقائے دو جہاں کی آل کے گھرانے سے مدینہ کی جانب سفر شروع کیا ہے۔ اب اگر مجھے موت بھی آ جائے تو کوئی غم نہیں ہوگا۔" شین نے موت کا لفظ اس لیے ادا کیا تھا کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا اب بھی سانپ اسے کھانے پر آمادہ ہے یا پھر کوئی اور ہی پلاننگ کر رہا ہے۔ اگر اس کی کوئی اور پلاننگ ہے تو پھر اسے مزید الجھا کر یہاں سے نکلا جا سکتا ہے۔

"نہیں! نہیں! میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا...... تم رسول ﷺ کے مہمان ہو۔ ان کے غلام ہو۔ ان کے شہر کے مسافر ہو...... مجھے معاف کر دو شاید میں اپنے اجداد کی غلطیوں کی اسی طرح تلافی کر سکوں۔" سانپ نے کہا تو شین نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"اجداد کی غلطی! میں سمجھا نہیں۔" اس کا پھن اب جھک گیا تھا۔ اس کی پھنکاریں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ بالکل مرا ہوا لگ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں اس لمحہ آنسو صرف شین ہی محسوس کر سکتا تھا۔ کیونکہ سورج مکمل غروب ہو چکا تھا۔ ہر چیز نے اندھیرے کی چادر اوڑھنا شروع کر دی تھی۔

"مجھے اپنے بڑوں سے سنا ہوا غار ثور کا وہ واقعہ نہیں بھولتا جب سرکار مدینہ ﷺ نے اس غار میں اپنے دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پناہ لی تھی تو سارے سوراخ بند کرنے کے باوجود بھی جو ایک سوراخ رہ گیا تھا اس پر جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پاؤں کی ایڑھی رکھ دی تھی۔ مگر سرکارِ دو عالم کی مدت سے آمد کا منتظر میرے خاندان کا سانپ جب سرکار ﷺ کے دیدار سے محروم رہا تو اس نے غصہ میں آ کر سرکار ﷺ کے یار کی ایڑھی پر ڈس لیا تھا...... بس میرا خاندان اور میری نسل تب سے اس بدنامی کے داغ کو لے کر جی رہی ہے...... مجھے تم معاف کر دینا...... میں دوسری غلطی کر کے

اپنی آنے والی نسلوں کو بدنام نہیں کرانا چاہتا...... مجھے معاف کر دینا......اور بخیریت مدینہ پہنچ کر سرکار ﷺ مدینہ کے حضور میرا عاجزانہ سلام کہہ دینا...... مجھے معاف کر دینا۔'' یہ کہہ کر وہ رینگتا ہوا درخت سے نیچے کی جانب چل پڑا۔ شین کو صبور احمد کی بات یاد آنے لگی کہ راہِ عشق پر چلو گے تو تمہیں بہت سے ایسے عاشق ملیں گے جو اپنے عشق کا اظہار کسی سے بھی نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی ان کی زبان سمجھتا ہے۔ یہ سانپ بھی سرکارِ مدینہ کے غلام کا حیاء کرتا ہوا واپس چلا گیا تھا اس کائنات کو تخلیق کرنے والا خود اپنے محبوب ﷺ کا ثناخوان ہے اور قرآن میں ویسا ہی حکم سب ایمان والوں کو دیا ہے کہ تم بھی آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجو، بے شک کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اور محبوبِ خدا کی شان میں قصیدے بیان کرتا ہے۔

شین نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا تھا۔ وہ پُرسکون انداز میں اللہ تعالیٰ کے واحد معبود ہونے اور محمد ﷺ کو ان کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ اس نے اللہ ھو اللہ ھو اور پھر درود و سلام کے نذرانے پیش کرنا شروع کر دیئے تو اسے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ درخت نے جھرجھری لی ہے۔

''السلام علیکم! مدینہ کے مسافر!'' بڑے سے درخت کی آواز گونجی تو شین حیرانگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ''تم مجھ پر تشریف فرما ہو۔'' شین کی حیرانگی دیکھتا ہوا درخت بولا۔ تو شین نے خوش ہو کر اس کی ٹہنی پر اپنی چونچ رگڑی اور سلام کا جواب دیا۔

''میں خوش قسمت ہوں کہ آج پہلی بار مجھ پر کوئی مدینہ کا مسافر ٹھہرا ہے۔'' درخت بولا تو شین ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''خوش قسمت تو میں ہوں کہ میں راہِ مدینہ کا مسافر بنا ہوں تو مجھ پر تقدیر کے راز کھل رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سانپ، درخت اور دیگر اشیاء بھی غلام مصطفیٰ ﷺ ہیں۔''

''میں بہت بدنصیب ہوں میرے دوست!'' درخت کی آہ ابھری۔ ''سینکڑوں سالوں سے یہاں صدمۂ ہجر سے جل رہا ہوں...... میرے دوست کوئی مجھے اکھاڑ کر ایک بار پھر سے وہی ننھا سا پودا بنا دے جو مدینہ کے ایک باغ میں کھلا تھا...... مجھے میرا بچپن پھر سے لوٹا دیا جائے...... میں ایک بار پھر مدینہ کی فضا اور کعبہ کی ہوا محسوس کر کے جھومنا چاہتا ہوں۔ کاش کوئی مجھے مدینہ لے جائے۔ کاش......'' درخت کی ہچکیاں بلند ہو گئیں۔ شین کی آنکھ بھر آئی تھی۔ وہ درخت کو کن الفاظ میں کس طرح دلاسہ دے اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔



''میں تمہارا صدمہ سمجھتا ہوں میرے دوست!'' شین بھی دلجوئی والے انداز میں بولا مگر درخت نے صاف محسوس کیا کہ اس کی آواز بھرا گئی ہے۔ ''میں بے بس اور مجبور پرندہ ہوں۔ میرے پروں میں تو اتنی سکت نہیں کہ کالے منہ والی آندھی کا مقابلہ کر سکوں۔'' رات کی گہرائی نے ہر چیز اندھیرے میں گم کر دی تھی۔ اب جنگل میں درندوں اور کیڑے مکوڑوں کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ منو (شین) چونکہ پرندہ تھا وہ ان آوازوں سے خوفزدہ نہ تھا۔ بلکہ اسے محفوظ پناہ گاہ مل گئی تھی اور وہ بھی درخت تھا جو عاشقِ مدینہ تھا۔ ''میں تمہاری مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔'' درخت بولا۔ ''مگر مجھے خوشی ہے کہ تم شہرِ امن کی جانب سفر کر رہے ہو اور تمہارا بسیرا مجھ پر ہے۔ میں جان وار کر بھی تمہاری خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''مگر تم شہرِ مدینہ سے یہاں تک کیسے آ گئے؟'' شین نے سوال کیا تو درخت ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔ ''میں اپنے خاندان کے ساتھ کھلا تو ایک باغبان کو بھا گیا۔ اس نے اور بھی پودے خریدے اور مجھے لے کر پیدل ہی اپنے ملک کی جانب چل پڑا۔ اس کے ساتھ اونٹ پر اس کا مختصر سا سامان تھا جس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ میں مدینہ شریف اور اپنے خاندان کی جدائی میں نیم مردہ ہو گیا تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے مجھے ساتھ لے جانے کی بجائے اسی جگہ پر لگا دیا۔ جس زمین کو کھودا گیا تھا وہ آج میری ماں کا کام دے رہی ہے۔ میں اپنی جڑیں اس ماں کی گود میں پھیلاتا گیا اور یہ سمیٹتی گئی۔ مگر میں اس مہربان ماں کی محبت کے باوجود بھی آج سے قبل بیت جانے والے سو سال کے اس لمحے کو نہیں بھولا ہوں جب مجھے مدینہ شریف کی سرزمین سے جدا کیا گیا تھا۔'' وہ رونے لگا تھا۔ شین نے بھی بہتر جانا کہ وہ اپنا سانس درست کر لے اور پُرسکون ہو کر اپنی داستان کہہ سکے۔

''میری یہ مہربان زمین مجھے طرح طرح کی کہانیاں سناتی ہے۔ میرا جی بہلاتی ہے۔ مجھے توانا اور طاقتور بننے میں مدد دیتی ہے مگر میں ایک کہانی کو نہیں بھول سکا۔'' وہ خاموش ہوا تو شین بول پڑا۔

''کون سی کہانی؟'' وہ نادم و شرمندہ ہوتا ہوا بولا۔

''میں جاہل ہوں الفاظ کا صحیح چناؤ نہیں کر سکتا۔ دراصل آقائے دو جہاں ﷺ کے اس معجزے کو کبھی بھی نہیں بھلا سکتا جب آپ سرکار نے ایک یہودی کے کہنے پر اسی یہودی کی زبانی درخت کو پیغام بھجوایا تھا کہ تمہیں کالی کملی والے بلا رہے ہیں۔ تو وہ درخت اپنی جڑوں سمیت زمین کو چیرتا ہوا آگے پیچھے ہلتا ہوا سرکار کے قدموں میں آ گرا تھا۔ یہ سرکارِ دو عالم کا وہ

معجزہ تھا جسے میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ میں بھی ویسے ہی ایک پیغام کا منتظر ہوں میں بھی مدینہ کی فضا کا طلبگار ہوں...... مگر میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔" اس کا رونا ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا شین اس کو دلاسہ دیتا ہوا بولا۔

"میں اپنے ناتواں پروں کے ساتھ اس عزم کو لے کر نکلا ہوں کہ میں شہر امن تک ضرور پہنچوں گا اور ان شاء اللہ ضرور پہنچوں گا۔ تمہارا دکھڑا اور سلام آقائے مدینہ کے حضور ضرور گوش گزاروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے دوست۔" اگر کوئی یہ الفاظ پڑھ کر اس بات یا تمام باتوں کو بے معنی اور غلط تصور کرے تو وہ آقائے دو جہاں ﷺ کے ان معجزات کا بھی مطالعہ کرے جن میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کے فضل و کرم سے وہ سب کچھ کر دکھایا جس میں اللہ کی خوشنودی اور رضا شامل تھی۔

درخت اور شین باتوں میں مصروف تھے کہ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کا احساس دونوں کو ہوا۔

"بہت نامراد ہے یہ...... کمبخت سے دیکھا نہیں جاتا۔" درخت بولا تو شین حیرت سے پوچھنے لگا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"کالی آندھی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ آ رہی ہے۔" درخت نے جواب دیا۔ "تم دو شاخیں نیچے اتر آؤ۔ آج سے کچھ سال پہلے ایک بلبل نے اس گھونسلہ میں پناہ لی تھی اور یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ مگر یہ سنہری سانپ اسے اور اس کے بچوں کو کھا گیا۔ تم اس گھونسلے میں چھپ جاؤ۔ میں اس کا مقابلہ کرتا ہوں۔" درخت کی بات سن کر شین دو شاخیں نیچے اترا تو ایک بہترین گھونسلہ تیار تھا۔ جو ہر طرح کی آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ شین نے اس میں پناہ لی اور حیران رہ گیا کہ درخت کو کیسے معلوم ہوا کہ آندھی آنے والی ہے۔

وہی ہوا چند منٹ ہی گزرے تھے کہ آندھی نے اس علاقہ کو اپنے مکروہ گھیرے میں لے لیا۔ وہ درخت کے ارد گرد چکر لگا رہی تھی۔ جیسے کوئی پولیس والا کسی مشکوک شخص کو دیکھ کر گھرکیاں ڈالنے لگتا ہے۔ وہی حال اس وقت کالی آندھی کا تھا۔

"بتاؤ وہ کہاں ہے؟" وہ درخت سے پوچھنے لگی۔ اس کا انداز تحکمانہ تھا اور یہ رویہ غالباً درخت کو بھی پسند نہ آیا تھا۔ تبھی تو وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔ "میرے سینے میں دفن ہے۔ اگر نکال سکتی ہو تو نکال لو۔"



"تم میری طاقت سے اچھی طرح واقف ہو۔" آندھی چیختی چنگھاڑتی درخت کو ہراساں کر رہی تھی۔ "اور تم میری ضد سے اچھی طرح واقفیت رکھتی ہو۔"

"میں تمہارے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتی۔" آندھی کا انداز صلح جو تھا مگر اس کی چنگھاڑ بتاتی تھی کہ وہ اپنی نیت میں کھوٹ رکھتی ہے۔ "وہ میرا دشمن ہے۔"

"ایک مسافر تمہارا دشمن کیسے ہو گیا۔ حالانکہ تم اس مسافر کے حالات بگاڑنے میں طاقت رکھتی ہو۔"

"وہ مدینے کا مسافر ہے۔ وہ باد صباء کا مہمان ہے۔ وہ سبز گنبد کے مکین ﷺ کا عاشق ہے اور یہی میرا اس سے جھگڑا ہے۔" وہ جنگاڑ کر کمزور اور ناتواں درختوں پر اپنا غبار نکال رہی تھی۔

"اب تو اس کی حفاظت میری ذمہ داری ہی نہیں بلکہ فرض بھی ہے۔" درخت پُرخلوص لہجے میں بولا تو آندھی کا غصہ دیدنی تھا۔ وہ بگولے کی صورت میں زور سے درخت سے ٹکرائی تو شین گھونسلے میں بیٹھا لرز گیا۔ مگر وہ درخت کی چند کمزور شاخوں کو ہی نقصان پہنچا سکی۔

"اب بھی مان جاؤ۔ وہ چلا جائے گا مگر میرا اور تمہارا ساتھ بہت پرانا ہے اور مستقبل میں بھی چلے گا۔"

"مگر میرا جس مٹی سے رشتہ ہے۔ وہ اس مٹی کو چومنے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس راہ کا مسافر بنا ہے...... چپ چاپ لوٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے سامنے کوئی سرکش پہاڑ اپنا سینہ تان کر کھڑا ہو جائے اور تمہاری طاقت پاش پاش ہو جائے۔" درخت نے اس کو کرارا سا جواب دیا تو وہ اور بھڑک گئی۔ "ابھی مدینہ بہت دور ہے...... آج نہیں تو کل...... میں اس کو بھی کھوکھلا کر دوں گی۔" وہ بگولہ بنی جانے ہی والی تھی کہ درخت کی گونجدار آواز نے اسے جکڑ لیا۔ وہ ٹھہر گئی۔

"حالات و واقعات گواہ ہیں کہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ تم مجھ سے ہر بار اپنی دوگنا طاقت کے ساتھ ٹکراتی ہو...... مگر میری جڑوں کو کھوکھلا کرنا تو دور کی بات تم انہیں چھو بھی نہیں سکی۔" درخت کی بات سن کر وہ بوکھلا گئی۔ وہ پھر بولا۔ "پوچھو گی نہیں کیوں......؟ تم تو میری دشمن ہو تم کیوں پوچھو گی۔ جس شخص نے مجھے ننھے پودے کی شکل میں اس جگہ لگایا تھا۔ اس نے میری مردہ حالت دیکھ کر مجھ پر رحمت کی بارش اور فضل و کرم کا سایہ طلب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں اور التجائیں کی تھیں اور درود شریف پڑھ کر مجھ پر پھونک ماری

تھی۔اسی درود کی برکت ہے کہ تم جیسی ظالم اور بے وقوف آندھی میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی اور نہ ہی بگاڑ سکے گی......اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' درخت کا غصہ بھی عروج پر تھا۔آندھی بل کھاتی ہوئی غصے میں چلی گئی مگر شین بے چارہ ان دونوں کی لفظی جنگ سے خوفزدہ لگ رہا تھا۔

''تم بے فکر ہو کر رات بسر کرو......اللہ تمہارا نگہبان ہے۔'' درخت نے شین کی حالت دیکھ کر اسے حوصلہ دیا تو وہ ہمت جتاتا ہوا بولا۔''کیوں نہ ہم......تاجدارِ مدینہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر درود وسلام کے نذرانے پیش کریں۔تاکہ ہماری رات بھی سو کر ضائع نہ ہو اور اللہ بھی ہم پر مہربان رہے۔'' درخت نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور دونوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد محبوب ﷺ رب کائنات کی ذات مقدس ومعطر پر درود پڑھنا شروع کر دیا۔

چند منٹوں بعد ہی ان کو یوں لگا کہ اس جنگل کے ہر درخت کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، ڈالی، ہر ٹہنی، شاخیں اور تنے بھی حتیٰ کہ زمین اور گھاس بھی درود وسلام کے نذرانے پیش کر رہی تھی اور جنگل میں منگل اس شین نے لگا دیا تھا جو پُر امن شہر کا مسافر تھا۔

☆=======☆=======☆

حیاء کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہسپتال کے بیڈ پر پایا۔اس کا شعور کام کرنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے بازو میں گلوکوز کی ڈرپ کی سرنج لگی ہوئی تھی۔اسے تمام واقعات یاد آنے لگے۔جب لاڈو اس کا منہ بولا بھائی بن کر مدرسے کا انتظام کرنے کے لیے نیچے بازار میں اترا تو اس کی مڈبھیڑ جبرو سے ہو گئی تھی۔جبرو نے اسے اپنے اندھے انتقام کا نشانہ بنایا تھا۔وہ زخمی حالت میں اپنے بھائی کی لاش سے لپٹ کر روتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی۔اسے بالکل بھی خبر نہ تھی کہ اسے یہاں تک کون لایا ہے اور وہ اس بیڈ تک کیسے پہنچ گئی۔اس کا بہترین علاج بھی جاری تھا یہ بھی اس کے لیے حیرانگی تھی۔اس نے پہلے تو سوچا کہ جبرو نے ایسا کیا ہوگا۔مگر یہ خیال اس نے فوراً ہی رد کر دیا بلکہ اپنے دماغ اور دل کو کوسا دیا کہ وہ اپنے بھائی کے قاتل کے بارے میں ہمدردانہ سوچ بھی کیسے سکتی ہے۔وہ جبرو سے انتقام لے گی۔ وہ کبھی بھی اس رشتے کے خون کو ضائع نہیں جانے دے گی جو اس بازار میں اسے پہلی اور آخری بار ملا تھا۔لاڈو نے دل کی گہرائی سے اس مقدس رشتے کی جانب قدم بڑھایا تھا اور مدرسہ کی خدمت کے لیے اس نے اپنا تن من دھن لٹانے کا فیصلہ کر کے حیاء کو تو حیران کر ہی دیا تھا۔مگر رب کائنات کو اس کی یہی ادا بھا گئی تھی کہ اسے شہادت کی موت نصیب ہو گئی۔

اس کے قدم راہِ خدا میں اٹھتے چلے گئے تھے کہ ظالم اور شیطان نے اپنا دشمن سمجھ کر لاڈو



کو جبرو کے ذریعے قتل کروا دیا۔مگر یہ شیطان ملعون کی بدترین شکست تھی۔وہ جس لاڈو کو نیکی کے راستے پر چلنے سے روکنا چاہتا تھا۔اللہ تعالیٰ نے اسے بہت بڑے اعزاز سے نواز کر شیطان کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا تھا۔بدبخت اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے اب حیاء کو بھی زک پہنچا سکتا تھا۔

اسے اپنے سر میں شدت سے درد محسوس ہوا تو زخمی ہونے کا احساس بھی شدت سے ہونے لگا۔اسے مکمل آرام کی ضرورت تھی اور وہ مکمل آرام کر بھی رہی تھی مگر ہسپتال کے بیڈ نے اسے پریشان کر دیا تھا۔اسے اس بات کا بالکل بھی علم نہ تھا کہ اس کا محسن کون ہے اور کون ہے وہ عظیم انسان جس نے یہ جانتے ہوئے کہ حیاء ایک طوائف ہے اسے بحفاظت ہسپتال پہنچایا اور فوری طبی امداد کی وجہ سے اس کی سانسیں بحال ہو سکیں۔وہ سوچوں میں گم تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سٹاف نرسوں کے ساتھ ایک نوجوان اور خوبصورت ڈاکٹر بھی اندر داخل ہوا تو اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔

ڈاکٹر کے ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ تھی۔وہ چلتا ہوا اس کے بیڈ تک پہنچا اور کانوں میں اسٹیتھ سکوپ لگا کر اسے چیک کرنے لگا۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' اس کے لہجے کی شیرنی نے حیاء کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ آہستگی سے بولی۔''سر میں کافی تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔'' اتنی دیر میں نرس نے انجکشن تیار کر کے ڈاکٹر کو پکڑایا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔''یہ انجکشن اس تکلیف کو دور کر دے گا۔'' اس نے حیاء کے بازو پر انجکشن لگایا۔ڈاکٹر کے ہاتھ میں کیا جادو تھا کہ اسے ذرہ برابر بھی تکلیف کا احساس نہ ہوا۔نرسیں اپنا سامان سمیٹ کر باہر نکل گئیں۔''ڈاکٹر!'' حیاء نے واپس جانے والے ڈاکٹر کو دھیرے سے پکارا تو وہ رک گیا اور حیاء کی طرف دیکھنے لگا۔''مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

''ایمبولینس والے۔'' ڈاکٹر کا جواب سن کر حیاء کو لگا کہ وہ دماغی طور پر کھسکا ہوا ہے۔ ''مذاق کر رہا تھا۔دراصل ہمیں ایک فون کال کے ذریعے اطلاع ملی کہ فلاں جگہ پر جھگڑا ہو رہا ہے اور کوئی زخمی حالت میں بے ہوش ہے۔فوراً ایمبولینس بھجواؤ۔ہم نے ایسا ہی کیا اور آپ کو یہاں لے آئے اور اب آپ کا علاج ہو رہا ہے۔'' حیاء نے ڈاکٹر کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ وہ آدھا سچ اور آدھا جھوٹ بول رہا ہے۔''کیا یہ خیراتی ہسپتال ہے؟'' حیاء کی بات سن کر ڈاکٹر مسکرانے لگا۔

"نہیں میڈم! یہ اس شہر کا سب سے مہنگا ہسپتال ہے اور میں اتفاق سے اس ہسپتال کا مالک ہوں۔" حیاء یہ انکشاف سن کر حیران رہ گئی۔ "جس شخص کی جانب سے ہمیں فون کال کر کے آپ کے زخمی ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اسی شخص کی جانب سے ہمیں بہت سارو پیہ بھی بھجوایا گیا تھا......اور ہاں......ساتھ یہ پرچی بھی تھی۔" اس نے جیب سے ایک تہہ شدہ پرچی نکال کر حیاء کو تھما دی۔ "اب آپ آرام کریں۔" وہ جاتے ہوئے پھر مڑا۔ "میرا نام سلیم ساگر ہے۔ یہ ہسپتال میری والدہ کے نام پر ہے۔" وہ اپنا مختصر سا تعارف کرواتا ہوا باہر نکل گیا۔

حیاء نے حیرانگی سے پرچی کو دیکھا اور کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ جوں جوں پڑھتی جاتی اس کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھیلتی جاتی تھیں۔ کیونکہ تحریر ہی ایسی تھی۔ اس نے آدھی تحریر پڑھ کر ہی پرچی کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس کی سانسوں کی روانی بگڑنے لگی تھی اور چہرے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ اس نے چند لمحات یونہی گزار کر اپنی حالت کو اعتدال پر لانے کی کامیاب کوشش کی اور پرچی دوبارہ پڑھنا شروع کر دی۔

"حیاء بیٹی!

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بات کرنے کے لیے میں نے تحریر کا سہارا لیا ہے۔ اسے میری بزدلی سمجھ لینا۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ ابھی تمہارے سامنے نہیں آنا چاہتا۔ مگر اس بات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری پیدائش کے پہلے دن سے لے کر آج تک تم میری نظروں میں ہو اور میں دانستہ یا نادانستہ طور پر تمہارا خیال رکھ رہا ہوں۔ تم پر گڈی بائی نے جو ظلم و تشدد کا پہاڑ توڑا ہے۔ اس کی سزا اسے میں اپنے طریقے سے دلواؤں گا۔ تم نے اس راہ کو چھوڑ کر جو سیدھی اور سچی راہ اختیار کی ہے۔ وہ میرے لیے بڑا اعزاز ہے۔ اب تہیہ کر لو کہ تم ان راہوں سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹو گی۔ تمہاری رگوں میں ایک مسلمان باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ میں فی الحال تمہارے سامنے آنے سے معذور ہوں۔ تم اس گناہ کی دنیا سے نکل آؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اپنے سینے سے لگاؤں گا اور اپنا نام دوں گا۔"

تمہارا باپ!"

حیاء کی آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کاغذ کے ٹکڑے کو بار بار چوم رہی تھی جس پر اس کے اپنے خون کی نشانی تھی۔ یہ اس کے باپ کے ہاتھوں کی تحریر تھی۔ وہ بار بار اس خط کو



پڑھنے لگی۔ اسے یک دم دور سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے ڈرپ کی سوئی کو نوچ کر اپنے بازو سے الگ کیا اور ڈرپ سٹینڈ کا سہارا لیتی ہوئی۔ آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گئی۔

"اشھد و ان محمد رسول الله!" یہ سن کر اس نے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں کو محبت سے اپنی آنکھوں پر لگایا تو دل کی دنیا روشن ہو گئی اور صبور احمد کے الفاظ یاد آنے لگے کہ یہی فقرہ اذان کی اصل روح ہے۔ وہ زمین پر ہی سجدہ میں گر گئی۔ اس کے آنسو دل کی فریاد بن کر اور التجائیں بن بن کر آنکھوں کے زندانوں کو توڑ توڑ کر باہر نکل رہی تھیں اور ہسپتال کی زمین پر سجدہ ریز ہو کر رب تعالیٰ کے حضور شکرانہ ادا کر رہے تھے۔ وہ برسوں سے اس رشتہ کی پہچان کے لیے گڈی بائی کی منتیں کرتی آئی تھی۔

آج وہ مقدس رشتہ سامنے آیا بھی تو تحریر کے نقاب میں۔ وہ اپنے باپ کی تحریر کو چوم چوم کر اپنی تشنگی کو بجھانے کی کوشش کر رہی تھی یہ سب کچھ اسے اللہ تعالیٰ نے سیدھی راہوں پر چلنے کا انعام دیا تھا۔ وہ آلِ رسول کے در سے لوگوں کو جھولیاں بھر بھر کر مرادیں لے جاتا دیکھتی رہتی تھی اور سنتی تھی۔ مگر آج رسول ﷺ نے اس کی برسوں کی دلی خواہش کو پورا کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔

بے شک اس کے باپ نے اس سے کوئی رشتہ نہ جوڑا تھا۔ مگر بیس سالوں میں کبھی بھی ناطہ نہ توڑا تھا۔ وہ جب طوائف زادی تھی وہ تب بھی اس کا باپ تھا۔ پھر وہ طوائف بن گئی۔ تب بھی اور جب وہ گھنگھرو باندھ کر تماش بینوں کی تپتی ہوئی نگاہوں کا مرکز بنی تب بھی وہ اس کا باپ تھا اور اب وہ اللہ کی راہ پر چلنا چاہتی ہے تو اس کا باپ مجبور ہو گیا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ان راہوں پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرنے لگا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ حیاء ان راہوں پر چلتی ہوئی کوئی منزل پا لے اور اپنا ماضی بھول جائے اور اس کا باپ پھر سامنے آ کر اسے گلے لگا لے گا۔

"وہ ان راہوں پر چلے گی۔" حیاء نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کا دل بولا۔ "میں کانٹوں پر چلوں گی۔ میں منزل تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی کروں گی۔ میں رب واحد کی رسی کو تھاموں گی اور مضبوطی سے بھی پکڑوں گی......"

"اک رشتے کو پانے کی خاطر!" سامنے ہی شیطان اس کا روپ اختیار کر کے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "واہ یہ دین دار لوگ بھی اپنے فائدے کی خاطر اسلام کو جدھر چاہیں موڑ لیتے ہیں۔"

"کون ہو تم؟" حیاء زور سے چلائی تو شیطان حیاء قہقہے لگانے لگا۔

''تم کون ہو حیاء بی بی؟ ایک طوائف یا عشق کا درجہ پانے والی عشق کا قاف؟''

''میں عشق کا قاف ہوں۔'' حیاء زور سے بولی۔ ''میں عشق کا قاف ہوں۔ طوائف نہیں۔''

''تو پھر عشق کے قاف کا باپ کہاں سے آ گیا؟ وہ تو طوائف کا باپ تھا اور اب بھی ہے۔'' شیطان حیاء کا وار بڑا کاری تھا۔

''نہیں...... نہیں اس نے لکھا ہے وہ مجھے اپنائے گا مجھے اپنا نام دے گا۔ اگر میں دین کے راستے پر چلتی رہی اور منزل پا گئی تو...... وہ مجھے اپنے سینے سے لگائے گا۔'' حیاء روتی ہوئی کہنے لگی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ باپ کے سینے سے لگنے کے لیے تم نے ان راہوں پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے...... واہ بھئی واہ۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتی ہوئی بولی۔ ''وہ آلِ رسول کی محبت کہاں گئی؟ وہ سب تمہارا ڈرامہ تھا۔ وہ سب تمہارا ڈرامہ تھا...... حیاء بیگم! اب بھی لوٹ جاؤ...... وہ گھنگھرو تمہارے اب بھی منتظر ہیں۔ جاؤ حیاء بیگم وہ تمہارا باپ ہے۔ باپ ہی رہے گا۔ وہ تم سے اپنا ناطہ نہیں توڑے گا...... چھوڑو...... یہ دین کا ڈھکوسلہ۔ یہ آلِ رسول کی محبت کا ڈرامہ...... لوٹ جاؤ...... لوٹ جاؤ......'' شیطان حیاء کے قہقہے اس کی سماعت کو زخمی کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھتی ہوئی چیخنے چلانے لگی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کیوں آئی ہو تم یہاں۔ کون ہو تم؟'' وہ چیخ چلا رہی تھی کہ ڈاکٹر سلیم ساگر اور تین نرسیں اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے حیاء کی کیفیت بھانپتے ہوئے۔ اسے پکڑ کر زبردستی بیڈ پر لٹایا اور ڈاکٹر نے ایک انجکشن تیار کر کے حیاء کے بازو میں انجیکٹ کر دیا۔

''میں عشق ہوں...... عشق کا قاف ہوں۔ تم مجھے ان راہوں سے چلنے سے نہیں روک سکتے۔ میں عشق کا قاف......'' پھر اس کا ذہن نشہ کی قید میں آہستہ آہستہ سونے لگا تھا۔ اب وہ صرف ہونٹ ہلا رہی تھی پھر وہ بے سدھ ہو گئی۔

''سٹاف!'' ڈاکٹر سلیم ساگر نرسوں سے مخاطب ہوا۔ ''ان کی سٹی سکین کا انتظام کرو۔ میرا خیال ہے کہ ان کے دماغ پر گہری چوٹ آئی ہے۔'' نرسیں ''جی سر'' کہہ کر باہر نکل گئیں۔ سلیم ساگر حُسن کے اس پیکر کا جائزہ لینے میں محو ہو گیا۔ چند لمحات گزرے ہوں گے کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک غنڈہ اندر داخل ہوا پھر اس کے پیچھے تین اسلحہ بردار بھی اندر آ



گئے جو پہلے غنڈے کے ماتحت لگتے تھے۔

پہلا غنڈہ سیدھا حیاء کے بیڈ کی جانب بڑھا تو ڈاکٹر جو کہ ان کی آمد کی وجہ سے پریشان تھا ہوش میں آتا ہوا آگے بڑھ کر غنڈے کے کندھے پر نرم ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''انہیں آرام کرنے دیں۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر کا انداز تحمل سے بھرپور تھا مگر غنڈے کی آنکھوں میں بدمعاشی کی جھلک اور ماتھے پر غصے کی تیوری دیکھ کر ماتحت غنڈوں نے اسلحہ کی نوک پر ڈاکٹر کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

''یہ کب تک ہوش میں آ جائے گی؟'' غنڈہ جو کہ جبرو تھا بارعب آواز میں بولا۔

''اگر انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے...... تو شام تک......'' ڈاکٹر کا جواب سن کر وہ اپنے غنڈوں سے بولا۔ ''پوری ہیرا منڈی میں یہ اعلان کر دو کہ آج کسی بھی کوٹھے کی روشنی نہیں جلے گی۔ کوئی طوائف گھنگھرو نہیں باندھے گی۔ کوئی دھندہ نہیں ہوگا۔ یہ جبرو کا اعلان ہے اور جو کوئی اس اعلان کی خلاف ورزی کرے گا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' وہ اپنے غنڈوں کے ساتھ باہر نکل گیا تو ڈاکٹر نے پُرسکون سانس لیا۔ مگر وہ سکون کی سانس ابھی پوری طرح خارج نہ کر پایا تھا کہ دروازہ پھر دھماکے سے کھلا اور جبرو اس کی کنپٹی پر پستول رکھتا ہوا بولا۔

''اسے جلدی ہوش میں لاؤ۔ روپے پیسے کی فکر نہ کرنا...... اگر اسے کچھ ہو گیا تو سمجھو کہ شہر کے تمام ہسپتالوں کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' وہ باہر چلا گیا تو ڈاکٹر گردن ٹیڑھی کر کے دروازے کو دیر تک دیکھتا رہا کہ مبادا کہ وہ پھر نہ آ جائے۔

☆=======☆=======☆

احمد سبحانی پُرسکون انداز میں سویا ہوا تھا۔ وہ آج ہی صبور احمد کے ساتھ گاؤں فیضان پور سے واپس لوٹا تھا۔ اس نے اس پہلے سفر میں بہت کچھ سیکھا تھا۔ سعید علی کی فکر بھی ختم ہو گئی تھی کہ اس کا بیٹا غلط سوسائٹی میں رہ کر اس کا اور خاندان کا نام بدنام کر رہا ہے۔ وہ اب ذہنی طور پر مطمئن تھے کہ ان کا بیٹا سادات کی صحبت میں ہے اور دین اسلام کی اچھی اچھی باتیں سیکھ رہا ہے۔

اگلی صبح گھر کے مکینوں کے لیے حیران کن تھی کیونکہ سعید علی اور زویا بیگم تو نماز کے لیے اٹھے ہی تھے۔ احمد سبحانی ان سے بھی پہلے بیدار ہو کر جاءنماز پر کھڑا تھا۔ سعید علی نے زویا بیگم کو اشارہ کیا اور نماز والے کمرے سے چپکے سے باہر بلایا۔

''ہم اپنے کمرے میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔'' سعید علی نے کہا تو زویا بیگم استفسار نظروں

سے دیکھنے لگیں۔ ''میں نہیں چاہتا کہ احمد سبحانی کی عبادت میں خلل پڑے۔'' زویا بیگم بھی آسودہ نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے ''اُنہوں'' کی بات سے اتفاق کیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

فاطمہ نماز کی ادائیگی کے بعد نماز والے کمرے سے قرآن کریم لینے آئی تو احمد سبحانی نے اسے روک لیا۔

''فاطمہ! میں قرآن نہیں پڑھا ہوا...... مجھے سکھاؤ گی؟'' وہ بڑے بھائی کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیوں نہیں؟ لیکن قرآن کریم کی تعلیم اتنی گہری ہے کہ میں آپ کو سکھا نہیں سکتی......بس جو کچھ مجھے معلوم ہے۔ وہ سمجھانے کی کوشش کروں گی۔''

''ٹھیک ہے...... مجھے ابتدائی باتیں ہی بتا دو...... پھر میں قرآن کریم حاکم علی شاہ صاحب سے پڑھنے جایا کروں گا۔'' احمد سبحانی نے کہا تو فاطمہ قرآن کریم کھول کر بیٹھ گئی اور آیتیں پڑھ پڑھ کر ترجمہ اس کو سنانے لگی۔ وہ چھم چھم برستی آنکھوں سے دھڑکتے دل کے ساتھ قرآن کریم اور اس کا ترجمہ سن رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیا سمائی کہ اس نے فاطمہ سے سوال کر دیا۔

''فاطمہ! اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ آپ ﷺ پر نازل کی جانے والی کتاب میں واضح طور پر فرما دیا کہ رسول ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔''

''قرآن تب سے ہے جب سے صاحب قرآن کی ذاتِ مقدس ہے اور حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مقدس تب سے ہے جب وقت کا اپنا تعین نہ تھا۔ وقت کا کوئی وجود نہ تھا مگر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ نورانی وجود کے ساتھ موجود تھا۔ گویا قرآن اور صاحب قرآن ہی حاصل کائنات ہیں۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی۔ تو احمد سبحانی بولا۔ ''مگر تمہیں یہ معلومات کہاں سے ملیں؟'' فاطمہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنی بات وہیں سے شروع کی جہاں سے ختم کی تھی۔

''قرآن کریم میں رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی نعت کچھ اس انداز میں فرمائی ہے کہ

کہیں آپ ﷺ کے قد و قامت کا ذکر ہے۔ کہیں رخسار مبارک کا
کہیں نگاہ تاجدار کا۔ کہیں آپ ﷺ کی دلآویز مسکان کا
کہیں آپ ﷺ کے محوِ خرام کا۔ تو کہیں بیابانوں میں نظریں جھکانے کا



کبھی آسمانوں کی جانب نگاہیں اٹھانے کا۔ کہیں آپ ﷺ کی زلف والیل کا
تو کہیں آپ ﷺ کے چہرۂ والضحیٰ کا ذکر کیا ہے۔ یعنی کہ پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ سے اپنے عشق کا اظہار اس انداز میں کرتا ہے کہ موسیٰ کو کلیم اللہ، عیسیٰؑ کو روح اللہ، ابراہیم کو خلیل اللہ، اسمٰعیل کو ذبیح اللہ...... مگر اپنے محبوب ﷺ کو ہر جگہ نئے نام سے پکارا ہے۔ اپنے محبوب ﷺ کو ہزاروں صفاتی پیارے ناموں سے پکار پکار کر ہم پر یہ احسان کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کیا کرو اور جب قرآن پڑھا جائے تو محبت اور توجہ سے سنا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی مدحت خوانی کو تلاوت کلام مجید سے منسوب فرماتا ہے۔''

فاطمہ خاموش ہوئی تو احمد سبحانی کے دل میں آنسوؤں کا جو غبار بنا ہوا تھا وہ چھٹ گیا اور دریائے آنکھوں کا رخ کر کے پیہم لہروں کی مانند بہنا شروع کر دیا۔

''یعنی کہ صبور احمد اور حاکم علی شاہ اس محبوب ﷺ الٰہی کی اولاد ہیں جن کا تذکرہ قرآن کی سورتوں میں ملتا ہے......اور ہم...... کتنے بدنصیب ہیں کہ حاکم علی شاہ کو پہچان نہ سکے۔ ہمارا یہ گناہ خداوند کریم کس طرح معاف فرمائے گا...... میں اس گناہ کا کفارہ ادا کروں گا...... اللہ مجھے توفیق عطا فرمانا۔'' وہ سجدے میں گر گیا تو فاطمہ بھی بھرائے ہوئے دل کے ساتھ قرآن کریم کو سینے سے لگائے باہر نکل گئی۔

وہ کتنی ہی دیر سجدے میں پڑا رہا اور شاید پڑا رہتا مگر اس کی روح فنا ہو گئی جب اس نے اپنے پاس سانپ کی پھنکار سنی۔ وہ تڑپ کر سجدے سے اٹھا تو وہ لمبے اور سیاہ سانپ کو اپنے تھیلے سے نکلتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا...... یہ وہی تھیلا تھا جو صبور احمد کے ساتھ فیضان پور لے کر گیا تھا اور آ کر اس نے بے خیالی میں اپنے بیڈ کے پاس پھینک دیا تھا۔ وہ سانپ کو مکمل باہر آتا دیکھ کر حرکت کرنا بھول گیا تھا۔ سانپ کی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنی دیر میں فاطمہ ہاتھ میں قرآن تھامے اندر داخل ہوئی اور بے خیالی میں احمد سبحانی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ مگر پھر وہ حرکت کرنا بھول گئی تھی۔

''ب...... بھائی! سانپ!'' فاطمہ بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔ اب سانپ پوری طرح تھیلے سے باہر آ کر اپنا پھن پھیلائے ان دونوں بہن بھائی کو اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' احمد سبحانی فاطمہ سے یہی کہہ سکا وہ اس کے پاس قالین پر ہی بیٹھ گئی۔

''تم کنگنی ہونا؟'' احمد سبحانی نے سانپ سے کہا تو فاطمہ کو شک گزرا کہ وہ سانپ دیکھ کر

اپنے حواس کھو بیٹھا ہے جو سانپ سے باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ مگر دوسرا ہی لمحہ فاطمہ کے لیے اور احمد سبحانی کے لیے بھی حیران کن تھا کہ سانپ نے اپنا پھن قالین پر رکھ دیا۔ اس نے فاطمہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے قرآن کے احترام میں اپنا پھن جھکا دیا تھا۔ وہ آہستہ سے پھنکارا تو احمد سبحانی کے کانوں میں اس کی آواز ''ہاں میں کنگنی ہوں۔'' سنائی دی تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ عشق اسے اس سٹیج پر لے آیا تھا کہ وہ اس موذی جانور کی زبان سمجھ سکتا تھا۔

''یہاں...... کیسے؟'' احمد سبحانی جانتا تھا کہ وہ کنگن کے قاتل کو ڈھونڈنے آئی ہے اور وہ چھپ کر اس کے تھیلے میں آ گئی ہوگی۔ تو اس نے سارا سفر کنگنی کو اپنی گود میں اٹھائے اٹھائے ہی کر لیا تھا۔ وہ خوف سے کانپ گیا۔ کنگنی کوئی بھی جواب دینے کی بجائے تھوڑی سی کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جانے لگی۔

احمد سبحانی کو ڈر تھا کہ کہیں سعید علی یا زویا بیگم یا پھر کوئی ملازم اسے نقصان نہ پہنچائے یا خوفزدہ ہو کر اہلِ علاقہ کو اکٹھا نہ کر لیں۔ وہ فوراً اٹھا اور کنگنی کو نیچے باغ میں رینگتا دیکھ کر اس پر نظریں جما دیں۔ فاطمہ بھی ہمت کر کے اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کنگنی گراؤنڈ سے دیوار پر اور پھر دوسری طرف اتر گئی۔

''بب...... بب...... بھائی...... یہ سانپ؟'' فاطمہ کی زبان ابھی تک اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔

احمد سبحانی نے اسے پیار سے بٹھایا اور فیضان پور کا واقعہ سنانے لگا۔ فاطمہ کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے کبھی کھل جاتیں اور کبھی اس قدر پھیل جاتیں کہ خوف آنے لگتا۔ وہ حیرانگی سے اپنے آوارہ بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے عشقِ سادات میں کافی مقام پا لیا تھا۔

☆=======☆=======☆

حیاء ہسپتال سے فارغ ہو کر اپنے کوٹھے پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے سر میں ہلکی ہلکی درد ہو رہی تھی مگر وہ قابلِ برداشت تھی۔ وہ آ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ ڈاکٹر سلیم ساگر نے اس سے بہت پوچھنے کی کوشش کی کہ اس کی رہائش کہاں ہے۔ وہ اکیلی نہ جائے۔ وہ اپنی گاڑی میں چھوڑ آئے گا لیکن حیاء اس بھلے آدمی کو کسی بھی مصیبت میں نہ ڈالنا چاہتی تھی۔

ماضی کے واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ وہ کسی بھی طرح ان کو ترتیب دینے سے ذہنی طور پر قاصر تھی۔ وہ ذہن پر زور دیتی تو درد بڑھنے لگتا۔ اس نے آنکھوں کو بند کر لیا۔ وہ پُرسکون انداز میں زندگی کے چند دن گزار کر پھر مدرسہ کا کام شروع



کرنا چاہتی تھی۔

لیکن آنکھیں بند کرتے ہی دماغ پُرسکون ہوا تو احمد سبحانی کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ''بس آج کے بعد ناچ گانا ختم، شراب بند، وہ کبھی بھی اس کوٹھے کی سیڑھیاں نہیں چڑھے گا۔'' وہ صبور احمد کے ساتھ اسے حاصل کرنے کی بحث کر رہی تھی مگر ان کا کہنا تھا کہ وہ ان کا ہے۔ حیاء کا کبھی نہیں ہوگا۔ ان کی بات میں کیا تھا کہ حیاء کا بھی ذہن بدلنے لگا۔ وہ بھی اس گندگی سے نکلنے کے لیے پَر تولنے لگی اور پھر اس کی نیت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صبور احمد کے ذریعے اس کی آزمائش لی۔ وہ ان کے بدن سے گندگی دھو کر اس امتحان کو پاس کرتی ہوئی عشق کی سیڑھی پر پاؤں رکھ گئی۔ پھر اس کا دل اچاٹ ہو گیا وہ ناچ گانے سے توبہ کر کے سادات سے عشقِ مصطفیٰ ﷺ سیکھنے کے لیے ان کے در پر جاتی رہی۔ اسے عشق کے قاف کی سند مل گئی۔ پھر اس بازار کی پنچایت نے اس پر اپنا رعب اور اثر و رسوخ جما کر اسے اس بازار سے بے دخل کرنے کا الارم بجایا تو وہ ان کے فیصلوں کے آگے سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو گئی۔

مدرسہ کا آغاز کرنے سے پہلے ہی اس کا منہ بولا بھائی لاڈو، جبرو نے قتل کر دیا۔ وہ ایک بار پھر اس کام میں تنہا ہو گئی۔ مگر اس کی تنہائی اس کی بے ہوشی تک ہی محدود رہی۔ اسے باپ کا سہارا مل گیا جو ابھی تک آنکھوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ کون تھا؟ کیسا تھا؟ حیاء اس کو اپنے تصورات سے کھینچتی تو ہر تصویر دھندلی ہو جاتی۔ اس نے آنکھیں کھول کر چھت کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

وہ اولیاء اللہ کو مانتی تھی اور ان کی درگاہوں پر باقاعدگی سے حاضری بھی دیتی رہتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ایک بار پھر سیّد حاکم علی کے گھر جائے اور آگے کے مسئلہ پر ان سے ہدایت طلب کرے۔ وہ ان کی مدد سے اس مشکل گھڑی سے نکل سکتی تھی مگر پھر دوسرے ہی لمحہ اسے یہ بات بھی یاد آ گئی کہ انہوں نے کہا تھا کہ اب ان کا کردار ختم ہو گیا ہے۔ ان راہوں کو تم نے خود ہی چنا ہے۔ ان پر چلنے کے لیے حوصلہ اور عزم بھی تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔

وہ جتنا سوچتی تھی ذہن اتنا ہی الجھ جاتا تھا۔ ابھی دوپہر کے دو ہی بجے تھے بازار کی ویرانی جوں کی توں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس بازار پر نیند کا جادو کر دیا گیا ہے اور یہ لوگ سو سال تک یونہی سوتے رہیں گے۔

وہ اٹھ کر ننگے پاؤں چلتی ہوئی بالکنی میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ جس آرام دہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پر بیٹھ کر چائے پیا کرتی تھی مگر اب کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسے چائے بنا کر دیتا۔ کبھی

سازندے اور ملازم بھاگ گئے تھے۔ وہ حیاء کو ذہنی مریض قرار دے چکے تھے۔

اس نے لوہے کی گرل سے باہر دیکھا تو ایک چھوٹا سا لڑکا نظر آیا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارہ سے حیاء کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ وہ دو دن سے بھوکا ہے۔ حیاء اس کی مدد کرے۔

وہ نہ جانے کب سے اس گلی میں گھوم رہا تھا اور ہر بالکنی کو ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوگا اور اس آس پر کہ کوئی بالکنی سے اس کی طرف متوجہ ہو تو وہ اپنا مدعا اس سے بیان کر کے پیٹ کا جہنم بھر سکے۔ حیاء نے اس کو غور سے دیکھا تو اس کی معصومیت پر ترس آ گیا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور اشارے سے سیڑھیوں کا راستہ اسے سمجھایا کہ وہ اوپر آ سکے۔

لڑکے کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ دوڑتا ہوا کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ مگر اوپر آتے ہی وہ ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جیسے وہ کسی محل میں آ گیا ہو۔ وہ حیاء کو ڈھونڈنے لگا۔ اس کا سینہ نہ پھول رہا تھا اور نہ ہی پچک رہا تھا حالانکہ وہ کافی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تھا۔ حیاء یک دم اس کے سامنے آئی تو ٹھٹکنے کے ساتھ ساتھ سہم بھی گیا۔

حیاء نے دیکھا کہ وہ خوبصورت لڑکا ہے جس کی عمر سات یا آٹھ سال ہوگی۔ اس کے چہرے پر میل جمی ہوئی تھی اور قمیص کا کالر بھی پھٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کسی گریس وغیرہ سے کالے ہو رہے تھے۔ اس کا پاجامہ بھی میلا تھا اور وہ ننگے پاؤں تھا۔ اس کے پاؤں مٹی اور دھول سے اَٹے ہوئے تھے۔

"میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا بیگم صاحبہ!" اس کی آواز میں جو تڑپ تھی وہ بھوک اور مفلسی کی نشان دہی کر رہی تھی۔ حیاء تڑپ کر رہ گئی۔ "آپ کو کائنات کے پہلے عاشق کا واسطہ، مجھے کھانا کھلا دیں۔" اتنی بڑی بات، اتنا بڑا واسطہ! اتنے قیمتی الفاظ؟ یہ کون ہے؟

حیاء نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اللہ کا نام سیدھی طرح کیوں نہیں لیا۔ اسے کیا معلوم کہ کائنات کا پہلا عاشق کون ہے۔ اس نے اللہ کو پہلا عاشق کیوں کہا۔ کس بنا پر کہا۔ کیا اسے معلوم ہے کہ اللہ ہی پہلا محب اور رسول ﷺ پہلے محبوب ہیں۔ اتنی گہری بات؟ اسے یک دم لڑکے سے خوف محسوس ہونے لگا۔

"بیگم صاحبہ کھانا؟" حیاء نے محسوس کیا کہ اگر چند لمحے اسے مزید کھانا نہ دیا گیا تو وہ کہیں بے ہوش ہی نہ ہو جائے



"تم یہیں بیٹھو!" حیاء نے اسے قالین پر بٹھایا اور خود کچن میں چلی گئی۔

اس نے کھانا کچن سے لا کر اس کے سامنے رکھا ہی تھا کہ لڑکے کی بھوک مزید بڑھ گئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "میں ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤں گا۔" حیاء اس سے پہلے ہی متاثر تھی۔ وہ یہ بات سن کر اسے واش بیسن تک لے گئی۔ اس نے بڑے احسن طریقے سے صابن سے ہاتھ منہ دھویا اور تولیہ سے صاف کیا تو اس کا حسن مزید نکھر گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئلے کی کان میں کوئی ہیرا جگمگا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کشش تھی۔ وہ کوئی یونانی دیوتا لگتا تھا۔

حیاء نے اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا وہ کئی دنوں کا بھوکا لگ رہا تھا۔ وہ بالکل ایسے ہی بیٹھا تھا جیسے کوئی بچہ سکول سے واپس آنے کے بعد اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"محمد علی مرتضیٰ۔" وہ مختصر سا جواب دے کر پھر حیاء کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ کہ وہ اسے کھانا کھلا رہی تھی۔ حیاء نے ایک بات محسوس کی کہ وہ کوئی بھی نوالہ لینے سے پہلے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا اور پھر منہ میں کچھ پڑھنے لگتا تھا۔ حیاء اس سے پوچھ نہ سکی کہ وہ منہ میں کیا پڑھتا ہے۔ اس کا تمام جسم ہی روئی کے گالے کی طرح نرم و ملائم اور ریشم کی طرح خوبصورت تھا۔

"تم رہتے کہاں ہو اور اس بازار میں کیسے آ نکلے؟ شکل وصورت سے تو فقیر نہیں لگتے۔" حیاء کے اکٹھے سوال سن کر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "میں فقیر نہیں ہوں۔ مگر آقائے دو جہاں ﷺ کے در کا گدا ہوں۔ میں کہیں بھی رہ لیتا ہوں اور آج میری ڈیوٹی اس بازار میں لگی تھی۔" اس نے حیاء کے تینوں سوالوں کا بیک وقت جواب دے کر اسے خاموش بھی کروا دیا تھا اور حیران بھی۔ کیونکہ اس نے خود کو آقائے دو جہاں محبوبِ خدا ﷺ کی گلی کا گدا کہہ کر اپنا قد حیاء سے بڑا کر لیا تھا۔

"تم نے یہ اچھی اچھی باتیں کہاں سے سیکھیں؟" حیاء نے اسے آخری نوالہ کھلایا تو اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اپنی ماں سے۔" حیاء اس کے گفتگو کے انداز سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ "اب کہاں جاؤ گے؟" جبکہ حیاء نہیں چاہتی تھی کہ وہ اب کبھی بھی یہاں سے جائے۔ اس نے اپنے دل کے چور کو چار الفاظ میں باہر

نکالا تو وہ ہنسنے لگا۔

''ابھی تو کہیں نہیں جا سکتا۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''کیونکہ بہت تیز بارش آنے والی ہے۔'' اس کی پیشین گوئی سن کر حیاء نیلے آسمان پر چمکتی ہوئی دھوپ دیکھ کر اسے کھسکا ہوا سمجھنے لگی۔

''بارش!'' وہ بات کو آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔ ''مگر بارش کا تو کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔'' حیاء حیرت سے بولی تو وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بالکنی میں لے گیا مگر حیاء کو محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ کسی قیمتی اور انتہائی اعلیٰ ریشم میں پھنس گیا ہے۔

''ادھر سے سیاہ بادل آئے گا اور آپ دیکھنا کھل کر برسے گا۔ ابھی کے ابھی۔'' اس نے آسمان کی جانب مشرق کی سمت انگلی گھماتے ہوئے حیاء کو بتایا اور سمجھایا۔ ''آپ اندر جاؤ...... میں بالکنی میں کھڑا ہو کر بارش کا نظارہ کروں گا۔'' وہ حیاء سے بولا تو وہ اس کے ہاتھ چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اس مافوق العقل بچے کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔ وہ اسے چھوتی یا اس کا ہاتھ چھو جاتا تو وہ ریشم سے بھی نرم محسوس ہوتا تھا۔ وہ کون تھا؟ کیا پھر کوئی آزمائش ہے جو اسے آزمانا چاہتی ہے۔

''یہ آپ کا سامان کدھر گیا؟'' اس نے مڑ کر معصومیت سے حیاء سے سوال کیا تو وہ ہال پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔ ''میں نے بیچ دیا۔''

''مگر کیوں؟'' اس کی اس کیوں میں اتنی معصومیت تھی کہ وہ بن چاہے ہی آگے بڑھی اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ بالکل ہلکا اور نرم تھا۔ ''میں اب ناچتی نہیں ہوں۔'' حیاء نے جواب دیا۔

''تو پھر کھانا کہاں سے کھاؤ گی؟'' بچگانہ سوال تھا مگر بہت گہرائی سے کیا گیا تھا۔

''جس کے لیے ناچنا گانا اور گندہ ماحول چھوڑا ہے...... وہ رازق و مالک ہے۔ خود ہی کھانا بھی کھلائے گا۔'' کوئی اور ہوتا تو حیاء اتنا لمبا اور مشکل الفاظ میں جواب نہ دیتی مگر وہ جان گئی تھی کہ جو بچہ مشکل الفاظ میں سوال کر سکتا ہے وہ مشکل الفاظ سمجھ بھی سکتا ہے۔

''مگر یہ راہیں تو بہت کٹھن ہیں۔'' وہ حیاء کی گود سے اترتا ہوا پھر بالکنی میں چلا گیا۔

''کانٹوں کی رہگزریں پاؤں کو شل کر دیتی ہیں...... روح زخمی ہو جاتی ہے۔ دل گھائل ہو جاتا ہے۔ اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ پھر ناکامی کی صورت میں فرار کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔ انسان گلیوں کا گدا بن کر در در کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ فقیر نہیں بلکہ بھکاری بن جاتا ہے اور بھکاری کو ہر در سے خیر نہیں ملتی بلکہ دھتکار دیا جاتا ہے اور دھتکارے ہوئے کی اللہ کی بارگاہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔''



وہ اس انداز میں بول رہا تھا جیسے کہ تقریر کر رہا ہو۔ وہ اس وقت ایک منجھا ہوا عالم دین لگ رہا تھا۔ وہ بڑے سکون سے بالکنی میں کھڑا دور مشرق کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے کہ اپنی پیشین گوئی غلط ہو جانے پر اسے نادم تو نہیں ہونا پڑے گا۔

اس وقت تو حیاء واقعی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی جب گھنگھور گھٹائیں مشرق کی جانب سے اٹھیں اور آن کی آن میں ہی پورے شہر کو سیاہ اندھیرے کی چادر اوڑھا کر دن میں اندھیرا کر دیا۔ دن کے وقت روشنیاں بھی کم پڑ گئی تھیں۔ مصنوعی روشنیوں نے اس بازار کو بقعہ نور بنا دیا تھا۔ مگر بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور موسم کی خراب نیت اس بات کا اشارہ کر رہی تھی کہ آج کی ہونے والی بارش لوگوں کو مدتوں نہیں بھولے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھاجوں مینہ برسنے لگا تھا۔

حیاء کو اب اس بچے سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ سر کا درد اور اپنے زخم بھول گئی تھی۔ اسے محمد علی مرتضیٰ کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ وہ فقیر نہیں ہے مگر کالی کملی والے آقا کے در کا گدا ہے۔ آج اس کی ڈیوٹی اس بازار میں ہے۔

یہ کون ہے؟ کون سی ڈیوٹی کر رہا ہے؟ سورج کی کرنیں جب حدت دے رہی تھیں تو اس کے کہنے پر یک دم بارش کیسے ہو گئی؟ حیاء اس کے بارے میں جتنا سوچتی جاتی تھی اتنا ہی الجھتی جاتی تھی۔ اس نے اس بچے کی طرف دیکھا تو وہ بے فکری سے بالکنی میں کھڑا بارش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی معصومیت دیکھ کر حیاء خوفزدہ ہونے لگی تھی۔

''علی مرتضیٰ!'' حیاء اس کے پاس جا کر اسے مخاطب کرتی ہوئی بولی۔ ''اندر آ جاؤ سردی لگ جائے گی۔''

''عشق موسموں کی شدت سے بے نیاز ہوتا ہے۔'' اس کا فقرہ حیاء پر بم بن کر گرا۔

''عشق!'' وہ اپنا حلق تھوک نگل کر اتنا ہی کہتی ہوئی تر کر گئی۔ محمد علی مرتضیٰ اس کی طرف مڑتا ہوا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب بہت خوف زدہ تھی۔ ''ہاں عشق!'' وہ پھر بولا۔ ''میرا نام یہی ہے۔ میرا کام یہی ہے۔ سکھ چین آرام یہی ہے۔ رنج و آلام ہی عشق ہے۔ میرا اوڑھنا بچھونا عشق ہے۔ میرا مرنا جینا عشق ہے۔ میرا ہنسنا رونا عشق ہے۔ میرا چلنا

پھرنا عشق ہے۔ میرا سونا جاگنا عشق ہے۔'' وہ بول رہا تھا اور حیاء حیرتوں کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ بول رہی تھی بلکہ بول ہی نہ سکتی تھی۔

''میں عشق ہوں۔ اپنی آئی پر آ جاؤں تو بادشاہوں کی گردنیں جھکا دیتا ہوں۔ خاکروبوں کو تاج و تخت دلا دیتا ہوں۔ میں عشق ہوں تاج وتخت کو ٹھوکر مار کر گلیوں کا کوڑا بننے پر بھی فخر محسوس کرتا ہوں۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا تو حیاء کو اپنا منہ بند کرنے کا موقع مل گیا جو اس کی باتیں سن کر حیرت سے کھل گیا تھا۔ محمد علی مرتضٰی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ زور دار دھماکے سے کھلا اور جبرو اپنے چار ساتھیوں سمیت اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھی اسلحہ سے لیس تھے۔

ان سب کے بدن پانی سے شرابور تھے اور کپڑوں سے بھی پانی نچڑ رہا تھا۔ جبرو اپنے ہی نشے میں آگے بڑھا مگر حیاء کو ایک بچے کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ حیاء کی گود میں اس بچے کا سر تھا اور حیاء نے جبرو کی آمد کو کوئی خاص تاثر نہ دیا تھا۔

''کون ہے یہ؟ اور اس کا سر تمہاری گود میں کیوں ہے؟'' حیاء نے جبرو کے کہنے پر غور کیا تو اسے پتہ چلا کہ علی مرتضٰی عشق کے اوّلے کاموں کی داستان بیان کرتا کرتا اس کی گود میں آ گیا تھا۔ وہ پھولوں سے ہلکا تھا۔ حیاء نے اسے آہستگی سے اٹھایا تو وہ اٹھ کر جبرو کے سامنے بدمعاشوں کی طرح کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''تم کون ہو؟'' اس نے جبرو سے سوال کر دیا تو وہ اپنے غنڈوں کے ساتھ قہقہے لگانے لگا۔ مگر حیاء کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں واضح تھیں۔ وہ آگے بڑھ کر محمد علی مرتضٰی کو وہاں سے ہٹا کر اندر لے جانا چاہتی تھی مگر وہ اس وقت حیران رہ گئی جب اس نے پیچھے دیکھے بغیر ہی ہاتھ اٹھا کر حیاء کو منع کر دیا۔ ''آپ صرف تماشہ دیکھیں گی۔ میرا اور اس جاہل بدمعاش کا۔'' جبرو کی ناک غصے سے پھولنے اور پچکنے لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر علی مرتضٰی کو ایک ہاتھ سے اٹھالیا۔ وہ اس کی سوچ اور توقع سے بھی ہلکا تھا۔

''میرا نام سنا ہے؟'' جبرو نے اسے اٹھائے اٹھائے ہی کہا تو علی مرتضٰی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''کسی کو قتل کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر چاہوں تو تمہیں اس کھڑکی سے ابھی باہر پھینک دوں۔'' حیاء یہ سن کر آگے بڑھی۔ ''نہیں نہیں۔ جبرو...... اسے چھوڑ دو...... یہ بچہ ہے۔ تمہاری لڑائی میرے ساتھ ہے۔ مجھ سے بات کرو۔ یہ بچہ ہے۔ اسے چھوڑ دو۔'' جبرو نے قہقہہ لگاتے ہوئے اسے زمین پر چھوڑ دیا۔ سبھی حیران تھے کہ اس کے چہرے پر ذرا بھی



گھبراہٹ یا خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ چوکنا ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بارش نے پورے شہر کے کاروبار کو معطل کر دیا تھا۔ سڑکوں بازاروں اور گلیوں نے ندی نالوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب بارش کبھی بھی نہیں تھمے گی۔ ایک گھنٹہ سے بارش کی رفتار میں کمی آنے کی بجائے اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

''بدمعاش اور طوائف کا بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔'' محمد علی مرتضٰی کی معصوم آواز گونجی تو سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حیاء چاہتی تھی کہ وہ خاموش رہے مگر نامعلوم وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جبرو بدمعاش ہے۔ اب وہ آگے نہ جانے کیا کہنے والا تھا کہ جبرو گھٹنوں کے بل طنزیہ انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''مزید کچھ فرمایئے نا!'' جبرو کا طنز حیاء نے بخوبی محسوس کیا تھا۔

جبرو بھی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ سات سالہ بچہ اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

''تمہیں میں عقل کا اندھا کہوں تو برا تو ضرور لگے گا۔ مگر میری باتیں غور سے سنو مسٹر بدمعاش!'' جبرو کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر وہ اپنے آپ کو پُرسکون رکھتا ہوا اس بچے کو دیکھ رہا تھا جو ابھی تک مسلسل اسے زچ کیے جا رہا تھا۔ ''جی فرمایئے حضور والا! بندہ ہمہ تن گوش ہے۔ آپ کی تقریر سننے کے بعد ہی جناب کے قتل کا کچھ سوچا جائے گا۔'' حیاء لرز گئی۔ کیونکہ وہ ابھی تک لاڈو کے قتل کی لرزہ خیز واردات کو نہیں بھول سکی تھی۔ وہ کچھ بولنے والی تھی کہ محمد علی مرتضٰی بولنے لگا۔

''جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر آتے ہی رہتے ہیں اور جس جگہ طوائف ہو۔ اس جگہ بدمعاشوں اور تماش بینوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ مگر...... جس جگہ بیری ہو۔ اس کے گرد پتھر لگنے سے چھوٹے چھوٹے بیر گرے اور بکھرے ہوتے ہیں اور جس جگہ طوائف ہو۔ اس جگہ پر گھنگھرو، طبلہ، ڈھولک بناؤ سنگھار اور دیگر لوازمات ہوتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جگہ طوائف کی ہے۔'' وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اس طرح بات کر رہا تھا جیسا کہ کوئی سمجھدار جاہلوں کو سمجھانے کی کوشش میں جھلاہٹ کا شکار ہو۔ وہ اپنا سانس درست کرنے کے لیے رکا تو جبرو بھی تڑپ کر اٹھ گیا۔ جبکہ حیاء بھی ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ وہ پھر بولا۔

''اگر تمہیں یہ طوائف لگتی ہے تو پھر اس کے گرد متعلقہ اشیاء کیوں نہیں ہیں؟ یہ ناچنے کے لیے بے تاب و بے چین کیوں نہیں ہے؟ یہ تمہاری آمد پر پسندیدگی کی بجائے ناپسندیدگی کا اظہار کیوں کرتی ہے؟ کبھی ان محرکات پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے تم نے؟'' اس

نے گردن اونچی کر کے پورے قد کے ساتھ کھڑے جبرو کی طرف دیکھا جو ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ غالباً اس کا گلا بھی خشک ہو گیا تھا۔

محمد علی مرتضیٰ اس پر بھی خاموش نہ ہوا بلکہ اپنی مدلل گفتگو کا آغاز وہیں سے کیا۔ جہاں سے چھوڑا تھا۔

''ہمارے ملک کا المیہ یہ ہے مسٹر بدمعاش...... کہ آج تک اس ملک کو اس کی روح کے مطابق کوئی بھی حکمران نہیں ملا۔ جو کلمہ کی بنیاد اور اس ملک کی اصل حقیقت کو سمجھتا ہوا عوام کے دلوں پر حکمرانی کر سکے۔ بس غیروں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا کشکول اٹھا کر ان کی دہلیز پر جھکنے کے لیے اپنا ایمان، دین، دھرم، بلکہ بیٹیاں بھی بیچنے سے دریغ نہیں کرتے۔'' اس نے اچھے خاصے ماحول کو سحر زدہ کر دیا تھا۔ ''مسٹر بدمعاش! اگر یہ کل کی طوائف تمہاری دوستی اور تعلق داری سے ناطہ توڑ کر اپنی ایک الگ اور منفرد دنیا بنانے چلی ہے تو تمہیں خوش ہونا چاہیے نا کہ تم اسے دوبارہ اسی گندگی میں دھکیلنے کی کوشش کرو۔ اب یہ عشق محبوب ﷺ الٰہی کی راہوں پر چلتی ہوئی بے حیاء سے حیاء بن گئی ہے۔ خدا کی قسم تم تو کیا۔ اس پورے ملک کی ہیرا منڈیاں بھی اس کو ہمارے گروہ سے جدا نہیں کر سکتیں اور نہ ہی تمہارے تعلق والے حکمران!''

وہ خاموش ہوا تو جان لیوا لمحات پر اس کی گفتگو نے گہرا سکوت طاری کر دیا تھا۔ مگر جبرو کو بھی سبکی محسوس ہونے لگی تھی وہ بدمعاشوں کا سربراہ تھا اور پھر حیاء کا عاشق بھی۔ وہ ایک معصوم بچے سے کس طرح زچ ہو سکتا تھا۔ یا زچ ہونے کے بعد خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔

''تمہارا کون سا گروہ ہے؟ کیا یہ اب بچوں کے گروہ کے لیے ناچا کرے گی؟'' اس نے دوسرا فقرہ حیاء کی طرف کرتے ہوئے کہا تو محمد علی مرتضیٰ ایک سلجھے ہوئے بزرگ کی طرح ٹہلتے ہوئے بولا۔

''ہمارا گروہ عاشقوں کا ہے اور میرا نام محمد علی مرتضیٰ ہے۔ میں اپنے گروہ کا سردار ہوں۔ عشق میں عمر کے مطابق درجات نہیں ملتے بلکہ کاموں کی نوعیت دیکھی جاتی ہے۔ عاشق کی آزمائشوں کو کڑی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ جب وہ کندن بن جائے تب اسے درجہ ملتا ہے۔''

''اچھا!'' جبرو کا اچھا کافی لمبا ہو گیا تو وہ زوردار قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔ ''تو اب یہ عشق کے



گروہ میں شامل ہو گئی ہے۔ اگر مجھ جیسا بدتمیز، لفنگا، جاہل اور بدمعاش اس گروہ کے عاشق کو ڈھونڈنا چاہے تو...... یا پھر عشق سے ملنا چاہے تو مجھے کیا کرنا ہو گا۔ جناب کا کوئی تو پتہ ہو گا۔ کیسے رابطہ کروں...... کس سے پوچھوں کہ عشق صاحب سے ملنا ہے...... سرکار کچھ اس بارے میں اشارہ فرمائیں گے۔''

محمد علی مرتضیٰ نے اس کی پوری بات تحمل سے سنی اور باہر برسنے والی بارش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''تمہارا لب ولہجہ بتا رہا ہے کہ تم بے وقوف تو ہو ہی...... مگر پرلے درجے کے جاہل بھی ہو۔'' یہ سن کر جبرو کے کان سرخ ہونے لگے۔ وہ بچے کی بدتمیزی کافی دیر سے برداشت کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا۔ علی مرتضیٰ پھر بول پڑا۔

''اگر عقل، دل اور دماغ پاس ہیں تو غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش بھی کرنا کہ میں کون ہوں؟'' وہ آنکھیں بند کر کے مراقبے کی حالت میں چلا گیا اور چند لمحات گزرنے کے بعد بولا۔

''عشق کی بات کرتے ہو۔ عشق کا پتہ پوچھتے ہو...... سمجھو کہ تم سے عشق ہی مخاطب ہے۔

جب جب کا وجود نہ تھا جب تب بھی نہ تھا
جب آفتاب کی نور افشانیاں نہ تھیں
جب فلک کی تبسم آرائیاں نہ تھیں۔
ماہتاب کی کرنیں نہ تھیں، جب قوس وقزح کی رعنائیاں نہ تھیں۔
نہ کروٹ لیل ونہار تھی۔ نہ نیلگوں آسمانی شامیانہ تھا۔
نہ مکیں ومکان تھا۔ نہ زمین وآسمان تھا۔
نہ دریاؤں میں روانی تھی۔ نہ قلزم میں جولانی تھی۔
نہ آبشاروں میں ترنم تھا۔ نہ فضاؤں میں تبسم تھا۔
نہ چلتی ہوائیں تھیں۔ نہ معطر فضائیں تھیں۔
نہ جمادات تھے۔ نہ نباتات تھے۔ نہ انسانات تھے۔ نہ جنات تھے۔
نہ کلیوں میں مہک تھی۔ نہ خاروں میں کٹک تھی۔
نہ ستاروں میں چمک تھی۔ نہ بہاروں میں مہک تھی۔

نہ کلیم اللہ تھے۔ نہ روح اللہ تھے۔ نہ ذبیح اللہ تھے۔
ارے موت تھی نہ حیات تھی
اک اللہ اور محمد ﷺ کی ذات تھی

پھر محبت نے عشق کا روپ اختیار کیا تو کائنات معرضِ وجود میں آئی اور جب کائنات کو اس نے اپنے محبوب ﷺ کی اطاعت سے مشروط کیا تو خود بھی اسیر عشق ہو گیا۔ صدمۂ ہجر گوارہ نہ کرتے ہوئے معراج شریف کی رات کا اہتمام کیا اور عشق کو سرخرو کرنے کے لیے محبوب ﷺ کو عرش بریں پر بلوایا۔''

محمد علی مرتضیٰ کی رگیں پھول گئی تھیں۔ اس کے ماتھے پر ننھے منے پسینے کے قطرے اٹھکیلیاں کرنے لگے تھے۔ اس نے حیاء کو تو پہلے ہی ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر اب جبرو کا وجود بھی لرزنے لگا تھا۔ ''جاؤ!'' وہ جبرو سے مخاطب ہوا۔ ''اپنی برادری سے کہہ دو کہ حیاء ہماری ہے۔ تم سب بھی مل کر اسے ہم سے چھین سکتے ہو تو چھین لو......'' اس معصوم کی آواز میں جو گھن گرج تھی۔ اس نے جبرو کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔

''جاؤ...... چلے جاؤ...... ورنہ ابھی کے ابھی گولیوں سے تمہیں چھلنی کر دوں گا۔'' جبرو اپنی اوقات پر آنے لگا تھا۔ وہ معصوم علی مرتضیٰ سے خاصا زچ دکھائی دے رہا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو وہ آگے بڑھ کر اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھانے لگا مگر یہ کیا وہ علی مرتضیٰ کو اس کی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا سکا۔ حیاء یہ تماشہ دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔ خود جبرو بھی خوف کی لپیٹ میں تھا۔ وہ علی مرتضیٰ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا وزن ٹنوں کے حساب سے بڑھ گیا تھا۔

محمد علی مرتضیٰ اس کی حالت سے محظوظ ہوتا ہوا بولا۔ ''تم اس قابل نہیں ہو کہ عشق کا بوجھ اٹھا سکو۔ جاؤ کیونکہ تمہاری موت میرے ہاتھوں سے نہیں لکھی۔'' علی مرتضیٰ کا انداز خالصتاً بدمعاشوں والا تھا۔ جبرو پریشان اور کھسیانا ہو کر حیاء کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''ابھی تو میں جا رہا ہوں...... مگر یاد رکھنا...... تمہارے پاؤں میں دوبارہ گھنگھرو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ واپس چلا گیا مگر پھر مڑا اور علی مرتضیٰ کی طرف گن کرتا ہوا بولا۔ ''اپنی یہ پہلی ملاقات تھی بچے! اگلی آخری ہو گی۔''

''اگلی ملاقات نہیں ہو گی بزدل بدمعاش!'' علی مرتضیٰ نے جاتے جاتے بھی اس پر لفظوں کا تیر چلا دیا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔



''ادھر آئیں آپ کو تماشہ دکھاتا ہوں۔'' علی مرتضیٰ نے حیاء سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بالکنی میں لے گیا۔ بارش اپنا زور لگا رہی تھی۔ جبرو نیچے بازار میں پولیس کے نرغے میں گھرا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے تمام ساتھیوں سے اسلحہ چھین کر پولیس نے ان پر اپنا اسلحہ تان رکھا تھا اور ایس پی نے آگے بڑھ کر جبرو کو تھپڑ اور گھونسے مارنا شروع کر دیے۔ پورا بازار اس کی تذلیل دیکھ رہا تھا۔ وہ ایس پی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ مگر ایس پی جو کہ نیا نیا ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ وہ اپنی ٹرانسفر کا غصہ جبرو پر نکال رہا تھا۔ کسی نے مخبری کی تھی کہ جبرو حیاء کے کوٹھے پر ہے اور لاڈو کے بھائیوں نے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہوئی تھی۔ اس طرح اس کی گرفتاری اور پھر ذلالت پر حیاء نے سکون اور شکرانے کی سانس لی۔

اس نے علی مرتضیٰ کو پیار سے گود میں اٹھایا اور اس کے گال پر بوسہ دیا تو وہ ہنستا ہوا بولا۔

''آخری آزمائش جان لیوا بھی ہو سکتی ہے حیاء...... کیا عشق میں جان دو گی؟''

''ہاں!'' وہ مصمم ارادے سے بولی تو وہ خوش ہو گیا دھیرے سے حیاء کی گود سے الگ ہوا اور بولا۔

''مجھے اب جانا ہے۔'' حیاء اداسی سے بولی۔

''تم کون ہو علی مرتضیٰ؟ پھر کب آؤ گے؟''

''میں دوبارہ شاید کبھی نہ آ سکوں...... مگر میں کون ہوں؟ یہ سن کر شاید آپ بے ہوش ہو جائیں۔''

''اچھا!'' حیاء اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ ''میں جبرو نہیں ہوں کہ مجھے ڈراؤ دھمکاؤ۔''

''میں سیّد صبور احمد شاہ صاحب کا خادم ہوں۔'' اس نے بہت احترام سے اپنے مالک کا نام لیا تھا۔

''مگر دیکھو میں بے ہوش تو نہیں ہوئی۔'' حیاء حیران بھی تھی کہ صبور احمد نے کبھی بھی علی مرتضیٰ کا تذکرہ نہ کیا تھا اور نہ ہی کبھی اس نے اس کو حویلی میں دیکھا تھا۔

''وہ انسان کو اپنا غلام نہیں بناتے۔'' محمد علی مرتضیٰ بولا۔ ''انہوں نے میری ڈیوٹی یہی لگائی تھی کہ آپ کے کوٹھے پر جا کر دیکھوں کیا آپ کا ایمان عشق کے قاف سے بدل تو نہیں گیا۔''

''اب تو عشق کا قاف میرا پیراہن ہے اور میں کبھی بھی بے پیراہن ہو کر بے حیاء نہیں

بنوں گی۔"

"اللہ حافظ!" وہ سیڑھیاں اتر گیا تو حیاء فوراً بالکنی کی طرف گئی۔ مگر کئی منٹ گزرنے کے بعد بھی وہ نظر نہ آیا۔ وہ بھاگ کر سیڑھیوں میں گئی مگر وہ دکھائی نہ دیا تو حیاء حیرت میں ڈوبی ہوئی واپس قالین پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کی آخری باتوں پر غور کرنے لگی۔

"وہ سید صبور احمد شاہ صاحب کا غلام ہے...... اور یہ کہ وہ انسانوں کو اپنا غلام نہیں بناتے۔" یہ سوچتے ہی وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ کیا علی مرتضیٰ انسان کا بچہ نہ تھا۔ وہ جن زادہ تھا...... وہ جن زادہ تھا؟

☆=======☆=======☆

حاکم علی شاہ کے کہنے پر احمد سبحانی پہلے دن آفس آیا تھا۔ تمام عملہ اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ سعید علی کس جگہ بیٹھتے ہیں۔ وہ ہونقوں کی طرح ورکرز کو اپنے کام میں جتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ سعید علی نے کبھی بھی گھر میں تھکن یا بیزاری کا اظہار نہ کیا تھا۔ وہ اتنے ورکرز کو اکیلے ہی ہینڈل کرتے تھے۔

"مجھے سعید علی صاحب سے ملنا ہے۔" اس نے کمپیوٹر پر مصروف ایک ورکر سے پوچھا تو وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "آپ نے وقت لیا ہے ان سے؟"

"جی نہیں...... مجھے ان سے وقت لینے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی گھر سے نکل آئے تھے۔" احمد سبحانی نے کہا تو وہ ناسمجھی سے بولا۔ "وہ وقت کے بغیر کسی سے نہیں ملتے۔"

"آپ مجھے یہ بتا دیں کہ وہ کہاں بیٹھتے ہیں۔ میں ان سے خود ہی مل لوں گا۔" احمد سبحانی اس تمام کام کا بلاشرکت غیرے مالک تھا مگر ورکر اس بات سے بے خبر تھا اور احمد سبحانی کو اپنے اوپر بھی غصہ آنے لگا کہ وہ آج سے پہلے کبھی آفس نہیں آیا۔ مگر اسے مزید تنگ و دو نہ کرنا پڑی کہ پاس سے گزرنے والے ایک آدمی کو اس ورکر نے آواز دے کر کہا کہ ان کو سعید علی صاحب سے ملوا دو۔ وہ احمد سبحانی کو لے کر ایک طویل راہداری میں چلنے لگا۔ بہت ہی شاندار سیٹ اَپ تھا۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا کہ آسائش بھرا کام چھوڑ کر اس نے شراب و شباب اور گمراہی میں وقت ضائع کر دیا۔

وہ چلتے ہوئے ایک دروازے پر رک گئے۔ اس آدمی نے احمد سبحانی سے کہا کہ آپ باہر ہی کھڑے ہو جائیں۔ صاحب میٹنگ میں ہوئے تو کچھ دیر بعد مل لیں گے۔ یہ کہتے



ہوئے خود اندر چلا گیا مگر وہ حیران رہ گیا کہ احمد سبحانی بھی اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا ہے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سعید علی بیٹے کو زندگی میں پہلی بار اس جگہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تو ملازم گھبرا گیا۔

"میں نے ان کو روکنے کی کوشش کی تھی سر...... مگر یہ میرے پیچھے ہی......"

"یہ اس کمپنی کے مالک ہیں...... اور میرا اکلوتا بیٹا احمد سبحانی ہے۔" سعید علی کی زبانی سن کر ملازم کی اوپر والی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ "جاؤ جا کر سارے آفس میں بتا دو کہ احمد سبحانی ہی آپ کا مالک ہے۔ یعنی اس کام کا۔"

"جی سر! جی سر!" وہ جانے لگا تو احمد سبحانی سے "آئی ایم سوری سر" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

سعید علی حیران تھے وہ احمد سبحانی کو ہاتھ سے پکڑ کر کرسی تک لائے اور اس کرسی پر بٹھا دیا جس پر چند لمحے پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔ "آج تم نے میرا خواب پورا کر دیا۔" سعید علی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

"میں شرمندہ ہوں پاپا...... لیکن اب میں آ گیا ہوں...... آپ آرام کریں گے۔" احمد سبحانی نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے تو سعید علی نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "اسی پل کا مجھے انتظار تھا۔ اب سکون سے مر سکوں گا۔"

آپ ایسا کہیں گے تو میں پھر کبھی آفس نہیں آؤں گا۔" احمد سبحانی نے بھرپور گلہ کیا تو سعید علی مسکرانے لگے۔

"آئی ایم سوری بیٹا!" سعید علی نے اسے ایک بار پھر کرسی پر بٹھا دیا اور خود ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ "آپ مجھے ٹرینڈ کریں گے اور میں اس کام کو ان شاء اللہ عروج تک پہنچاؤں گا۔" احمد سبحانی کا پُرعزم لہجہ اس بات کا ترجمان تھا کہ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔

"میں ذرا میٹنگ روم میں جا رہا ہوں...... ایک گھنٹے بعد ملاقات ہو گی۔" سعید علی اٹھتے ہوئے بولے۔ "لندن سے ایک پارٹی آئی ہے ان سے کاروباری ڈیل ہو گی۔ میں تمہارے لیے چائے بھیجتا ہوں۔" انہوں نے آگے بڑھ کر احمد سبحانی کی پیشانی پر بوسہ دیا اور باہر نکل گئے۔

احمد سبحانی اس شاندار آفس کو تعریفی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شیشے کا بہترین ٹیبل،

کرسیاں اور دیگر فرنیچر پردے، کارپٹ وغیرہ اور پھر سلیقے سے ان کی ڈیکوریشن...... ہر اک چیز اپنی جگہ پر بالکل فٹ تھی۔

ٹیبل پر پڑا ہوا تازہ اخبار اسے اپنی طرف متوجہ کر گیا۔ اس نے کبھی بھی اخبار نہ پڑھا تھا مگر آج اس کے فرنٹ پیج پر چھپنے والی خبر اور تصویر کو دیکھ کر وہ چونک پڑا اور پوری خبر پڑھنے لگا۔ ایک تصویر تھی جس میں پولیس والا جبرو بدمعاش کو تھپڑوں سے پیٹ رہا تھا۔ تصویر بارش میں لی گئی تھی مگر ان دونوں کے چہرے واضح تھے اور پھر بازارِ حُسن کا ذکر بھی اس کی دلچسپی کا باعث بنا تھا۔

مشہور بدمعاش اور قاتل جبرو کو ایس پی میاں عبدالغفار نے گرفتار کر لیا۔ یہ خبر کا عنوان تھا اور باقی خبر بھی اس فقرے کی تشریح تھی۔ مگر اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ جبرو کو حیاء نامی طوائف کے کوٹھے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ حیاء کا نام پڑھ کر اس کا چونکنا اور پریشان ہونا فطری عمل تھا مگر جبرو کی تصویر اس کی نگاہوں میں کھٹکنے لگی تھی کیونکہ وہ اس نوجوان کی تصویر فیضان پور گاؤں کے چوہدری خدابخش کے ساتھ دیکھ چکا تھا اور چوہدری خدابخش نے تعارف کروایا تھا کہ یہ اس کا چھوٹا بیٹا ہے۔ "جبران چوہدری" یہ شہر میں ہی کوئی کام کرتا ہے۔ خبر کی پوری تفصیل کچھ یوں تھی کہ حیاء نامی طوائف نے اپنے کام سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے کوٹھے پر مدرسہ بنانے کا اعلان کیا تو اس بازار کی یونین نے جبرو نامی بدمعاش کی مدد لی۔ لاڈو کو حیاء کے نئے کام میں ہاتھ بٹانے اور مددگار ہونے پر جبرو نے قتل کر دیا اور پھر حیاء کو دوبارہ ناچنے اور کوٹھا بطور طوائف آباد کرنے پر مجبور کیا تھا۔ پولیس کے چھاپے کے دوران ایماندار اور فرض شناس ایس پی میاں عبدالغفار نے جبران عرف جبرو کو گرفتار کر لیا۔

اس نے فوراً کاغذ پر سعید علی کے نام پیغام چھوڑا اور اخبار لیتا ہوا باہر نکلا تو تمام ورکرز اسے سلام کرنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ وہ ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا آفس کی عمارت سے باہر نکل گیا۔

اس کی گاڑی سیدھی جا کر صبور احمد کی حویلی کے سامنے رکی۔ وہ چند لمحوں بعد ہی صبور احمد سے اس تصویر اور خبر کے بارے میں تبصرہ کر رہا تھا۔

"تمہیں یاد ہے۔ واپسی پر بابو کوچوان نے کیا کہا تھا؟" صبور احمد جبران چوہدری عرف جبرو کی تصویر دیکھتے ہوئے احمد سجانی سے مخاطب ہوئے تو وہ مؤدب انداز میں بولا۔ "جی شاہ جی! مجھے یاد ہے، بابو کوچوان نے کہا تھا کہ چوہدری خدابخش کی حویلی میں موجود گھوڑا اور اس



کا سوار خیراں اور کنگن کے سلسلہ میں سرفہرست تھا۔ اب تمام بات میری سمجھ میں آ گئی ہے شاہ جی!"

"یعنی کہ خیراں کو سہاگن بننے سے پہلے ہی اس کی عزت تار تار کر کے بیوگی کا کفن پہنانے والا چوہدری جبران ہے؟" صبور احمد درد سے بولے تھے۔ احمد سجانی ان کا دُکھ سمجھتا تھا۔ "جی شاہ جی! اور کنگن کا قاتل بھی۔"

"اب تو اس واردات کی کڑیاں ملتی جا رہی ہیں۔" صبور احمد تحمل بھرے انداز میں بولے۔

"اور شاہ جی! کنگنی کا بھی میں نے بتایا تھا کہ وہ شہر میں ہمارے ساتھ ہی آ گئی ہے۔" احمد سجانی بولا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی شاہ جی! میری اس الجھن کو تو دور کریں۔" احمد سجانی جھلائے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ "کنگنی ہر رات کو گاؤں میں جا جا کر کنگن کے قاتل کو تلاش کرتی تھی۔ مگر کسی کو بھی نقصان نہ پہنچاتی تھی۔ کیا وہ جانتی تھی کہ گاؤں والوں میں کنگن کا قاتل نہیں ہے۔ وہ کیسے پہچانے گی کہ جبران یا کوئی اور اس کے کنگن کا قاتل ہے۔"

"کنگنی کل رات سے میرے پاس ہے۔" صبور احمد کے انکشاف پر وہ حیران رہ گیا۔

"سانپوں کا انتقام مشہور ہے۔ کیونکہ جوڑے میں سے جب ایک سانپ کو کوئی مار دیتا ہے تو مرنے والا سانپ اپنے قاتل کی تصویر اپنی آنکھوں میں بسا لیتا ہے۔ یہ قدرتی طور پر کیمرہ ہوتا ہے جو سانپ کے دماغ کے ساتھ کام کرتا ہے اور پھر دوسرا ساتھی مرنے والے سانپ کی آنکھوں سے وہ تصویر اپنے دماغ میں بسا کر اس کے قاتل کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ صحیح قاتل سامنے آنے پر وہ اپنا انتقام پورا کر لیتا ہے۔" احمد سجانی سانپوں کے انتقام کی تفصیل سن کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ "مگر اب کنگنی کو کیسے بتایا جائے کہ جبران ہی کنگن کا قاتل ہے؟" اس نے صبور احمد سے سوال کیا تو وہ کوئی جواب دینے کی بجائے اندر کی جانب چلے گئے۔ ان کا یہ انداز احمد سجانی کے لیے حیران کن تھا۔ وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ اور بازو پر کنگنی نے کنڈلی ماری ہوئی تھی۔ اس کا پھن کھڑا تھا اور وہ پُرسکون انداز میں صبور احمد کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی تھی۔ "اس کا تجربہ ابھی ہو جائے گا کہ چوہدری جبران کنگن کا قاتل ہے یا نہیں۔" انہوں نے کنگنی کو زمین پر چھوڑ دیا اور اخبار اس کے سامنے کرتے ہوئے بولے۔ "اس تصویر میں تمہارے اور میرے ساتھی کنگن کا قاتل ہے یا نہیں۔ اسے پہچانو کنگنی۔" صبور احمد کو اللہ تعالیٰ

نے جو انعام بخشا تھا وہ کام کرنے لگا اور کنگنی پھن پھیلا کرتن گئی۔ وہ اخبار کی طرف مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے شعور نے فوٹو کی میچنگ کی گھنٹی بجائی تو اس نے نفرت اور غصے سے اخبار پر ڈس لیا۔ اس کے اس طرح اچانک ڈنگ مارنے سے احمد سبحانی خوفزدہ ہو کر چند قدم پیچھے جا گرا۔ کیونکہ اخبار کو آگ لگ گئی تھی۔ کنگنی زمین پر بے چینی اور بے قراری کی کیفیت میں لوٹنے لگی تھی۔ وہ التجائیہ نظروں سے صبور احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''چوہدری جبران! تم نے کنگن اور خیراں کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے کنگنی کو پیار سے پکڑا اور اس کے پھن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''تم اپنا خیال رکھنا۔ کیونکہ وہ پولیس کی حراست میں ہے۔ مناسب وقت کا انتظار کرنا...... اور مناسب وقت تمہیں اللہ کی ذات ضرور مہیا کرے گی...... تم جا کر اپنا انتقام لے سکتی ہو۔'' انہوں نے کنگنی کو زمین پر چھوڑا تو اس نے اپنا پھن پہلے صبور احمد اور پھر احمد سبحانی کے قدموں میں رکھ دیا۔ احمد سبحانی نے بھی صبور احمد کی تقلید کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ زندگی میں پہلی بار سانپ کے پھن پر رکھا تو لرزہ نمایاں تھا۔

''کنگنی!'' صبور احمد نے جاتی ہوئی کنگنی کو دل گیر آواز میں کہا۔ ''شاید اب کبھی بھی اپنی ملاقات نہ ہو سکے۔'' احمد سبحانی ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ کنگنی کی آنکھیں بھی جھلمل کر رہی تھیں۔ بچپن کا ساتھ اس طرح الگ ہو رہا تھا کہ کسی بھی ساتھی کو دوبارہ ملنے کی امید نہ تھی۔

کنگنی اندر کی جانب چلی گئی۔ احمد سبحانی جانتا تھا کہ وہ اب رات کو اپنا سفر جاری کرے گی اور ہر صورت میں جبرو کی موت بنے گی۔

''شاہ جی! مجھے اجازت دیجیے۔'' احمد سبحانی نے اجازت طلب کی تو روتی ہوئی آنکھوں سے صبور احمد بولے۔ ''آقائے دو جہاں کی اُمت پر بڑا کٹھن وقت آیا ہے۔ عاشقِ رسول کم اور گستاخِ رسول بڑھتے جا رہے ہیں...... احمد سبحانی! تیار رہنا۔'' یہ کہہ کر وہ حیران احمد سبحانی کو چھوڑ کر اندر کی جانب چلے گئے۔

☆=======☆=======☆

شین کو مست اور وجد کھائی ہوئی ہوا نے خوش آمدید کہا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ شہر مقدس پہنچنے والا ہے۔ یا پھر ایک آدھ ملک کی سرحد اور عبور کرنا پڑے گی۔ اس کی پرواز میں تیزی اور جولانی ہو گئی تھی۔ وہ پیچھے جن جنگلات اور ملکوں سے ہوتا ہوا آیا تھا وہاں اس کی ملاقات سب



سے پہلے عثمان غنی سے ہوئی تھی۔ جو عشق کے امتحان میں بوٹی لگاتے ہوئے پکڑے جانے کی پاداش میں کلاس روم سے نکال دیئے گئے تھے۔

کالی اور تیز و تند آندھی ان کی وجہ سے شین کو چھوڑ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے شین کو شہر امن کی جانب بڑھنے کا موقع فراہم کیا تو وہ عشق کی شہادت دینے کے لیے آگے بڑھتا ہوا مختلف ممالک کے شہر اور جنگلات کی پرواز کرتا ہوا ایک ایسے جنگل میں پہنچا جس کے ایک درخت پر پناہ لی تو اس کی ملاقات خوفناک سانپ سے ہوگئی۔ اس نے بھی تاجدار مدینہ کا نام مبارک سن کر اپنا پھن سرنگوں کر لیا تھا۔

پھر ایک بار پھر سیاہ آندھی نے اس کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنے کی جرأت اور کوشش کی تو اسے وہ درخت ملا جو کبھی شہر مدینہ میں چھوٹا سا پودا تھا اور اسے ایک تاجر خرید کر لایا اور مرجھا جانے کے خوف سے راستہ میں ہی لگا گیا۔ وہ درخت بھی عاشقِ رسول تھا۔ اس نے شین کو مقدس جانا کہ وہ شہر مدینہ کا مسافر اور محمد عربی ﷺ کا مہمان ہے۔ اس نے آندھی کی خوفناکی اور اپنی تباہی کی فکر نہ کی اور تیز آندھی سے متھا لگا لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کرتے ہوئے اسے امداد بہم پہنچائی تھی۔ کیونکہ اس کی نیت تھی کہ وہ پُرامن شہر کا مسافر ضرور بنے گا اور اللہ تعالیٰ نے اولیاء کرام کے مزارات کی حرمت اور پاکیزگی پر اپنے خاندان سے ٹکر لینے پر طاقت اور حوصلہ بخشا تھا۔ اسے اولیاء کرام کے مزارات کا احترام کرنے پر سادات گھرانے سے عشق کے شین کی سند ملی تھی۔ وہ جس کا حقدار بن کر دکھانا چاہتا تھا۔

''اس فضا میں نئے لگتے ہو دوست؟'' اس کے پہلو سے آواز ابھری تو وہ آواز دے کر مخاطب کرنے والے کو دیکھ کر روح کی گہرائی سے کانپ گیا۔ وہ ایک شکرا تھا۔ عربی ریاستوں میں اُڑنے والے خونخوار بازوں میں سے ایک باز تھا جو اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ پرواز بھی کر رہا تھا۔

''میں پردیسی ہوں۔'' شین معصومیت سے بولا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور بولا۔

''پردیسی ہو...... اسی لیے اب تک پرواز پر ہو...... ورنہ اس دیس کے تمام پرندے مجھے جانتے ہیں اور میری پرواز کے وقت باہر نہیں نکلتے۔'' اس نے اس فضا پر اپنی چودھراہٹ کا قصہ شین کو سنایا تو وہ مزید کانپ گیا۔ ''مجھے اس علاقہ کے اصول اور جناب کی اس وقت فضا میں ٹہلنے کے وقت کا معلوم نہ تھا۔ اسی لیے غلطی کر بیٹھا۔'' شین چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس

عذاب سے جان چھوٹ جائے تاکہ وہ مدینہ کی فضائی حدود میں داخل ہو سکے۔

''ویسے کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟'' باز کے منہ میں اس موٹے تازے کبوتر کو دیکھ کر پانی ہی پانی بھر آیا تھا۔

''ایک پاک سرزمین سے آ رہا ہوں اور اس کائنات کی پاک ترین سرزمین پر سجدہ کرنے جا رہا ہوں۔'' شین کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی اب اس کا مسلسل بولنے سے سانس بھی پھولنے لگا تھا۔

''ذرا میں بھی تو سنوں! سرکار اس کائنات کی کس زمین کو پاک ترین زمین کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں؟'' اس کی بات میں طنز کا منظر نمایاں تھا۔ شین کو اپنی جان بچانے کے لیے حوصلہ کرنا تھا۔

''میں سعودی عرب بیت اللہ کی بات کر رہا تھا۔ پاک ترین سرزمین اس لیے کہا کہ آقائے دو جہاں ﷺ اور محبوب ﷺ رب کائنات کا مبارک وجود اس سرزمین پر ہی آمنہ بی بی کی کوکھ سے نزول میں آیا تھا اور دوسرا جواب یہ کہ کل کائنات کے مسلمان مرد و عورتیں اس جگہ آ کر بیت اللہ کے سامنے کھڑے اور سجدہ ریز ہو کر رب واحد کی وحدانیت کے کلمہ کا پرچار کرتے ہیں۔'' اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اسے ایک خیال ذہن میں آیا تو اس نے اپنی پرواز ذرا کم بلندی پر کر دی۔ باز کو بھی اس کے ساتھ نیچے آنا پڑا۔ ''یعنی کہ تم اللہ کے مہمان ہو؟'' وہ درشت لہجہ اختیار کرتا ہوا بولا۔

''الحمد للہ! میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مہمان بھی ہوں اور غلام بھی۔'' شین کا لہجہ بدستور پُرتحمل تھا اور اس بات کے ساتھ ہی اس کی پرواز مزید نیچی ہو گئی۔

''مگر میں تمہیں اللہ کے گھر تک نہیں پہنچنے دوں گا۔'' یک دم اس کی شکل خوفناک ہو گئی۔ وہ شین پر جھپٹا مگر شین اس کا وار بچا گیا۔ شین مزید نیچے ہی نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بات باز کو ناگوار گزر رہی تھی۔ کیونکہ اس کی نسل نے کبھی بھی انتہائی نچلی پرواز نہ کی تھی اور کبھی بھی زمین پر گرا ہوا شکار نہ اٹھایا تھا۔ وہ ایک بار پھر شین پر جھپٹا تو اس بار اس کا ایک پنجہ شین کے ایک پر کو زخمی کر گیا۔ وہ درد کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔

وہ باز کا زبردست وار سہہ کر مزید نچلی فضا تک پہنچ گیا تھا۔ تقدیر کو اس کی حکمتِ عملی پسند آ گئی تھی۔ ہوا یوں کہ باز جیسے ہی اس پر تیسرا وار کرنے کے لیے جھپٹا زمین پر کھڑے شکاری کی بندوق نے آگ اگلی جو باز کا نشانہ لیتی ہوئی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ آہ



بھی نہ کر سکا اور زمین بوس ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان کے کاری وار سے بچا لیا تھا۔ اس کا زخمی پَر اس کی پرواز میں رکاوٹ بننے لگا تھا۔ وہ گرتا پڑتا ایک مسجد کے صحن میں جا کر گر گیا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

☆=======☆=======☆

احمد سبحانی اب باقاعدگی سے آفس آ رہا تھا۔ اس نے فاطمہ سے قرآن کریم پڑھنا سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ سعید علی نے آفس کا کام اسے سکھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ پانچ وقت کی نماز باقاعدہ پڑھنے لگا تھا۔ وہ بلا ناغہ اخبار کا مطالعہ اپنا معمول بنا چکا تھا۔ شراب و شباب کی محفلیں چھوڑ کر اس نے سادات گھرانے کی چوکھٹ کو تھام لیا تھا۔

وہ صبور احمد کا دیا ہوا سبق اسے روزانہ سنانے جاتا تھا۔ اس دن بھی وہ بعد از نماز مغرب ان کی حویلی کی جانب ہی جا رہا تھا کہ کسی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے پہلے تو غور نہ کیا مگر پھر انسانی ہمدردی کی بنا پر بریک لگا کر گاڑی ریورس کرتا ہوا لفٹ لینے والے کے پاس جا کر روک دی۔

اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ کوئی ہیجڑہ ہے۔ احمد سبحانی کو خود پر غصہ آنے لگا۔ ہیجڑے نے موقع ملتے ہی گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''مجھے بھی شاہ صاحب کی حویلی اتار دینا۔'' گاڑی چلنے سے پہلے ہی رک گئی تھی۔ احمد سبحانی حیرت و استعجاب میں مبتلا اس ہیجڑے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ یہ ہیجڑہ کون تھا اور پھر اسے کیسے پتہ کہ وہ شاہ صاحب کی حویلی کی طرف ہی جا رہا ہے۔ اس نے اپنی حیرت کی وضاحت چاہنے کے لیے پوچھا۔

''کون سے شاہ صاحب؟'' ہیجڑے نے جس کرب سے اس کی طرف دیکھا وہ بھول نہ سکتا تھا۔

''سید حاکم علی شاہ صاحب اور صبور احمد چھوٹے شاہ جی۔'' اب تو اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ گاڑی منزل کی جانب جانے لگی تو ہیجڑے نے گفتگو شروع کر دی۔ احمد سبحانی اس پُراسرار ہیجڑے سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کی باتوں کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ ایک تو ان کی منزل ایک تھی اور دوسرا وہ ہمسفر بھی تھے اور غالباً پیر ''بھائی'' بھی۔ یعنی ایک ہی

پیر کے مریدین تھے۔

''حج کرنے کب جا رہے ہو احمد سبحانی!'' اس نے پہلی بار اس کو نام سے پکارا تو وہ واقعی ہل کر رہ گیا۔ کیونکہ احمد سبحانی کو یہاں تک یاد تھا وہ اس سے پہلے کبھی بھی اس ہیجڑے سے نہ ملا تھا۔ اس نے اسی کا سوال اس سے کر دیا مگر لہجہ ذرا تلخ تھا۔ ''تم کب جا رہے ہو؟ اور یہ تم سے کس نے کہا کہ میں حج کرنے جا رہا ہوں۔''

''مجھے مرشد سرکار نے فرمایا تھا کہ احمد سبحانی اگلے ماہ حج پر تشریف لے جائے گا۔'' اس کی زبانی سن کر وہ حیران ہو گیا۔ کیونکہ اس کا کوئی پروگرام نہ تھا اور نہ ہی کبھی صبور احمد نے اس سے بات کی تھی۔ مگر ایک ہیجڑے کو اس بات کا علم تھا۔ وہ کون تھا؟

''رہ گئی میری بات...... میں تو مرشد سرکار کو دیکھ لوں تو میری آنکھوں کا حج ہوتا ہے۔ وہ کیا خوب فرما گئے ہیں۔ حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ۔

''مرشد دا دیدار اے باہو
مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہو''

اس نے یہ شعر وجدانی کیفیت میں پڑھا تھا۔ ''میرا نام خادم حسین ہے۔'' وہ پھر بولا۔ ''کیا خوب نام ہے۔ مرشد سرکار نے رکھا تھا۔ خادم حسین یعنی حسین علیہ السلام کا خادم...... کاش میں ان کا حقیقی خادم ہو سکتا۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ مرشد کی حویلی پہنچ گئے تھے۔ گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہونے لگے تو خادم حسین نے اپنا جوتا اتار کر باہر ہی رکھ دیا جبکہ احمد سبحانی اپنا جوتا اتار کر اندر لے آیا۔

صبور احمد آسمان کی جانب منہ کر کے کچھ بول رہے تھے۔ خادم حسین اور احمد سبحانی چپکے سے ان کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ صبور احمد کی آہوں سے بھری سانسیں خارج ہو رہی تھیں۔

''اب تو میں نے عشق پورا کر دیا ہے...... اب تو پاس بلا لو۔'' صبور احمد کی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

احمد سبحانی ان کی بات سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ جبکہ خادم حسین پُرسکون انداز میں دو زانو بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ صبور احمد اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو عبادت کے طور پر محسوس کرتا ہوا باادب اور باملاحظہ ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔

''میرے اللہ! میں نے اسے تجھ سے مانگا تھا اور تم نے اسے اپنے محبوب کی عظمت کے لیے چن کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میرے اللہ کسی بھی امتحان سے پہلے مجھے اپنی بارگاہ



میں بلا لے۔ اس گندی دنیا سے مجھے اٹھا لے۔'' صبور احمد کی گریہ زاری سے وہ دونوں بھی دل گیر ہو گئے تھے۔

صبور احمد کو یک دم ان کی آمد کا احساس ہوا تو وہ اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے ان کی جانب متوجہ ہوئے۔ ''کیسے ہو احمد سبحانی! اور خادم حسین...... تم کیسے راستہ بھول پڑے؟''

خادم حسین نے اپنا نام سن کر آنکھیں کھولیں اور عقیدت سے صبور احمد کے ہاتھ چومنے شروع کر دیے۔

''سرکار! مجھے تو احمد سبحانی کی گاڑی نظر آ گئی تھی...... یہ ان کی مہربانی ہے مجھے آپ تک لے آئے۔''

''تمہیں تو مجھ تک لے آئے اور خود بہت آگے پہنچ گئے ہیں۔'' صبور احمد بڑبڑائے مگر احمد سبحانی نے ان کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ ''میں سمجھا نہیں شاہ جی!''

''یہ خادم حسین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت علم دیا ہے۔ یہ بھی ہمارا مرید ہے۔'' صبور احمد بات کو پلٹ گئے تھے۔ ''اچھا احمد سبحانی! اب یہ بتاؤ کہ سبق اچھی طرح یاد ہے۔''

''جی شاہ جی! آپ کی عنایت ہے۔ اللہ کی رحمت سے مجھے اس کا نام ''یاد'' ہے۔'' احمد سبحانی ادب سے بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ عشق کا دوسرا سبق یاد کرنا شروع کر دو۔'' احمد سبحانی دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''الف اللہ...... میم محمد ﷺ۔ میم محمد ﷺ۔''

احمد سبحانی نے ان کے کہے ہوئے سبق کو یاد کرنا شروع کر دیا تو صبور احمد بولے۔

''حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کا مقدس فرمان ہے کہ جو شخص ایک بار سبحان اللہ کہے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس شخص کے نام کا ایک درخت لگا دے گا۔ جو شخص میرا نام سنے اور مجھ پر درود نہ پڑھے وہ جنت کا راستہ بھول جائے گا...... سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ ایک بار محمد ﷺ پر درود پڑھنے سے جنت کا راستہ مل جاتا ہے۔ اسی لیے تمہیں جو سبق دیا ہے۔ اسے پوری طرح ادا کرنا شرط ہے۔ میم محمد ﷺ۔'' صبور احمد کی زبانی احادیث سن کر احمد سبحانی اور بھی محبت سے اس سبق کو یاد کرنے لگا۔

''خادم حسین! تم نے اپنا کام شروع کیا یا ابھی تک یونہی گھوم رہے ہو؟'' صبور احمد خادم حسین سے مخاطب ہوئے تو وہ عاجزی سے بولا۔

"اللہ کی طرف سے کوئی بھی رہنمائی نہ ملنے کی بنا پر میں ابھی تک اندھا ہوں شاہ جی!"

"تو پھر کام کیسے بنے گا؟ کیا ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم حکم الٰہی کی اچھی طرح تعمیل نہیں کر سکتے؟"

"نہیں شاہ جی! میں تو کم علم اور جاہل ہوں۔ آج جو کچھ بھی ہوں آپ کے قدموں کی خاک کے طفیل ہی ہوں۔ میرا خیال ہے جی کہ ابھی پہلے۔ عین، شین، قاف کو مکمل ہو کر سرخرو ہونے تک ہمیں اللہ کی طرف سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔" خادم حسین عاجز ہی عاجز تھا۔

"مگر وہ بڑا کریم ہے۔ اس نے مجھے کچھ اشارے دیئے ہیں۔ کہ عین، شین، قاف کون کون اور کہاں کہاں سے ہوں گے...... تمہاری بات ٹھیک ہے...... ابھی پہلا کام تو راستے میں ہی پڑا ہے۔ مکمل ہو کر سرخرو ہونے کے لیے آخری امتحان کا انتظار کرنا ہوگا۔" صبور احمد سر ہلاتے ہوئے بولے تھے۔

احمد سبحانی کی پوری توجہ اپنے سبق کی طرف تھی مگر اس کے کانوں میں ان دونوں کی گفتگو بھی پڑ رہی تھی۔ عشق تو مکمل ہو گیا تھا پھر یہ صبور احمد کس عشق کی بات کر رہے تھے؟ وہ نا سمجھنے والے انداز میں اپنا سبق۔ "میم محمد ﷺ" پڑھتا رہا۔

"تمہیں گھر جانے کی اجازت ہے احمد سبحانی!" صبور احمد کی آواز آئی تو وہ احترام سے اٹھا اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر آنے لگا تو صبور احمد بولے۔ "اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتے رہنا۔" وہ "جی شاہ جی" کہتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی گھر کی جانب چل پڑی۔

اس کے کانوں میں خادم حسین کی آواز گونج رہی تھی۔ "اللہ بڑا کریم ہے۔ اس نے مجھے کچھ اشارے دیئے ہیں کہ عین، شین، قاف کون کون اور کہاں کہاں سے ہوں گے۔" کیا اور بھی کوئی ہے؟ وہ یہ سوچ کر خود کو خود ہی ملامت کرنے لگا۔ وہ بھلا کون ہوتا ہے کہ اللہ کے کاموں میں دخل اندازی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے صبور احمد جیسے اپنے بندوں کو چن رکھا ہے۔ پھر وہ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی نشان دہی پر چنتے ہیں اور پھر عشقِ الٰہی کا پرچار ہوتا تھا۔

یہ نظام بڑا طویل تھا مگر جو خالق کائنات دنیا کی تمام مخلوقات کا نظام چلا رہا تھا اس کے لیے یہ کام کوئی بھی مشکل نہ تھا۔ تبھی تو احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک ہر کام پہنچ رہا تھا۔ ان کے بعد کسی اور کی باری آنے والی تھی۔ مگر ابھی اس کا امتحان مقصود تھا۔ شاید آخری امتحان؟

اگلے روز ہی اس کے عشق کو سرخرو کرنے یا راہ فرار اختیار کرنے کی باری آ گئی تھی۔

اخبار کی شہ سرخیاں اس معاملے کو مذہبی طور پر شائع کر رہی تھیں اور خبر اُمت محمدی ﷺ کی



غیرت کو للکار رہی تھی۔

"ڈنمارک میں ایک گستاخ رسول نے نبی معظم، شفیع امم کی ذاتِ مقدس کی تصاویر بنا کر ان کو ملک بھر میں پھیلا دیا تھا۔ اس تصویر میں محسن کائنات، باعث وجہ تخلیق کائنات کو نعوذ باللہ ایک کارٹون کی شکل میں دکھایا گیا تھا جس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ قوم کو تلوار کے زور پر اسلام قبول کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس طرح کے کارٹون رنگین کاغذ پر پرنٹ کروا کے ڈنمارک کے سارے شہروں اور گاؤں میں تقسیم کیے تھے۔ لوگ نفرت سے ان پوسٹرز، پمفلٹ پر تھوک رہے تھے۔ اس کارٹون کو بنانے والا ڈنمارک کا امیر ترین باشندہ ڈیوڈ تھامن تھا۔ اس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کی تضحیک کرنے کے لیے رحمۃ للعالمین کی ذاتِ اطہر کو نشانہ بنایا تھا اور اسے اس حرکت پر ڈنمارک حکومت نے انعامات سے نوازا تھا۔

مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ جلسے جلوسوں نے عقیدت و محبت کی شکل اختیار کرتے ہوئے انسانوں کے سمندر پیدا کر دیئے تھے۔ اخبارات، ٹیلی ویژن چینلوں پر اس گستاخ رسول کی تصویر بار بار دکھائی جا رہی تھی۔ اس کی زندگی کے بارے میں مکمل تفاصیل بھی ٹی وی چینلو کی سکرینوں پر دکھائی جا رہی تھیں۔

احمد سبحانی اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ پورا عملہ بھی غم و غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ کام چھوڑ کر بھی لوگ محبوب کائنات ﷺ کی محبت و عظمت کے گن گا رہے تھے۔

احمد سبحانی کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ تو سادات گھرانے کی پاکیزگی اور عظمت پر جان قربان کرنے کے لیے اپنا تن من دھن بھی نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ اس نے حیاء کو تھپڑ اسی لیے مارا تھا کہ اس نے صبور احمد کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اس کے ایک تھپڑ نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ عشق نے اسے سادات گھرانے کی بدولت عین کی سند عطا کر دی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اس سند کا صحیح جانشین بن کر دکھائے اور صبور احمد کی چنی ہوئی "عین" کا حقدار بن کر یہ ثابت کرے وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ مقدس کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔

شہر میں جگہ جگہ ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔ عشاقانِ رسول کے جلوس لاکھوں لوگوں کی شکل میں شہر کی گلیوں اور بازاروں میں نکلے تو تعداد بڑھتی ہوئی اَن گنت ہو گئی۔

اس نے گھر میں کسی کو بھی بتائے بغیر ورلڈ ٹور کے لیے اپنا پاسپورٹ بھجوا دیا۔ وہ پہلے بھی دنیا کی سیر کر چکا تھا اور پھر باپ کی فرم، بینک بیلنس اور سٹیٹمنٹ کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس

کے پاسپورٹ پر سفارت خانوں نے کام شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کی بھوک پیاس ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ قرآن کریم کو سینے سے لگا کر گھنٹوں روتا رہتا۔ مسجد نبوی ﷺ کی تصاویر کو دیکھ دیکھ کر چومتا رہتا تھا۔ گھر والے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت و حالت سے باخبر اور پریشان تھے۔ وہ راتوں کو اٹھ کر صبور احمد کا دیا ہوا سبق ''میم محمد ﷺ'' اونچی آواز میں پڑھنے لگتا۔ بھرائی ہوئی آواز اور اس کی چیخیں گھر والوں کو پریشان کر دیتیں۔

فاطمہ اسے قرآن پڑھ کر سناتی تو وہ سجدہ میں گر کر رونے لگتا اور کافی کافی دیر اسی حالت میں پڑا رہتا۔

سعید علی اس کی دن بدن بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور حالت کو دیکھ کر اس وقت سیّد حاکم علی شاہ اور صبور احمد کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہم نے کہا نہیں تھا کہ پہلا بیٹا نہ مانگو۔'' سعید علی صبور احمد کی طرف دیکھتے رہے۔

''سعید علی! وہ تمہارا نہ تھا۔ تمہاری ذہنی آسودگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے تمہاری بیوی کی کوکھ سے جنم دیا تھا۔ وہ ہمارا تھا۔ ہمیشہ سے...... اب تمہیں معلوم ہے وہ کیا سوچ رہا ہے؟ وہ دیوانہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کی آواز میں سوز اور چیخوں میں دیوانگی کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟''

صبور احمد خاموش ہو کر سعید علی کی طرف دیکھنے لگے۔ جو حزن و ملال کی بے ساکت مورتی میں تبدیل ہو چکے لگتے تھے۔ ان کے آنسوں گالوں پر لکیریں بنا بنا کر اپنا راستہ ان کے گریبان تک پہنچنے میں آسان بنا چکے تھے۔

''تمہیں مبارک باد دیتا ہوں سعید علی کہ اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے مسلمانوں میں سے تمہارے بیٹے احمد سبحانی کو چنا ہے۔'' سعید علی کی آنکھیں جلتے ہوئے آنسوؤں سے جگنے لگیں۔ وہ صبور احمد کی طرف بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میں سمجھا نہیں شاہ جی!''

''کُنْ فَیَکُوْن۔ یہ وہ الفاظ ہیں اللہ تعالیٰ ادا کرے تو وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جس کے ہونے کا وہ ارادہ فرما لیتا ہے...... تمہارے بیٹے کی پیدائش پر اس نے فرمایا تھا کہ میں اسے جب چاہوں گا واپس لے لوں گا اور شکر کرو کہ گستاخِ رسول کو سزا دینے کے لیے خداوند کریم تمہارے بیٹے کو واپس لے رہا ہے۔''

سعید علی کی آنکھوں سے تشکر کے سجدے آنسوؤں کی صورت میں گرنے لگے۔ کپکپاتے ہونٹوں سے وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے وہیں سجدے میں گر گئے۔ وہ کافی دیر تک



روتے رہے۔ حاکم علی شاہ ان کی پشت سہلاتے رہے اور ان کو مبارکباد پیش کرتے رہے۔

☆=======☆=======☆

کسی اللہ والے نے شین کو مسجد کے صحن پر گرتے دیکھ کر اسے اٹھا لیا تھا اور اپنے طریقے سے اس کے زخمی پر پر دوائی لگا دی۔ وہ دو دن اسی مسجد کے صحن اور چھت پر رہا اور پھر پُرامن شہر کی جانب پرواز شروع کر دی۔ بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہوائیں اسے خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

مسلسل تین دنوں کی پرواز سے اس کے پر تھک گئے تھے اور زخمی پر سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ تو گرتا پڑتا اسے ایک پہاڑ میں غار نما گھونسلہ نظر آیا۔ وہ خشک حلق کے ساتھ اللہ کا ورد کرتا ہوا اس گھونسلے کی جانب نچلی پرواز کرتا ہوا بڑھ گیا۔ اس نے گھونسلے پر اپنے پاؤں جمائے تو پتہ چلا کہ وہ ابابیلوں کا گھونسلہ ہے اور کافی کشادہ بھی ہے۔ اس کے ذہن نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا بالآخر وہ بے ہوش ہو کر گھونسلے میں گر گیا۔

ابابیلوں کی جان پر بن گئی تھی۔ یہ کبوتر ان کے گھر میں مہمان تھا اور شکل و صورت سے پردیسی بھی لگتا تھا اور اوپر سے زخمی بھی تھا۔ انہوں نے بولنا شروع کر دیا۔ ان کا شور سن کر سردار ابابیل اندر سے آیا اور غصے سے بولا۔ ''کیوں شور مچا رہے ہو؟''

''بابا! یہ پردیسی کبوتر زخمی ہو کر آن گرا ہے۔'' ایک ننھے منے ابابیل نے ساری تفصیل سے سردار ابابیل کو آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شین کو دیکھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر بے ہوش پڑا تھا۔ ''مجھے تو لگتا ہے یہ مر گیا ہے۔'' اس کی بات سن کر ایک ننھا منا ابابیل شین کے اوپر جھک گیا۔ ''یہ زندہ ہے۔'' اس کی آواز میں جوش دیدنی تھا۔

پھر چند لمحے بعد ہی شین کا علاج شروع ہو گیا تھا۔ وہ تمام ٹوٹکے آزما رہے تھے جن سے وہ اپنے زخمیوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ ایک ابابیل نے شین کے منہ میں پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ چند جان لیوا لمحات کے بعد اس کے وجود میں حرکت ہوئی تو سب خوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

شین کی آنکھیں کھلیں تو وہ اپنے گرد ابابیلوں کو دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ اس کی نظریں سردار ابابیل سے ٹکرائیں تو اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شین نے دوبارہ پُرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسے اب اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اب اپنوں میں ہے۔ اب اسے اس پرواز میں اس فضا میں کسی باز یا آندھی کا خوف نہ تھا۔ وہ پُرسکون ہو کر نیند

کے مزے لینے لگا۔

رات کا پچھلا پہر تھا دور مشرق سے سورج نکلنے کو بے تاب و بے قرار تھا۔ کہیں دور سے تہجد کی اذان سنائی دینے لگی تھی کہ شین کی آنکھ کھل گئی۔ اذان سے پہلے ہی کوئی گریہ زاری میں انسانوں کی عبادت کو مات دے رہا تھا۔ شین کی آنکھ سردار ابابیل کی گریہ زاری سے کھلی تھی۔ وہ سجدے میں پڑا ہوا رب واحد کی حمد و ثنا بیان کر رہا تھا۔

شین کو اپنے گھونسلے والے دن یاد آ گئے جب وہ سب سے پہلے بیدار ہو کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا تھا۔ وہ اتنی گہرائی سے رب کریم کا شکر ادا کرتے ہوئے ابابیل کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ اس کے رونے کی آواز سے دوسرے ابابیل بھی جاگ گئے تھے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ مگر شین کے لیے نیا ماحول اور نیا دن تھا۔

وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ثنا میں مصروف ہو گیا۔ صبح کا ملگجی اجالا ماحول کو آہستہ آہستہ واضح کرتا جا رہا تھا۔ فضا میں ''اللہ ھو...... اللہ ھو...... اللہ ھو'' کی صدائیں عجیب پُرنور سا ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ شین کی نگاہ دور پُرنور میناروں پر گئی تو وہ سانس لینا بھول گیا۔ یہ خانہ کعبہ کے مینار تھے۔ جن کی روشنیاں اور نور اس قدر جگمگا رہا تھا کہ شین کی آنکھیں اتنی دور سے ہی چندھیا گئیں۔

اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر'' کی صدا فضا میں گونجی تو کفر و ظلمت کا اندھیرا چھٹنے لگا اور فضا پُرنور ہالے کی زد میں آ گئی۔ فجر کی اذان نے پورے مکہ کی ہواؤں۔ فضاؤں اور خلاؤں کو مہمیز کر دیا تھا۔ مومن خدا کو سجدہ کرنے کے لیے گھروں سے نکل کر مسجد حرام کی جانب چل پڑے۔

پرندوں کی عبادت بھی عروج پر تھی مگر اذان کی آواز سن کر وہ احترام میں اس طرح خاموش ہو گئے تھے کہ جیسے گھونسلہ میں کوئی بھی نہیں ہے۔

''جانتے ہو ہم کس جگہ بیٹھے ہوئے ہیں؟'' اذان ختم ہوئی تو سردار ابابیل بولا۔ اس نے شین کو مخاطب کیا تھا۔ ''یہ وہ جگہ ہے جب دشمنوں نے اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ایذا پہنچائیں اور ان کا پیچھا کیا تھا تو سرکار دو عالم ﷺ کے رفیق جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکار دو عالم ﷺ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس غار میں لائے تھے۔'' سردار ابابیل کی بات سن کر وہ حیرت سے اس غار کو دیکھنے لگا۔ اس نے صبور



احمد اور عثمان غنی سے سن رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار مدینہ کو دشمنوں سے اس طرح بچایا تھا کہ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا بن دیا تھا اور کبوتری نے انڈے دے دیئے تھے۔ دشمن سمجھے کہ جس غار کے منہ پر مکڑی نے جالا بنا ہے۔ کبوتری نے انڈے دیئے ہیں۔ اس غار میں نبی آخرالزمان ﷺ کیسے چھپ سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر کفار واپس چلے گئے۔

شین کو خود پر فخر ہونے لگا تھا۔ وہ اس کبوتری کی نسل میں سے تھا جس نے سرکار مدینہ ﷺ کا دیدار کیا تھا۔ ''کس ملک سے آئے ہو؟''

''وہ ملک کائنات کا واحد ٹکڑا ہے جس کو کلمہ طیبہ کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہے اور کائنات کا وہ واحد ٹکڑا ہے جس میں عاشقانِ مصطفیٰ ﷺ کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، اور وہ اُڑ کر مدینہ منورہ تک پہنچنے کے لیے بے چین و بے قرار ہیں۔'' شین نے اپنے ملک کا نام اور تعریف ان الفاظ میں کی تو ابابیل متاثر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''ہم وہ ہیں جنھوں نے اللہ کے حکم سے ابرہہ کے لشکر پر کنکریاں برسائی تھیں۔ اس کافر کی ہاتھیوں کی فوج کو خداوند کریم نے ہماری کنکریوں سے اس طرح بنا دیا تھا جس طرح کھایا ہوا بھس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر ہم تا قیامت اس کے مشکور ہیں۔ اس رب رحیم نے ہمیں قرآن کریم میں جگہ دی۔ ہمارا ذکر قرآن کریم میں فرمایا اور ہم اپنی آنے والی نسلوں کو اللہ کی محبت سکھاتے ہیں۔ مگر اللہ اپنی محبت اور اطاعت کو اپنے محبوب ﷺ کی محبت اور اطاعت سے مشروط کرتا ہے۔ مجھے انتہائی افسوس ہوتا ہے انسانوں کی انسانیت پر۔''

ابابیل خاموش ہوا تو شین نے سوال کر دیا۔

''مگر تمھیں انسانوں پر افسوس کی کیوں ضرورت ہے۔''

''بڑے بڑے مفکر، بڑے بڑے علماء کرام جہاد اور دین اسلام پر مر مٹنے کی تقریریں کرتے ہیں اور جہاد بھی ہوتا ہے جو کہ اچھی بات ہے۔ مگر پوری اسلامی دنیا میں آج تک کوئی بھی ایسی یونیورسٹی نہیں بن سکی جس کے سلیبس میں صرف سیرت نبی ﷺ پر ایک بھی جامع کتاب کا پیریڈ دیا جاتا ہو۔ انگلینڈ، یورپ، اور امریکہ کے دورے کرنے والے بڑے بڑے مولوی صاحبان مجھے یہ بتائیں کہ اللہ ایک ہے۔ رسول ﷺ ایک ہے۔ قرآن ایک ہے تو پھر نماز ایک کیوں نہیں ہے۔ وضو ایک کیوں نہیں ہے۔ نماز کا وقت ایک ملک میں ایک کیوں نہیں ہے...... چچ چچ...... مجھے اس بات کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا۔'' وہ خاموش ہوا تو شین اس کی مدلل گفتگو سے بڑا متاثر نظر آیا۔

"اب تم کدھر جاؤ گے؟" ابابیل شین سے بولا۔

"میں مدینہ شریف جانا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے مقدس گھر جا کر اللہ کو سجدہ کر کے طواف کروں گا اور پھر مدینہ کی جانب اڑ جاؤں گا۔ یہاں سے کتنی دور ہے؟" شین نے اس کے سوال کا جواب بھی دیا اور اپنا سوال بھی کر دیا۔

"چار سو کلومیٹر ہے۔ مگر فضائی سفر کم ہو جاتا ہے۔" ابابیلوں نے کھجور اور شہد سے شین کی خدمت کی اور عاجزی سے بولے۔ "کالی کملی والے آقا ﷺ سے ہمارا عاجزانہ سلام کہنا۔" وہ گلوگیر ہو گئے تھے اور باقی سب کی نگاہیں احترام آقا ﷺ میں جھکی ہوئی تھیں۔ "تم مسافر مدینہ اور عاشقِ رسول ہو۔ تمہاری خدمت میں اگر کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔ ہم روزِ حشر آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کیا منہ دکھائیں گے؟" سردار ابابیل رونے لگا تو شین نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"تم نے تو میرا دل جیت لیا ہے۔ آقا ﷺ کے حضور پہنچ کر تمہارے لیے سفارش کروں گا کہ ابابیل کی بات کسی طرح انسانوں کے دل میں ڈال دیں۔" وہ باری باری تو سب سے نہ مل سکتا تھا کیونکہ وہ غار ثور میں تھے اور وہ غار جتنا بڑا اور وسیع تھا ابابیلوں کی تعداد بھی ان گنت تھی۔

دن کا اجالا پھیل چکا تھا مگر ابھی سورج کی کرنیں اس مقدس سرزمین پر سجدہ ریز نہ ہوئی تھیں۔ ابابیلوں نے فضا میں اڑان بھری اور خانہ کعبہ کی جانب پرواز شروع کر دی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے ہوئے کعبہ کے گرد پہنچ گئے اور شین بھی ان کے ہمراہ طواف کرنے لگا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ شین ان میں اکیلا تھا۔ اس نے نیچے آ کر غلاف کعبہ پر سنہری حروف سے لکھی ہوئی عبارت کو بوسہ دیا اور پھر طواف کرنے میں مصروف ہو گیا۔

ہر چیز نور میں نہائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ حاجیوں کا طواف کرنا اور پھر صفاء مروۃ کرنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس نورانی ماحول سے جدا ہوتا ہوا رونے لگا تھا۔ وہ اُڑ کر باب فہد بن عبدالعزیز کی لگی ہوئی گرل پر بیٹھ گیا۔

وہ ان خوش نصیبوں کو دیکھ رہا تھا جو جی بھر بھر کر آبِ زم زم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سفید اور ٹھنڈے پتھروں پر ننگے پاؤں طواف کرنے والے حاجی ایک جیسا ہی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ان میں اس وقت کوئی امیر نہ تھا۔ کوئی غریب نہ تھا۔ آقا اور غلام کی



تمیز بھول کر ہر کسی کو اپنی اپنی بخشش کی پڑی تھی۔ ہر کوئی خضوع سے عبادت الٰہی میں مصروف تھا۔ اس نے رب کریم کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ کیا اور "سبحان اللہ ربی الاعلیٰ" کہہ کر اپنے سر کو کعبہ کے سامنے جھکا دیا کیونکہ وہی اللہ کا گھر اور مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ تمام حالات و واقعات آنے لگے جب وہ مجبور اور بے بس تھا اور اس جانب سفر کا ارادہ کیا تھا۔

بے شک وہ یہاں تک پہنچا تھا یہ اللہ کی کرم نوازی اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی مہربانی تھی۔ اس نے روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سر سجدے سے اٹھایا اور شہرِ امن کی جانب پرواز شروع کر دی۔

سورج کی کرنیں ماحول کو حدت بخش رہی تھیں۔ پتھریلا اور پہاڑی علاقہ تھا۔ دور دور تک پانی کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔ تارکول کی بنی ہوئی سڑک پر گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ ان پہاڑی علاقوں میں کوئی جانور بھی نظر نہ آیا تھا۔ پرندوں کی پروازیں بھی کم ہی تھیں۔ مگر وہ اپنی پرواز جاری رکھے ہوئے تھا شام تک وہ کسی محفوظ مقام تک پہنچ کر رات بسر کرنا چاہتا تھا۔

سورج نے اپنا سفر پورا کر کے سجدہ کرنے کے لیے جھکنا شروع کر دیا تو شام کی باری آ گئی کہ وہ ان چیزوں پر اپنا قبضہ چند گھنٹوں کے لیے جما لے جن پر سارا دن سورج راج کرتا رہا ہے۔ پھر اس کے بعد رات کی باری تھی۔ شین کی پرواز تھکی ہوئی لگنے لگی تھی اس نے دور سے دیکھا کہ ایک ہوٹل نما عمارت ہے جس کے گرد چند بڑی بڑی مسافر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے اس جگہ کو رات گزارنے کے لیے بہتر جانا۔

وہ اس ہوٹل کی چھت پر چلا گیا۔ ہوٹل کیا تھا۔ سنگل سٹوری کا گھر نما ہوٹل تھا۔ جس میں مسافر وقتی طور پر ٹھہرتے چائے پانی پیتے کچھ دیر ریلیکس ہوتے اور پھر اپنی منزل کی جانب سفر شروع کر دیتے تھے۔

شین نے ایک ڈرم سے پانی پیا اپنی پیاس تو بجھا لی مگر بھوک نے پیٹ میں بغاوت شروع کر دی تھی۔

"اللہ تیرے محبوب ﷺ کے شہر کا مسافر ہوں اور پیارے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مہمان بھی۔ اگر بھوکا ہی رکھنا ہے تو میں تیری رضا پر راضی ہوں۔" اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے۔ اسی وقت کسی نے تازہ روٹی کے بچ جانے والے ٹکڑے اور کچھ دانے چھت پر پھینکے۔ شین نے آگے ہو کر دیکھا تو وہ بھی کوئی مسافر تھا۔ جس نے کھانا کھانے کے بعد باقی بچ جانے والی

روٹی اور دانے باسکٹ میں پھینکنے کی بجائے عمارت کی چھت پر پھینک دیئے۔

شین نے اوپر گردن اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور کھانا کھانا شروع کر دیا۔ موسم کی بہت بڑی تبدیلی کا اندازہ اسے اس سرزمین پر آ کر ہوا تھا۔ وہ جب اپنے وطن سے پرواز کرنے لگا تو کافی سردی تھی راستے میں بھی موسم کی سختیوں نے اس کو کافی تنگ کیا تھا مگر اس نے ہمت نہ ہاری تھی۔

اس نے کھانا کھا کر غروب ہونے والے سورج کے آخری لمحات دیکھے اور پھر گہری شام نے ہر چیز کو دھندلانا شروع کر دیا اور پھر رات نے ہر چیز پر تاریکی طاری کر کے دور دور تک کسی بھی چیز کو دیکھنے سے محروم کر دیا تھا۔ مگر سڑک پر اکادکا ٹریفک چل رہی تھی۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی بھی اس ہوٹل پر آ کر رک جاتی تو وقتی طور پر اندھیرا اپنی بے بسی پر ماتم کناں ہو کر خاموش ہو جاتا تھا۔

''محترم مسافر کو میرا سلام ہو۔'' یہ آواز سن کر اس کی روح فنا ہو گئی۔ اس نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا تو ایک موٹا تازہ بلا اس کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

''مم...... میں...... پردیسی ہوں اور رات بسر کرنے کے لیے یہاں رک گیا تھا۔'' شین کی زبان پہلے تو لڑکھڑائی پھر وہ سنبھل گیا۔ ''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بلا بولا۔

''کیونکہ میں اپنے شکار کو اذیت نہیں دیتا اور تم سے بھی وعدہ ہے کہ آسانی سے موت دوں گا'' بلا اپنے اگلے پاؤں پر زمین پر پیٹ لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے پاؤں کو چاٹتا ہوا مضحکہ خیز لہجے میں بولا تو شین کو ایک بار پھر اللہ یاد آ گیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے وہ منزل کے بالکل قریب تھا مگر یوں لگتا تھا کہ اب منزل اس سے اتنی دور ہو گئی ہے کہ وہ صدیوں تک بھی اُڑتا رہے منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے بے بسی سے تاروں بھرے آسمان کی جانب دیکھا اور دل کی گہرائی سے مدد طلب کی۔

''میرے اللہ! میں کسی بھی امتحان کے قابل نہیں ہوں۔ میں تیرے محبوب ﷺ کا خادم ہوں۔ تجھے تیرے محبوب ﷺ کی ذاتِ مقدس کا واسطہ! بس ایک بار مجھے گنبدِ خضریٰ دکھا دے اور شہر مدینہ کا طواف...... پھر چاہے میری جان لے لینا۔''

''کیا سوچ رہے ہو شہزادے؟'' بلا بھی کسی مزاحیہ عربی کے گھر سے لگتا تھا۔



''مجھے کھانے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟'' شین کا بے وقوفانہ سوال سن کر وہ قہقہے لگانے لگا۔

''اوئے! تُو باجرہ کیوں کھاتا ہے۔ دانہ۔ روٹی کیوں کھاتا ہے۔ تجھے کیا فائدہ ہوتا ہے؟'' وہ غرانے لگا۔

''وہی فائدہ مجھے ہوگا...... میں تجھے اتنا وقت کیوں دے رہا ہوں...... میں نیچے سے کھانا کھا کر چھت پر ٹہلنے آیا تھا۔ تم مل گئے...... چلو کچھ دیر بعد تم بھی سہی۔'' شین اتنے اندھیرے میں کہیں اُڑ کر بھی نہ جا سکتا تھا اور بلا بھی اب غرانے لگا تھا۔ ''مجھے باتوں میں لگا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔''

اس نے شین پر مزید رعب ڈالا۔ وہ اپنے جسم کو چھلانگ لگانے والے انداز میں تیار کرنے لگا۔ شین کو موت صاف نظر آنے لگی تھی۔

مگر اس نے جس قادرِ مطلق کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ وہ انسانی روپ میں آ گیا تھا۔ یک دم ایک موٹا تازہ ڈنڈا بلے کی کمر پر پڑا اور وہ دوہرا ہو کر رہ گیا۔ یہ ہوٹل کا ملازم تھا جو چپکے چپکے آیا تھا۔ اس نے تڑپتے ہوئے بلے کے جسم پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

''پورا مہینہ ہو گیا ہے...... میرا تمام سالن خراب کر دیتے ہو اور دودھ بھی پی جاتے ہو۔'' شین اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا مگر بلا شاید مر چکا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس نے نیچے سے ایک اور آدمی بلایا جو بڑا سا پنجرہ لے کر آ گیا تھا۔ انہوں نے ادھ مرے بلے کو پنجرے میں ڈال کر نیچے پھینک دیا۔ شین نے دیکھا کہ بلے کی کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی جان ایک بار پھر بچالی تھی۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا خدا ہے۔ یہ تو ایک ایسا معاملہ تھا کہ اللہ تعالیٰ شین کے دعا نہ کرنے پر بھی اس کی مدد کرتا۔ کیونکہ وہ نیتوں کو جانتا ہے۔ شین اوپر سے واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ بلا پنجرے میں ہے مگر اسے پھر بھی خوف آ رہا تھا۔ اس نے اللہ کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ دن بھر کی اُڑان نے اسے تھکن سے چُور چُور کر دیا تھا اور پھر اس بلے نے تو اس کی سانس ہی کھینچ لی تھی۔

اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ وہ اونگھنے لگتا اور کبھی پوری آنکھیں کھول کر پنجرے کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ مگر نیند بڑی ظالم شے ہے۔ اس نے شین کے دماغ پر اپنا غلبہ پا لیا تھا۔ وہ چند ساعتوں بعد ہی گہری نیند سو گیا۔

اسے خواب میں پورے دن کا سفر منظر نامہ بن کر نظر آنے لگا۔ وہ ابابیلوں تک پہنچنے سے پہلے کافی زخمی تھا۔ مگر ان کے گھونسلے میں گرنے کے بعد انہوں نے اس کی بہت خدمت کی تھی۔ اس کے زخم پر مرہم رکھا تھا اور اس کے سونے تک وہ باتیں بھی نہ کر رہے تھے اور پھر سردار ابابیل کی رقت انگیز دعا تہجد کے وقت وہ جس انداز میں سجدہ ریز ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ اس کی مثال اس نے آج سے پہلے کہیں بھی نہ دیکھی اور سنی تھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ابابیل کو ایک مقام دیا ہے۔

وہ خواب میں سیّد صبور احمد کی حویلی پہنچا ہوا تھا۔ وہ ان کی حویلی کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور صبور احمد حیاء اور احمد سبحانی کو عشق کے رموز سمجھا رہے تھے۔ ان کی نظر اس پر پڑی تو وہ شعر پڑھنے لگے۔

اک رات دا جاگن ڈاہڈا اوکھا
اک جاگدا یار دا یار راتیں
اک جاگدا چور دی سنھ اتے
دوجا جاگدا پہریدار راتیں
اک جاگدا عشق دے مرض والا
یا جاگدا سخت . بیمار راتیں
غلام فریدا سارے ای سوں جاندے
اکو ای جاگدا اے پروردگار راتیں

''غفلت کی نیند سے جاگ جا منو...... ورنہ موت آجائے گی۔'' صبور احمد نے شین کو منو کہہ کر سخت الفاظ میں آواز دی تو اس کی آنکھ کھل گئی اور موت اس بلے کی شکل میں اس کے سر پر کھڑی تھی۔ ''بے وقوف انسان نے پنجرہ نیچے پھینکا تو اس کا دروازہ کھل گیا تھا۔'' بلے کی غراہٹ سنائی دی۔ اس نے یہ کہہ کر شین پر چھلانگ لگا دی اور اپنے نوکیلے پنجوں میں دبوچ لیا۔ شین کی آواز نے سناٹے میں دور دور تک فضا کو لرزا دیا تھا۔

شین کی گردن اس کے پنجوں میں تھی اور وہ اپنے دانت گاڑھ کر اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ شین کو غفلت کی نیند سونے کی سزا مل گئی تھی۔ اس کا وجود خونخوار بلے کی گرفت میں تڑپ رہا تھا۔

☆=======☆=======☆



گستاخ رسول کی غیر اسلامی ممالک میں کافی پذیرائی ہو رہی تھی۔ وہ کفار کی دنیا کا ہیرو بن کر ابھرا تھا۔ مختلف ممالک کے صدور اور وزراء کرام اس کی دعوتیں کر رہے تھے اور شیلڈیں تحائف کے طور پر دی جا رہی تھیں۔ ڈیوڈ تھامسن گستاخ رسول ایک ہفتہ بعد آسٹریلیا کے دورے پر آنے والا تھا۔

یہ خبر سن کر اور اخبارات میں پڑھ کر احمد سبحانی نے اسے اس کے ملک کی بجائے کسی ایسے ملک میں ختم کرنے کا سوچا جو اس کی دعوت کرے اور اس کو انعامات سے بھی نوازے۔ احمد سبحانی اس پر کڑا وار کر کے اسے ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ گستاخ ختم بھی ہو جائے اور وہ ملک بھی بدنام ہو جائے۔

اس کا دنیا کی سیر کا ویزہ لگ گیا تھا۔ پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بڑھی ہوئی شیو اس کو بیمار اور لاغر ظاہر کر رہی تھی اس وقت وہ سعید علی کے ساتھ گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سعید علی کو تمام بات صبور احمد نے بتا دی تھی مگر اب مسئلہ زویا بیگم کی اجازت کا تھا۔

وہ ماں تھی ہو سکتا ہے اپنے لختِ جگر کو اجازت نہ دے۔ مگر دین اور مذہب سے ان کا لگاؤ اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ وہ مان بھی جائیں گی۔

''پاپا! میں اچھا بیٹا تو نہیں بن سکا۔'' اس نے سعید علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''لیکن میں اچھا خادم رسول بننا چاہتا ہوں۔'' سعید علی کی آنکھوں میں کافی دیر سے رکا ہوا پانی چھلک کر باہر نکل چکا تھا۔
''پاپا!'' احمد سبحانی نے انہیں روتے دیکھ کر پکارا تو وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔
''مجھے شاہ جی نے تمہاری پیدائش سے پہلے اس بات پر راضی کیا تھا کہ اللہ تمہیں جب چاہے گا اپنے لیے واپس لے لے گا۔'' سعید علی آہ بھرتے ہوئے بولے۔ ''مگر مجھے اپنے اس وعدے پر فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے میں نے سادات گھرانے کی نسبت سے جو وعدہ کیا تھا۔ آج پورا کرنے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے روزِ محشر اس وعدہ کو پورا کرنے پر سرخروئی عطا فرمائے۔''
''آپ کی طرف سے مجھے اجازت ہے؟'' احمد سبحانی کی آواز میں خوشی نمایاں تھی۔
''ہاں بیٹا! ہم اللہ کے رسول ﷺ کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے تمہیں بخوشی اجازت دیتے ہیں۔ جیسا کہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی مومن اس وقت

تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں محمد ﷺ اس کو اس کے جان و مال، اولاد اور خاندان سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔ میں آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و حرمت پر اپنی کئی اولادیں قربان کرنے کو ترجیح دوں گا...... مگر کیا کروں...... اللہ پاک میں مجبور ہوں...... میرا ایک ہی بیٹا ہے...... اگر اس راہ پر واپس لینا تھا تو پھر مجھے سرخروئی کے لیے دو تین اور بیٹے تو دے دیتا۔ میں فخر سے عاجزی سے تیری راہ میں تیرے محبوب ﷺ کی عظمت کی خاطر قربان کر دیتا۔'' سعید علی سجدے میں گرے رو رہے تھے اور زویا بیگم اور فاطمہ ان کے پاس کھڑی چہروں پر فخر اور مان سجا کر بیٹے اور بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔

''پاپا!'' فاطمہ کی آواز سن کر سعید علی سجدے سے اٹھے اور زویا بیگم سے نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ''وہ...... احمد سبحانی...... دنیا کی سیر کو جا رہا تھا...... دل بہل جائے گا...... میں نے تو اجازت دے دی ہے...... تم بھی......'' زویا بیگم شوہر کے جذبات کو سمجھتی تھیں۔

''مذہب کے معاملے میں...... میں جھوٹ کو پسند نہیں کرتی۔'' ان کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔ ''میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اعزاز کی ناشکری کرنے والی میں کون ہوتی ہوں۔'' ان کی آنکھیں بھی خوشی سے برسنے لگی تھیں۔ ''اور بھی عاشقانِ مصطفیٰ اس گستاخ کو عبرتناک موت مارنے کے لیے نکل پڑے ہوں گے مگر میں رب رحیم سے دعا کروں گی کہ اس کو قتل کرنے کا انعام میرے بیٹے کو بخشے۔''

ماں باپ کی دعاؤں اور بہن کی وفاؤں نے اس کو اجازت دے دی تھی کہ وہ راہِ خدا میں جہاد کرے اور گستاخِ رسول کو عبرت ناک موت مار کر آئندہ کے لیے کفار کے ذہنوں میں لرزہ طاری کر دے۔

ڈیوڈ تھامسن آسٹریلیا تین دن بعد پہنچنے والا تھا۔ مگر احمد سبحانی آج ہی اس ملک سے پرواز کرنا چاہتا تھا۔ وہ مزید ہدایت اور رہنمائی کے ساتھ ساتھ اجازت لینے کے لیے مرشد اور استاد صبور احمد کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''میں نے تمہیں پہلی ملاقات میں ہی کہا تھا کہ تم عین ہو۔'' صبور احمد اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور اس نے دوزانو بیٹھ کر اپنی نگاہیں جھکائی ہوئی تھیں۔ ''آج تم پر ایک راز کھولنے لگا ہوں۔'' احمد سبحانی کی نظریں صبور احمد کی جانب اٹھیں تو ان کی نگاہیں دور کہیں دیکھ رہی تھیں۔ ''جس طرح تم عین ہو...... اسی طرح حیاء قاف ہے۔'' احمد سبحانی حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔



''وہ...... وہ تو......''

''طوائف ہے۔'' صبور احمد نے اس کی بات مکمل کر دی۔ ''یہی کہنا چاہتے تھے تم؟'' انہوں نے احمد سبحانی کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا تھے؟ شرابی، شبابی، محفلوں کی پہچان۔ طوائفوں کے ناچ گانے سننا۔ تمہارا مشغلہ تھا...... مگر اس بے پرواہ رب کی نگاہِ کرم تم پر پڑی اور تم کو عشق کے عین کا چولا پہنا کر سیدھی راہ پر چلنے کے لیے صراطِ مستقیم کا دیوانہ بنا دیا۔ اب تم اس کے محبوب ﷺ کی حرمت و عظمت پر قربان ہونے کو تیار ہو تو عشق تم پر فخر کرتا ہے۔'' انہوں نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر احمد سبحانی کو پکڑایا اور بولے۔ ''یہ ایک خط ہے۔ میں نے آسٹریلیا میں ایک اللہ والے کے نام لکھا ہے۔ وہ خود ہی تم سے رابطہ کریں گے...... اور آگے کیا کرنا ہے...... وہ تمہیں سمجھا دیں گے۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

صبور احمد، احمد سبحانی کے کندھے پر تھپکی دے کر خود سجدے میں گر گئے اور پھر چند لمحوں بعد ان کا وجود ہولے ہولے لرزنے لگا۔ احمد سبحانی مرشد کی چوکھٹ کو بوسہ دے کر وہاں سے نکل آیا۔

☆=======☆=======☆

اگلے دن کے اخبارات میں ایک اور سنسنی خیز خبر یہ تھی کہ جبران عرف جبرو جیل سے فرار ہو گیا ہے اور ایس پی میاں عبدالغفار نے غفلت برتنے پر پانچ اہلکاروں پر مقدمہ درج کروا دیا۔ احمد سبحانی کو اس سے اس لیے بھی دلچسپی ہو گئی تھی کہ وہ کبھی حیاء کا عاشق تھا مگر وہ اس کا واحد عاشق تھا جس نے کبھی بھی اس کو چھوا تک نہ تھا۔ وہ ایئر پورٹ پر سعید علی اور زویا بیگم کو خدا حافظ کہتا ہوا آنسوؤں کی ندیاں بہا کر جہاز میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا مختصر سا سامان اس کے پاس ہینڈ کیری کے طور پر موجود تھا۔

جہاز نے جیسے ہی پرواز شروع کی تو اس کا رشتہ اپنے وطن کی زمین سے کٹ گیا تھا۔ وہ ڈیوڈ تھامسن کو کس طرح قتل کرے گا۔ وہ اس کو عبرت ناک موت مارنے کے پروگرام پر عملدرآمد کرنے کے لیے سوچ و بچار کرنے لگا۔

اس نے صرف ایک بار ہی کافی منگوائی اور ایئر ہوسٹس سے کہہ دیا کہ اسے کھانے کے لیے نہ جگائے۔ وہ آنکھیں بند کر کے ''میم سے محمد ﷺ'' کا ورد کرنے لگا۔ وہ اپنا سبق نئے استاد کو سنانے سے پہلے اچھی طرح پکا لینا چاہتا تھا۔ سبق پڑھتے ہی اس کو اونگھ آنے لگی۔

نورانی نور کے ہیولوں نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ وہ مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھا ہوا گنبدِ خضریٰ کا دیدار ہی کیے جا رہا تھا۔ گنبد خضریٰ کی کشش اور نورانیت اس کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے نذرانے لٹا رہی تھیں۔ وہ ''میم سے محمد ﷺ'' پڑھتا جا رہا تھا۔ نورانی ہیولا اس کو اپنے دائرے میں گھیر کر آسمان کی جانب پرواز کرنے لگا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

جہاز لینڈ کر رہا تھا۔ وہ سڈنی کے ایئر پورٹ سے امیگریشن کلیئر کروانے کے بعد باہر نکلا تو ایک بزرگ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کے ہاتھ میں احمد سبحانی کے نام کا بورڈ پکڑا ہوا تھا اور



وہ بزرگ وہی تھے جو ا[illegible] کو اس رات سڑک پر ملے تھے جس رات اس کی لڑائی احد سے ہوئی تھی لیکن آج ان کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے شلوار قمیص اور ویسکوٹ پہن رکھی تھی۔ ان کے پاؤں میں جوتے بھی نئے تھے اور ان کے چہرے سے نور برس رہا تھا۔

انہوں نے احمد سبحانی کو پہچان کر ہاتھ آگے بڑھایا اور ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے اسے ہجوم سے باہر لے گئے۔ وہ سڈنی تیسری بار آیا تھا۔ مگر آج اسے اس شہر کی فضا نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

وہ بزرگ اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر کہیں لے جا رہے تھے۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ احمد سبحانی نے ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے یا جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ کون ہے۔ وہ تو صبور احمد کی بات پر حیران تھا کہ اسے ایک کاغذ (خط) وہاں اللہ کے بندے کو دینا ہے باقی وہ تمام کام تمہیں سمجھا دیں گے۔

اب اسے یہ معلوم نہ تھا کہ خط ان بزرگوار کو ہی دینا ہے یا کوئی اور اس سے ملے گا۔

''میری کوئی چیز تمہارے پاس ہے جو صبور احمد نے دی ہو گی۔'' وہ بزرگ کی بات سن کر ان کی طرف دیکھتا ہوا اپنی شرٹ کی جیب سے خط نکال کر ان کو دینے لگا۔ وہ سیّد شاہ سوار حسین تھے۔ جو صبور احمد اور حاکم علی شاہ کے مرشد تھے۔ انہوں نے احمد سبحانی کو اس ملک میں کس طرح خوش آمدید کہا تھا یہ بات احمد سبحانی کے لیے اچنبھے سے کم نہ تھی۔ وہ خط پڑھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

''سبق اچھی طرح یاد ہے نا؟''

''جی سرکار!'' احمد سبحانی نئے استاد سے گفتگو کرتا ہوا گھبرایا ہوا تھا۔ گاڑی ایک شاندار گھر کے باہر رک گئی۔ شاہ سوار حسین احمد سبحانی کو لے کر اندر چلے گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی خانہ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ کی بہت بڑی تصویر پر اس کی نظر پڑی۔ وہ چلتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں فرنیچر کم ہی تھا۔ قیمتی قالین اور پردے اس کمرے کی ڈیکوریشن میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس کی نظر سامنے دیوار پر لگے ہوئے بورڈ پر گئی تو وہ چونک گیا۔

اس بورڈ پر چھوٹی چھوٹی کئی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کر اس بورڈ کی طرف بڑھ گیا اور تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ تصویروں کے نیچے ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔ ان میں پتھر، درخت، ابابیل، وغیرہ اور انسانوں کی تصاویر بھی شامل تھیں۔

سب سے نیچے وہ نارنجی رنگ کی چونچ والے کبوتر کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے یاد آنے لگا ایسا ہی کبوتر اس نے صبور احمد کی حویلی میں دیکھا تھا۔ اس کے نیچے کبوتر کا نام ''شین'' درج تھا۔

اور پھر ساتھ ہی حیاء کی تصویر تھی۔ اس نے سیاہ سکارف سے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا اور سیاہ چادر ہی اپنے جسم کے گرد اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی تصویر کے نیچے ''قاف'' لکھا ہوا تھا اور پھر آخری خانے میں احمد سبحانی کی تصویر تھی جس کے نیچے ''عین'' لکھا ہوا تھا۔ وہ ان تصاویر کا مقصد نہ سمجھا تھا کہ سیّد شاہ سوار حسین کی آواز سن کر چونک پڑا۔

''کمرۂ امتحان میں کوئی جعلی امیدوار نہ بیٹھ جائے اسی لیے ان کی تصاویر ضروری ہوتی ہیں۔'' وہ بات کو کچھ کچھ سمجھ گیا تھا اور کچھ سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ خاموش ہی رہا۔

سیّد شاہ سوار حسین اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا رکھ کر احمد سبحانی کو کھانے کا کہہ کر باہر نکل گئے۔

وہ کھانا کھا کر فارغ ہوا تو شاہ صاحب تشریف لائے اور اس کو گستاخِ رسول کے بارے میں بتانے لگے۔ ڈیوڈ تھامسن کل پریس کانفرنس کرنے والا تھا۔ احمد سبحانی کو پاکستانی رپورٹر کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شامل ہونا تھا۔ دعوت نامہ بھی آ گیا تھا۔ کانفرنس روم سے چند منٹ کے لیے احمد سبحانی کو واش روم جانا تھا۔

اور پھر اس کی کون مدد کرتا تھا اور کیسے کرتا تھا یہ وہاں کی بات تھی۔

تمام کام تیار تھا۔ احمد سبحانی کو پریس کارڈ اور دعوت نامہ دے کر پریس کلب کی عمارت کے باہر اتارا گیا تو وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ ''مرشد! سرکار میری کامیابی کے لیے رحمٰن و رحیم سے دعا کریں۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور دل کی بے ترتیب دھڑکنیں اس کو گمراہ کرنے لگی تھیں۔

''بھاگ جاؤ احمد سبحانی...... ابھی بھی وقت ہے بھاگ جاؤ۔'' کوئی اس کے اندر سے بول رہا تھا۔ ''یہ عشق موت کے سوا تمہیں کچھ نہیں دے گا۔'' وہ اپنی بدلتی ہوئی کیفیت سے شاہ صاحب کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولے۔ ''فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ ذلت کی زندگی...... یا عزت و آبرو کی موت۔'' گویا وہ اس کے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ سے آگاہ تھے۔ ''جانا چاہتے ہو تو راستے کھلے ہیں۔'' شاہ صاحب نے خالی سڑک کی جانب اشارہ کیا تو وہ دل کی دھڑکنوں کو ترتیب دینے لگا۔ ''میم سے محمد ﷺ'' کہنے کی دیر تھی کہ اس کی دھڑکنیں اور سانسیں اعتدال پر



آ گئیں۔

''میں عین ہوں۔ اللہ کے کرم سے یہ ثابت کروں گا۔'' اس نے سیّد شاہ سوار حسین کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تو گاڑی کا ڈرائیور بھی باہر نکل آیا مگر احمد سبحانی کی ان کو دیکھ کر چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ صبور احمد کے والد محترم حاکم علی شاہ تھے۔ ''میں نے تمہیں پہلے دن سے آج تک پالا پوسا ہے احمد سبحانی!'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے اور احمد سبحانی کی آنکھیں برسات بنی ہوئی تھیں۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بچہ امتحانی سنٹر میں جائے اور پالنے والے اسے مرکز تک چھوڑنے نہ آئیں۔'' احمد سبحانی کو انہوں نے گلے سے لگا کر ماتھے پر بوسہ دیا اور رخصت کیا۔

اب آگے اس کا کام تھا کہ کیا کرنا ہے۔ بس دی گئی ہدایات پر عمل کرنا تھا اور وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔

''میرے اللہ! ہم نے اس بچے کو تیری رحمت اور تیرے فضل و کرم پر بے انتہا اعتماد اور مان ہونے کی بنا پر عین کے طور پر چنا ہے۔ تُو اسے عین کی سند کا حقدار بنا دے اور ہمارا مان رکھنا تجھے تیرے حبیب کبریا ﷺ کی ذات اطہر و مطہر و معطر کا واسطہ! ہماری لاج رکھنا۔'' سیّد شاہ سوار حسین کی نظریں جھکی ہوئی تھیں ہاتھ آسمان کی جانب بلند تھے اور زبان شاہ رگ سے بھی قریب ربِ تعالیٰ سے ملتمس تھی۔

احمد سبحانی کی طرح دوسرے رپورٹرز بھی ملازمین کی رہنمائی میں ہال میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ابھی تک وہ گستاخِ رسول سامنے نہ آیا تھا۔ وسیع و عریض ہال میں کرسیوں کی تعداد اَن گنت تھی۔ صحافی حضرات کے لیے سب سے آگے والی نشستوں کا انتظام تھا۔ ویڈیو گرافرز بھی اپنے اپنے کیمرے سیٹ کر چکے تھے۔

سیکیورٹی کا انتہائی سخت انتظام تھا۔ اچھی طرح تلاشی کے لیے رپورٹرز کو کئی کئی سکریننگ مشینوں سے گزارا گیا تھا ان کے قلم چھین لیے گئے تھے۔ ان کو قلم انتظامیہ نے اپنی جانب سے دیئے تھے۔

احمد سبحانی اپنی سیٹ پر بیٹھا تو اس نے اپنی خوش قسمتی تصور کی کہ اس کی سیٹ ڈائس بورڈ کے بالکل سامنے تھی۔ وہ اپنی کاپی کرسی پر رکھتا ہوا واش روم کی جانب چل پڑا اسے یہی سمجھایا گیا تھا۔ اس نے ایک ملازم کی رہنمائی لی اور ہال میں ہی ایک دیوار سے گزر کر دوسری جانب واش روم بنائے گئے تھے۔

اس نے واش روم سے نکل کر اپنے جوتے اور موزے اتارے اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیمO'' پڑھ کر وضو کرنا شروع کر دیا۔ اس نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور موزے وغیرہ پہن کر سیدھا ہی ہوا تھا کہ وہی ملازم جس کی رہنمائی میں وہ یہاں تک پہنچا تھا اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے چمڑے کا ایک چھوٹا سا تھیلا احمد سبحانی کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''دعا کرنا اگلی بار میں عین کی سند پانے میں کامیاب ہو جاؤں۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ حیران و پریشان احمد سبحانی نے چمڑے کا تھیلا کھولا تو اس میں تیز دھار خنجر تھا جس پر پیلے رنگ کا کچھ محلول لگا ہوا تھا۔ اسے اس خنجر سے اس گستاخ اور ملعون ڈیوڈ تھامسن کو قتل کرنا تھا یہ اب اس پر منحصر تھا کہ وہ یہ کام کتنی ہوشیاری اور چالاکی سے کرتا ہے۔ اس نے خنجر اپنی شرٹ کے اندر احتیاط سے رکھا اور بٹن بند کرتا ہوا باہر ہال میں نکل آیا۔

ڈیوڈ تھامسن چہرے پر خباثت سجائے اندر داخل ہوا تو چار سیکیورٹی گارڈز بھی اس کے ہمراہ تھے۔ یہود و نصاریٰ سے تعلق رکھنے والے رپورٹرز تالیاں بجاتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے جبکہ مسلمان رپورٹرز احتجاجاً اور اس سے نفرت کے باعث بیٹھے رہے۔

وہ ڈائس پر آ کر کھڑا ہوا تو دوسرے ڈائس سے ایک مکروہ صورت والا ڈیوڈ تھامسن کے کارناموں کا پرچار کرنے لگا۔ اس کا مکمل تعارف پیش کیا گیا تو احمد سبحانی کے اندر سے پھر کوئی بولا۔

''کیوں مرنا چاہتے ہو؟ ان بڈھوں کا تو دماغ ہل گیا ہے۔ وہ خود کیوں نہیں آئے اسے قتل کرنے کے لیے وہ تمہیں قربانی کا بکرا بنا کر لے آئے ہیں۔ واپس نہیں جا سکو گے۔'' اس کے اندر ہونے والی ہلچل اس کے چہرے پر پسینے کی صورت میں نمودار ہونے لگی تھی۔

اس نے شیطان ملعون پر لعنت بھیجی اور اپنا سبق ''الف اللہ میم سے محمد ﷺ'' پڑھنا شروع کر دیا۔ دنیا بھر کے ٹی وی چینلز اس پریس کانفرنس کو براہِ راست دکھا رہے تھے۔ بلکہ انگلش چینلز تو بڑھا چڑھا کر اس معاملے کو انوکھا ہی رنگ دے رہے تھے۔

فاطمہ نے بھی اپنے بھائی کو رپورٹرز کی اگلی قطار میں بیٹھے دیکھ کر سعید علی اور زویا بیگم کو آواز دی تھی۔ زویا بیگم کے ہاتھ میں قرآن کریم تھا۔ وہ بیٹے کی کامیابی کے لیے دعاؤں کا نذرانہ عاجزی سے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر رہی تھیں۔ ''میرے بیٹے اس مرتد و منکر کو



زندہ مت چھوڑنا۔ اللہ تمہارا مددگار ہے۔''

ابھی پہلا سوال ہی ہوا تھا کہ دنیا بھر کے لوگوں نے اپنے اپنے ٹی وی چینلز پر دیکھا کہ احمد سبحانی کے ہاتھ میں خنجر ہے اور وہ بجلی بنا ہوا تیزی سے سٹیج پر چڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے خنجر ڈیوڈ تھامسن کی گردن پر رکھ دیا۔ پورے ہال میں سراسیمگی پھیل گئی۔ سیکیورٹی گارڈ بھی جاگ گئے کیمرہ مین قریب سے زوم کر کے احمد سبحانی کو دکھانے لگے۔ دنیا بھر کے ایوانوں میں فوری ہلچل مچ گئی۔

''شاباش! شاباش...... اس خنجر سے اس کی شاہ رگ کاٹ دو۔'' سعید علی اور زویا بیگم اکٹھے ہی چلائے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ ان کا بیٹا عظمتِ رسول ﷺ کی خاطر پورے عالم کے یہود و نصاریٰ سے ٹکر لے چکا تھا۔

''خبردار! کوئی بھی آگے نہ بڑھے۔ ورنہ اس بے غیرت کی شاہ رگ کاٹ دوں گا۔''

اس کی آواز میں گھن گرج سن کر سیکیورٹی گارڈز کے قدم ڈگمگائے مگر ان کی گنوں کا رخ احمد سبحانی کی طرف ہی تھا۔ وہ اس پر گولی نہ چلا سکتے تھے کیونکہ اس کے بازوؤں کی سخت گرفت میں ڈیوڈ تھامسن بے بس اور ادھ موا ہو گیا تھا۔

''میں مسلمان ہوں...... اور الحمدللہ عاشقِ رسول بھی ہوں۔'' اس کی آواز سن کر ہال پر سناٹا طاری تھا۔ وہ خنجر کا دباؤ ڈیوڈ تھامسن کی گردن پر بڑھاتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں موت کے خوف سے ابل رہی تھیں مگر وہ نوجوان احمد سبحانی کی طاقت اور جوش کے سامنے بے بس تھا۔

''تمام یہودی سن لو! ہمارے نبی رحمتہ اللعالمین ہیں۔ وہ آخری نبی ہیں۔ اس دنیا میں جب بھی کوئی گستاخ رسول پیدا ہو گا تو یاد رکھو ایک گستاخ کے پیدا ہونے پر اللہ تعالیٰ اَن گنت عاشقِ رسول پیدا فرماتا ہے۔'' اس نے تیز دھار والا خنجر جس کی دھار پر زہر لگا ہوا تھا ڈیوڈ تھامسن کی شاہ رگ پر زور سے چلا دیا۔ پل بھر میں اس خنجر نے مردود کا کام تمام کر دیا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ احمد سبحانی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔'' زویا بیگم اور سعید علی نے اپنے بیٹے کو جام شہادت نوش کرتے ہوئے دیکھا تو شکرانے کے طور پر ان کے منہ سے اللہ کی کبریائی کے نعرے بلند ہو گئے۔ میڈیا اور سائنسی آلات جدید ہونے کی بنا پر احمد سبحانی کے منہ سے نکلنے والے آخری الفاظ یہ تھے۔

''الف اللہ...... میم محمد ﷺ'' اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے کیمروں کی جانب

دیکھا جیسے کہ وہ آخری سلام اپنی ماں کو پیش کر رہا ہو۔ وہ سٹیج پر گرا ہوا تھا اس کی آنکھیں جھکتے جھکتے بند ہوگئی تھیں۔

اس نے عشق کے عین کو اپنی جان کا نذرانہ دے کر سرخرو کیا تھا اور اس سند کا صحیح حقدار بن کر دکھایا تھا۔ حورانِ جنت اس کے استقبال کے لیے قطار در قطار کھڑی تھیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے محبوب ﷺ کا عاشق تھا اور عین ہونے کی بنا پر ابتدائے عشق بھی تھا اور اس نے عشق کو سرخرو کرنے کے لیے ابتدا بھی کر دی تھی۔

☆=======☆=======☆

اس سے پہلے کہ بلا اپنے نوکیلے دانتوں سے شین کی گردن کا منکا توڑتا اس وقت اس کی کمر پر پڑنے والے ڈنڈے نے اس کی چیخ نکال دی تھی اور شین اس کے منہ سے نکل گیا تھا وہ ادھ موا اور نڈھال ہو کر چھت پر گرا ہوا تھا۔ ہوٹل کے ملازم نے بلے کی گردن میں موٹی رسی ڈال کر اسے نیچے پھینک دیا۔

اس نے فوراً کبوتر کو اٹھایا اور کان سے لگا کر اس کی دھڑکنیں سننے لگا۔ شین کو زندہ پا کر وہ نیچے کی جانب بھاگا۔ اس نے فوراً پانی کے قطرے شین کے منہ میں ٹپکانے شروع کر دیئے۔ شین کو کچھ افاقہ محسوس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

ملازم نے اس کی گردن پر سپرٹ اور دوسری دوائی لگا کر اس کے زخم کو مندمل کرنے کی کوشش کی۔ وہ درد کی شدت سے چلا رہا تھا۔ مگر ملازم کی نظر میں وہ محض ایک کبوتر ہی تھا۔

وہ مدینہ منورہ سے چند کلومیٹر ہی دور تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آگئیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا شروع کر دی۔ ''بس ایک بار...... تیرے محبوب ﷺ کی چوکھٹ کو بوسہ دینا چاہتا ہوں پھر چاہے میری جان نکال لینا۔ میرے اللہ! میرے عشق کی لاج رکھنا۔'' وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کا زخم گہرا اور تکلیف زیادہ تھی۔ وہ اپنی بے بسی و بے کسی پر روتا ہوا بے ہوش ہوا تھا۔

تین دن تک وہ ملازم اس کی مرہم پٹی کرتا رہا۔ وہ اب کچھ کچھ پرواز کے قابل ہوا تھا۔ ہوٹل ملازم نے اسے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا اور اسے چوم رہا تھا۔ اس نے اپنا منہ شین کے منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''مدینے والے آقا ﷺ سے میرا اسلام کہنا اور دعا کرنا کہ اگلا شین میں بنوں۔'' اس نے شین کی حیرت کی پرواہ نہ کی اور اسے فضا میں چھوڑ دیا۔ اس نے منڈیر پر بیٹھتے ہوئے



دیکھا کہ ملازم اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسو صاف کر رہا تھا۔

صبح کا وقت تھا شین نے زخمی پروں اور زخموں سے چُور گردن کے ساتھ مدینہ کی جانب پرواز شروع کی۔ سورج کی تپش اس کے وجود کو حرارت پہنچا رہی تھی۔ وہ پُرعزم ارادہ سے اڑتا ہوا سامنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ مسجد نبوی ﷺ کے بلند و بالا عظیم میناروں پر پڑیں تو اس کی پرواز میں روانی آ گئی۔

وہ اب کسی بھی جگہ رک کر اپنا سانس درست کرنے کا رسک نہ لے سکتا تھا۔ وہ اپنے جسم میں طاقت کی واضح کمی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے زخمی پر اور گردن سے پھر خون نکلنا شروع ہوا تو اسے تکلیف کا احساس ہوا۔ مگر اس لمحہ مدینہ شریف کی مسجد نبوی ﷺ تک پہنچنا اس کی اولین کوشش تھی۔

اس نے اللہ کی ذات سے مدد مانگی اور اپنی پرواز تیز کرنے کے لیے پروں کو تیز اوپر نیچے کرنا شروع کر دیا۔ وہ مسجد نبوی کے پہلے مینار تک پہنچنے کے لیے کوشاں تھا۔ اس کی تیزی اور جولانی نے اس کو مزید زخمی کر دیا تھا۔ اب اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں مگر فاصلہ بھی چند گز کا رہ گیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اپنی پرواز بھول گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے میناروں کے درمیان گنبد خضریٰ پوری آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔

اس پر پڑنے والی سورج کی کرنیں قربان ہو کر لوٹ رہی تھیں۔ منو شین بن گیا تھا۔ اس نے دنیا بھر میں طویل پرواز کر کے عشق کی کتاب میں اپنا نام لکھوا لیا تھا۔ اس نے اپنے عشق کو شک سے پاک کرنے کے لیے گنبد خضریٰ کی جانب جو سفر شروع کیا تھا وہ آج اختتام کو پہنچا تھا۔

گنبد خضریٰ کی چمک دمک دیکھ کر دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ سانسیں اور دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں تو وہ غش کھا کر گرنے لگا۔ وہ بلندی سے گرتا ہوا ایک شخص کی پھیلائی ہوئی جھولی میں جا کر گرا۔ اس نے تو اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا تھا مگر جس شخص نے دعا کے لیے جھولی پھیلائی ہوئی تھی وہ اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور شین کے منہ سے ''عثمان غنی آپ؟'' نکلا اور پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔

عثمان غنی اس وقت مسجد نبوی ﷺ کے ساتھ ملحقہ قبرستان جنت البقیع میں کبوتروں کو دانہ ڈال کر اپنی جھولی پھیلائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آخرت سنورنے کے ساتھ ساتھ عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے کوئی درجہ اور سند بھی مانگ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عثمان غنی کی

پھیلی ہوئی جھولی میں عشق کا شین کبوتر کی شکل میں ڈال کر انہیں بتا دیا کہ آئندہ شین تم ہو گے۔

وہ پُرنم آنکھوں سے شین کو چومتے ہوئے شکرانے کے آنسو بہاتے ہوئے شین کو پکڑ کر باب جبریلؑ سے داخل ہوئے اور سرکارِ دو عالم ﷺ کے قدموں میں رکھنے سے پہلے سنہری جالیوں سے لگایا تو شین نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا کہ عثمان غنی نے اس کو پکڑا ہوا ہے اور اس کا وجود روضہ رسول ﷺ کی سنہری جالیوں سے ٹکرا کر ہے۔ وہ آنکھوں سے اپنے خاندان کی التجاؤں اور صداؤں کو سرکارِ مدینہ کے حضور پیش کر رہا تھا۔

اسے راہوں کے سبھی ساتھی یاد آنے لگے۔ عثمان غنی نے اس کو پکڑا ہوا تھا۔ درخت، سانپ، ابابیل، ہوٹل ملازم اپنے بڑے چھوٹے سب اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ وہ ان سب کا سلام پیش کرتا ہوا۔ زاروزار رونے لگا۔

عثمان غنی نے اس کو سرکار کی قبر مبارک کے پاس جالیوں کے باہر لٹا دیا تھا۔

''والیٔ مدینہ! میری حاضری قبول کیجیے۔ میں لاچار بے بس اور مجبور کبوتر ہوں۔ مگر اس جگہ پر پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس طرح میری مدد اور سرکار ﷺ آپ کے عشق نے میری جو رہنمائی فرمائی ہے۔ اسی کی وجہ سے میں آج آپ کے قدموں میں پڑا ہوں۔'' عثمان غنی اس کی باتیں سن اور سمجھ رہے تھے۔

''یارسول اللہ!'' میرے ملک کی ابتر حالت پر رحم اور اُمت پر کرم فرمانے کے لیے اللہ کے حضور دعا فرمایئے میں اپنی سرزمین پر خون خرابہ دیکھ کر ہی آپ سے آپ کے اُمتیوں کی شکایت کرنے آیا ہوں۔ میری التجائیں سن لیجیے۔'' شین کی سانسیں اکھڑنے لگیں تو عثمان غنی نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

''عثمان غنی! آپ گواہ رہنا میں نے اپنی جان دے کر جو شہادت حاصل کی ہے وہ عشق کے شین کو سرخرو کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش تھی...... میرے اللہ اپنے حبیب ﷺ کا صدقہ مجھے شین کا لبادہ اوڑھا کر مجھ پر جو تم نے کرم کیا ہے میں اس کا شکرانہ ادا نہیں کر سکتا۔ میں اس حبیب اللہ کی چوکھٹ پر پڑا ہوں جہاں سے شہنشاہ اپنی جھولیاں بھر کر لے جاتے ہیں سبحان اللہ۔'' اس نے عثمان غنی کی طرف ملتمس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے عرض کی میرا سانس اکھڑ رہا ہے۔ مجھے باب جبریلؑ کی دہلیز پر رکھ دو۔'' عثمان غنی نے آنے والوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور شین کو دروازے کی دہلیز پر رکھا تو اس نے اپنی نارنجی چونچ سے اس چوکھٹ کو بوسہ دیا اور



بولا۔ ''الف سے اللہ۔ میم سے محمد ﷺ'' اس نے آخری ہچکی لی اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اسی وقت مدینے کی فضا خوشبوؤں سے معطر ہواؤں سے مسحور کن ہو گئیں۔ نورانی نور نے شین کی سرخروئی پر اسے جنت البقیع میں دفن ہونے کا انعام بخشا تھا۔ اس نے کئی میلوں کا سفر گنبد خضریٰ کی جھلک دیکھنے اور اس چوکھٹ کو بوسہ دینے کے لیے کیا تھا۔

اس نے اپنے شریکے کے طعنے سہہ سہہ کر اپنے عشق کو کندن بنا لیا تھا۔ عثمان غنی نے اسے چھوٹی سی قبر کھود کر جنت البقیع میں دفناتے ہوئے اس کے وجود پر اپنے آنسو گرا کر اس بے زبان عاشق مصطفیٰ ﷺ کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

☆=======☆=======☆

حیاء کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ جبرو جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ مگر اسے اب کسی بھی بات کا خوف نہ تھا۔ اس نے مدرسہ میں قرآن کریم کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس نے معقول تنخواہ پر ایک عالم دین کو بچوں کو تعلیم دینے کے لیے رکھا ہوا تھا اور خود رات کو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسی بازار کی ایک عورت تھی جو اس کو قرآن پڑھانے آتی تھی۔ حیاء دل و جان سے اپنی استانی کا احترام کرتی تھی۔

حیاء نے اس کوٹھے کو مدرسہ تعلیم القرآن میں بدلنے کا اشتہار اخبارات اور ٹی وی میں دے دے کر چند بچوں کے والدین کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس مدرسہ میں قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے بچوں کو بھیجیں۔

بچے شوق سے اس مدرسہ میں داخل ہو رہے تھے۔ اب تو ان کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ حیاء کو اس موقع پر لاڈو بری طرح یاد آنے لگا۔ اس نے زندگی کے آخری لمحات میں نیکی کرنے کی ٹھانی تھی مگر وہ جبرو کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

ہر ہفتہ میں مدرسہ کی ایک چھٹی ہوتی تھی اور یہ چھٹی جمعۃ المبارک کو ہوتی تھی۔ ٹیلی ویژن سکرینوں پر چینلز اور اخبارات میں اس مدرسہ کے افتتاح کے موقع پر حیرت و مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔

''بس جی! اللہ جس کو ہدایت دے دے۔''

''ناں جی ناں! نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔'' جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔

آج بھی مدرسہ سے ہفتہ وار چھٹی تھی۔ حیاء نے عشق کے قاف کا پیرہن اوڑھ لیا تھا۔

اس نے دیکھا کہ کوئی اس کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا آ رہا ہے۔ قدموں کی آواز سے لگتا تھا کہ کوئی مرد ہے۔ یہ حیرت کی بات ہی ہوتی کہ اگر اس مدرسہ میں کوئی مرد آتا۔ کیونکہ یہ بچیوں کے لیے مدرسہ بنا تھا۔

اوپر آنے والے کو دیکھ کر حیاء حیران رہ گئی اور استعجاب کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

''شاہ جی آپ!'' وہ صبور احمد کو حیرانگی سے دیکھ رہی تھیں۔

''اب دن کی روشنی میں اس جگہ آنے سے ہم جیسے درویشوں کو نہیں ڈرنا چاہیے۔'' انہوں نے شرم وحیاء کی تصویر بنی ہوئی حیاء کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو روح تک اس نے مسیحائی کی تاثیر کو محسوس کیا تھا۔

''عشق دیتا بھی ہے اور لیتا بھی ہے۔ تمہیں قاف دے دیا اور اب تم سے کچھ چاہتا بھی ہے۔'' ان کی باتیں حق ومعرفت پر مبنی تھیں۔ حیاء استفسار سے بولی۔

''میں سمجھی نہیں شاہ جی!'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''مگر وہ ملعون بہت مکار اور شاطر ہے تمہیں بہکا نہ دے؟''

''میں عشق کی رکھوالی ہوں۔ شیطان ملعون مجھ سے شکست ہی کھائے گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے...... دیکھتے ہیں کہ فتح کس کی ہوتی ہے۔ عشق کی یا پھر......؟'' صبور احمد یہ کہہ کر سیڑھیاں اتر گئے۔

حیاء بازار سے کچھ خریداری کے لیے نکلی تھی۔ وہ ایک دکان سے قرآن کریم خرید رہی تھی کہ ایک فقیر نے اس کے آگے دست دراز کر دیا۔ ''بی بی جی! میری کچھ مدد کرو۔'' حیاء نے اسے دس روپے کا نوٹ دیا مگر وہ مزید پر اصرار کرتا رہا۔ حیاء آگے بڑھی تو وہ بولا۔ ''دس روپے اور دو گی تو ایک خوش خبری سناؤں گا۔'' یہ بات سن کر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے فقیر کو دس کا نوٹ اور دیا تو وہ بولا۔

''اللہ تعالیٰ کو تمہارا یہ قرآن خریدنا بہت پسند آیا ہے۔ تم بہت بختوں والی ہو۔ جنت کو تم نے خرید لیا ہے۔'' حیاء اس کی بات سن کر خاموش ہو رہی وہ پھر بولا۔ ''اصل بات تو قرآن ہی ہے۔ یہ سب عشق وشق فضول رسومات ہیں۔'' فقیر کی ٹون یک دم بدل گئی تھی۔ ''قرآن کریم لے لے کر تقسیم کرتی رہو۔ تمہیں کسی بھی ولی کے مزار پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ خدا جب راضی ہی ہو چکا ہے تو پھر اس کو سجدہ کرنے کی بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے



محبوب ﷺ پر درود پڑھو چاہے نہ پڑھو۔ وہ تمہارے فعل سے راضی ہے اور بس تم سے خوش ہے۔'' مگر ایک زوردار تھپڑ نے اس فقیر کو اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔

حیاء کو صبور احمد کی بات یاد آ گئی تھی وہ شیطان کے کاری واری سے بچنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ مگر مردود اس صورت میں سامنے آئے گا کہ حیاء کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ تھپڑ کھا کر وہ بھاگ نکلا تھا۔

مغرب کی اذان ہو رہی تھی اس کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے قرآن کریم ایک مسجد میں رکھوائے اور ایک قرآن کریم کو سینے سے لگاتی ہوئی گھر کی جانب چل پڑی۔

مگر بازار کے سرے پر پہنچتے ہی اس کی سٹی گم ہو گئی کیونکہ اس کے مدرسے سے دھواں نکل رہا تھا یوں لگتا تھا کہ کسی نے اس کے مدرسے کو آگ لگا دی ہو۔ وہ قرآن کریم کو چادر میں چھپائے بھاگتی ہوئی لوگوں کے مجمع کو چیرتی ہوئی مدرسے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی تو جبرو کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اس نے قالین کو آگ لگا رکھی تھی اور کرسی پر بیٹھا ہوا ٹانگ پر ٹانگ رکھے پاؤں ہلا رہا تھا۔ حیاء کو دیکھ کر وہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''پتہ نہیں کیا کشش ہے تم میں جان من!'' اس نے حیاء کے گال کو اپنی انگلی سے چھوا تو حیاء نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ''دل جیل کی سلاخوں کے پیچھے اداس ہی رہتا تھا۔ تمہارے دیدار کے بغیر تو رات ہی نہیں گزرتی تھی۔ بس چلا آیا۔'' اس نے حیاء کا ہاتھ پکڑ کر اس کو بوسہ دیا تو حیاء نے غصے اور نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ دوسرے ہی لمحہ ایک زوردار تھپڑ نے حیاء کی آنکھوں کے سامنے تارے نچا دیئے وہ قالین پر دور جا کر گری مگر قرآن کریم کو اس نے اپنے سینے سے ہی لگائے رکھا۔ جبرو نے اسے بالوں سے پکڑا تو اس کا سکارف اتر گیا۔ وہ جبرو کے سامنے ننگے سر کھڑی تھی مگر چادر نے اس کے بدن کو اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔

''میں نے تم سے محبت کی تھی حیا!'' وہ دھاڑنے لگا تھا۔ ''مگر تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ تم نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ آج یہ پورا بازار دیکھے گا کہ حیاء کو کس طرح بے حیاء بناتا ہوں۔'' وہ چیختا ہوا حیاء کو کھینچنے لگا۔ وہ اسے نیچے بازار میں لے جانا چاہتا تھا۔ مگر حیاء بیٹھ گئی وہ اسے بالوں سے پکڑتا ہوا کھینچ کر اوپر اٹھاتا ہوا بولا۔

''تم نے جو ڈھونگ رچایا ہے۔ آج وہ ختم ہونا چاہیے۔'' اس نے چادر کھینچ کر اس کے

جسم سے اتاری تو حیاء نے ایک ہاتھ سے قرآن کریم کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ بدمعاش تھا یا تماش بین...... مگر پہلے مسلمان تھا۔ قرآن کریم کا احترام کیا تھا وہ جانتا اور سمجھتا تھا۔

''اس قرآن کو ایک طرف رکھ دو حیاء۔'' اس کے چہرے پر خوف دکھائی دینے لگا تھا۔ حیاء ننگے سر اس کی طرف بڑھنے لگی تھی مگر وہ دو قدم پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہی ہو...... یہ مجھے دے دو۔'' اس نے آگے بڑھ کر قرآن کریم حیاء سے چھیننا شروع کر دیا۔ مگر حیاء کی گرفت قرآن کریم پر زیادہ مضبوط تھی۔

اس نے حیاء کو زمین پر گرا کر اس سے قرآن چھیننا شروع کر دیا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں ہنوز ناکام ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی شیطانی چال قرآن کریم کی موجودگی میں پوری نہ ہو پا رہی تھی۔ وہ اپنی شیطانی خواہش سے حیاء کو بے آبرو کرنا چاہتا تھا۔ مگر حیاء نے اللہ تعالیٰ کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔

''میرے اللہ! میں بے حیا سے حیاء بنی ہوں تُو میری حیا کی لاج رکھنا۔ مجھے بے آبرو ہونے سے پہلے موت دے دے میرے مالک!'' حیاء کی زبان، دل اور روح کی گہرائی سے یہ الفاظ نکلے تو جبرو کی گرفت اس پر کمزور پڑ گئی۔ وہ ناکام ہو کر اس کے وجود سے اٹھا تو حیاء بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

جبرو نے ایک طرف رکھی ہوئی اپنی مشین گن اٹھائی اور حیاء کو گن پوائنٹ پر قرآن چھوڑنے کا حکم دینے لگا۔ ''یہ میرا عشق ہے۔ اس کے قاف کو میں نے اپنا پیرہن بنا لیا ہے۔'' حیاء زور سے چیختی ہوئی کہنے لگی۔ ''تم کیسے بے غیرت مسلمان ہو...... قرآن پر بندوق تان رکھی ہے۔ جبرو بدمعاش سنو۔ تم میری کھال کند چھری سے میرے جسم سے اتار سکتے ہو...... مگر اس قاف کو میرے وجود سے الگ نہیں کر سکتے۔'' جبرو نے غصے میں شراب کی بوتلیں قالین پر پٹخنا شروع کر دیں۔ شراب بہہ بہہ کر قالین اور پردوں پر گری تو اس نے جیب سے لائٹر نکال کر قالین کو آگ لگا دی۔

آگ نے پورے ہال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جبرو قہقہے لگانے لگا۔

''میری جان من! تمہارا کیا بگڑے گا...... میری خواہش کی تکمیل میں یقین کرو تمہارے عشق پر کوئی حرف نہیں آئے گا...... آخر میں بھی تمہارا عاشق ہوں۔'' وہ آگے بڑھا تو حیاء نے ایک بار پھر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے مشین گن سے ایک گولی حیاء کے



پاؤں پر دے ماری۔ وہ تڑپتی ہوئی چیختی ہوئی قالین پر گر گئی۔ آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔ حیاء کو خوف تھا کہ کہیں آگ اس الماری کو اپنے لپیٹ میں نہ لے لے جس میں قرآن کریم رکھے ہوئے ہیں۔

''اللہ...... اللہ...... میری مدد فرما تجھے اس کتاب کی عظمت و حرمت کا واسطہ! میری آبرو کی حفاظت کرنا۔''

وہ آہستہ آہستہ اس الماری کی طرف رینگنے لگی جس میں قرآن کریم پڑے ہوئے تھے۔ وہ زخمی پاؤں کے ساتھ ہی اس الماری کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ آگ کو اس الماری تک نہیں بڑھنے دے گی۔ مگر جبرو شیطان کا پیروکار بنا ہوا تھا۔ اس نے حیاء پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر حیاء نے گرتے گرتے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کے سانپ نے جبرو کو پنڈلی پر ڈس لیا تھا۔

وہ تڑپ کر گرا تو سانپ اس کے پیٹ پر چڑھ گیا اور اس کے منہ پر ڈنک مارنے شروع کر دیئے۔ وہ منہ سے نیلے رنگ کی جھاگ نکالنے لگا۔ پھر اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ سیاہ اور سبز ہو گیا تھا۔ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

حیاء کے سینے سے چمٹے ہوئے قرآن کریم کو دیکھ کر سانپ جو کہ کنگنی تھی آگے بڑھی اور قرآن کریم کو دیکھتے ہوئے اپنا پھن احترام میں جھکایا...... اور پھر ٹوٹی ہوئی سانسوں کی ڈور سے بندھی ہوئی حیاء کے سامنے اپنا پھن پھیلاتی ہوئی پھنکاری تو اس کی پھنکار حیاء کے شعور سے ٹکرا کر پیغام دے گئی۔

''خداوند کریم سے کہنا...... کہ مجھے بھی عشق کا کوئی درجہ عطا کر دے۔ میں عشق پر اپنی جان قربان کر کے اپنے کنگن کے عشق کو خراج پیش کرنا چاہتی ہوں۔'' حیاء کی آنکھیں حیرت سے جاتی ہوئی کنگنی کو دیکھ رہی تھیں۔

فائر بریگیڈ کی گاڑیوں نے آگ پر قابو پا لیا تھا۔ الماری جلنے سے بچ گئی تھی مگر آگ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہونے والی حیاء کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اس کے سینے سے لگا ہوا قرآن اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ حیاء باحیاء تھی اور قاف کی حقدار تھی۔

لوگوں نے اوپر آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ حیاء کی لاش کو دیکھ کر عش عش کر رہے تھے

جبکہ جبرو کی لاش کو دیکھ کر نفرت سے تھوک بھی رہے تھے اور عبرت بھی حاصل کر رہے تھے۔

ہجوم میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اپنا بڑا رومال حیاء کے ننگے سر پر ڈالتے ہوئے اس نے روتی ہوئی آنکھوں سے حیاء کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اسے دیکھتا ہوا واپس ہو گیا۔

وہ شخص سیدھا مسجد میں گیا اور سجدے میں گر کر زار و زار رونے لگا۔

وہ زندگی میں ہمیشہ اپنے گناہوں اور عیبوں کی پردہ پوشی کی دعا خداوند کریم سے کرتا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بار بھی اس کی عزت رکھ لی تھی کیونکہ کسی پر بھی یہ راز نہ کھلا تھا کہ سعید علی حیاء کے باپ ہیں۔

خوش بخت پرندے ہیں ۔ اڑتے ہیں ان فضاؤں میں
کاش! میں بھی کبوتر ہوتا ایک پیارا مدینے کا

☆======ختم شد======☆